# عطائیے

ہنستی مسکراتی تحریریں

عطاء الحق قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطائیے

# عطائیے

عطاء الحق قاسمی

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

E-mail: nastalique@yahoo.com

نٓ والقلم وما یسطرون O

القرآن



اہتمام : حسن محمود

سرورق: عبید

کمپوزنگ: گل گرافکس۔ لاہور

اشاعت: مئی 2009ء

مطبع: حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

قیمت: 500 روپے

بیرون ملک: 20 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

0300-4489310

E-mail: nastalique@yahoo.com

جناب مجید نظامی کے نام

# فہرست

# عرضِ مصنّف

''عطائیے'' کا تازہ ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے!

مگر یہ ایڈیشن ''عطائیے'' کے گزشتہ ایڈیشنوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں خاصی کمی بیشی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ اس میں شخصی خاکے الگ کر کے ''مزید گنجے فرشتے'' میں شامل کر دیئے گئے ہیں جو میری خاکوں کی کتاب ہے تاہم میں نے ان کی جگہ مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے اپنے بہت سے ''عطائیے'' اس میں شامل کیے ہیں۔ ''عطائیے'' میری ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو فکشن کے انداز میں لکھی گئی ہیں یا جن میں، میں نے علامتی پیرایہ اختیار کیا ہے۔ میں نے اپنے کالموں میں یہ انداز تقریباً چالیس برس پیشتر اپنایا تھا اور گاہے گاہے آج بھی اس طرزِ سخن کا سہارا لیتا ہوں۔ ان تحریروں کو ''عطائیے'' کا نام اُردو کے صفِ اوّل کے شاعر ظفر اقبال نے دیا تھا ان میں آپ کو اِس دور کی معاشرت کے بہت سے نشیب و فراز نظر آئیں گے۔ ''عطائیے'' میں شامل علامتی کالم مختلف ادوار میں فکر و نظر پر عائد پابندیوں کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں، جس کی ایک مثال ''عطائیے'' میں شامل ''کچا پنکچر'' بھی ہے۔ جو میں نے 1977ء کے مارشل لاء کے ابتدائی دنوں میں تحریر کیا تھا!

آپ ''عطائیے'' کے مطالعہ کے بعد ممکن ہے، مجھ سے سوال کریں کہ یہ تحریریں کالم ہیں یا کچھ اور؟ جیسا کہ انتظار حسین نے اپنے کالم ''باتیں اور ملاقاتیں'' میں میرے متعدد ''کالموں'' خصوصاً ''الہ دین کے جن کا زوال'' کو ایک مختصر افسانہ قرار دیتے ہوئے یہ سوال اُٹھایا تھا۔ تو عرض یہ ہے کہ یہ اعتراض بجا ہے لیکن میں اپنی ہر تحریر اپنے اخباری کالم میں اشاعت کے لیے دے دیتا ہوں، شاید اس لیے کہ اگر کوئی تحریر ہزاروں کی بجائے لاکھوں افراد پڑھ سکیں تو اس میں بھی کیا حرج ہے دراصل میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو میرا قلم میرا کہا نہیں مانتا اور خود کو اُس کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگتا ہوں اس کے بعد جو کچھ بھی صفحۂ قرطاس پر اُبھرتا ہے میں اُسے صبر و شکر کر کے من و عن قبول کر لیتا ہوں اور پھر اسے اشاعت کے لیے ایڈیٹر کو بھجوا دیتا ہوں سو، ہنسنا رونا منع ہے، وصیت نامے، غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور، جرم ظریفی اور عطائیے سمیت میری تمام دوسری کتابوں میں شائع شدہ تحریریں اخبار میں بطور کالم ہی شائع ہوئی تھیں چنانچہ آپ اِن تحریروں کو کالم یا غیر کالم، جو چاہیں قرار دیں اور انہیں جہاں

فٹ کرنا چاہیں فٹ کردیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ جانتا ہوں کہ آخری فیصلہ آپ نے ہی کرنا ہے۔ میں اپنی رائے دینے والا کون ہوتا ہوں، میرا کام لکھنا تھا، وہ میں لکھتا رہا ہوں۔ لکھ رہا ہوں اور دُعا کریں آخری سانس تک لکھتا رہوں کہ لکھنا ہی میرے ہونے کی نشانی ہے! میرے لیے میرا ہونا ہی میرا سب سے بڑا اجر ہے!

آخر میں تین شکریے بھی مجھ پر واجب ہیں پہلا شکریہ قارئین کا کہ وہ مجھ پہ بہت مہربان رہے ہیں، ان میں پندرہ سال سے نوے سال تک کی عمر کے خواتین و حضرات اور دس جماعتیں پاس سے پی ایچ ڈی ڈاکٹر تک سبھی شامل ہیں۔ مجھے ان کی طرف سے صرف اظہارِ پسندیدگی ہی نہیں بلکہ ڈھیروں دُعائیں بھی ملتی ہیں۔ مجھے دوسرا شکریہ خوبصورت شاعر اور میری کتابوں کے پبلشر حسن عباسی کا بھی ادا کرنا ہے کہ یہ نوجوان میری تمام کتابوں کے نئے ایڈیشن حُسنِ طباعت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنی پوری صلاحیتیں بروئے کار لا رہا ہے اور مجھ پر تیسرا شکریہ برادرم محمد بوٹا انجم کا واجب ہے کہ انہوں نے زیر نظر کتاب اور آنے والی تمام نئی اور پرانی کتابوں کی صرف پروف ریڈنگ ہی نہیں کی بلکہ کئی مقامات پر میری رہنمائی بھی کی ہے۔ انجم صاحب سابق سینئر بیوروکریٹ ہیں اور مزاح نگار ہیں۔ مزاح نگار اور بیوروکریٹ میں ایک نازک سا فرق ہے۔ مزاح نگار لفظوں اور واقعات سے جب کہ بیوروکریٹ فائلوں اور سائلوں سے مزاح پیدا کرتا ہے، لیکن انجم صاحب چونکہ شریف آدمی ہیں لہٰذا مجھے یقین ہے کہ انہوں نے موخرالذکر ''حرکت'' سے اجتناب کیا ہوگا۔

اور ''چلتے چلتے'' ایک معذرت بھی! ''عطائیے'' میں، مَیں نے اپنے لیے زیادہ تر واحد اور کہیں کہیں جمع کا صیغہ بھی استعمال کیا ہے دراصل جمع کا صیغہ میں ابتدائی برسوں میں استعمال کرتا تھا بعد میں، میں نے اپنے لیے ''میں'' کہلانا ہی پسند کیا چنانچہ آپ کو کتابوں کے مطالعے کے دوران اس ''شتر گربگی'' کا احساس ہوگا مگر جو ہونا تھا، ہوگیا اب میں کیا کرسکتا ہوں؟

عطاء الحق قاسمی

A/85۔ ڈیفنس (ای، ایم، ای سیکٹر)

ملتان روڈ، لاہور

فون: 0321-8470062

دیباچہ

# عطا کے نام ایک خط

سراج منیر (مرحوم)

ڈیر عطا !

میرا حال یہ ہے کہ خوبصورت چھپی ہوئی کتابوں سے اب مجھے وحشت ہونے لگی ہے اور جی چاہتا ہے کہ مطبع منشی نولکشور کی زرد کاغذوں پر شائع شدہ بوسیدہ ورق اور غیر مجلد کتاب کے علاوہ کچھ نہ پڑھوں۔ اس میں میری بد ذوقی یا فطرتِ تحقیق لگن کا دخل نہیں بلکہ

ع کردیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

دبیز کاغذوں پر مطلا جلدوں والی خوبصورت گرد پوش سے مزین کتابوں میں اک عمر کی بادیہ پیمائی نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ دانش کا حرف اور دل کا شرر اس آدمی کا حصہ ہے جس کے لفظوں کو اگر پکی روشنائی نصیب بھی ہو جائے تو سفید کاغذ نہیں ملتا۔ بڑے صنعتی اداروں کی طرح مہیب اخباروں کے دفاتر سے لے کر پبلشروں کے مافیا تک سفر کرنا آج سچے لفظوں کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اسے ہر قدم پر آگے بڑھنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور جب وہ لاکھوں کی نگاہوں کے سامنے آنے کے قابل ہوتا ہے تو اس کے پیچھے گونجتی ہوئی انسانی آواز کی سچائی کہیں گم ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسی کتابوں کی دنیا کا میں پرانا زائر ہے۔

عطائیے کی خوبصورت اشاعت نے مجھے ایک لمحے کے لیے خوفزدہ کر دیا۔ میں اس طرح کی کتابوں سے اس قدر اکتا گیا ہوں کہ اگر میں نے تمہاری تحریریں مسلسل نہ پڑھی ہوتیں اور تمہیں قریب سے نہ دیکھا ہوتا تو میں اس کتاب کو خاموشی سے اپنی بک شیلف پر سجا دیتا۔ وقت کم ہے، لفظوں کی فراوانی میں دانش گم ہو چکا ہے، اور اگر ہمیں اس کی تلاش ہے تو ہم ہر کتاب پڑھنے کا رسک نہیں لے سکتے۔

دیکھو کیسا عجیب وقت آ گیا کہ چیزوں کا حسن ان کے اندر کی بدصورتی کی سب سے بڑی شہادت بن چکا ہے۔ میں دانش کے اس شہرِ آشوب کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا قصہ مختصر یہ کہ میں نے کتاب سہ بارہ پڑھ لی ہے۔ سہ بارہ یوں کہ اکثر تحریریں اس وقت میری نظر سے گزریں جب یہ لکھی جا رہی تھیں۔ اخبار کے دفتر میں ملاقاتیوں کے ہجوم کے درمیان یا کسی ادبی تقریب سے آدھ پون گھنٹہ پہلے کسی ریستوران کے گوشہء عافیت میں ان تحریروں کی ولادت کا عبرت انگیز منظر میں نے دیکھا ہے، چھوٹی چھوٹی کاغذ کی سلپوں پر تیزی سے لکھتے ہوئے قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں سے تم نے جو سنگدلانہ بے نیازی روا رکھی میں اس کا عینی شاہد ہوں۔ اگر کوئی اور شخص اتنی جلد بازی اور غیر ذمہ داری سے لکھتا تو اس کی تحریریں اس سے ویسا ہی خوفناک انتقام لیتیں مگر تمہیں انہیں لفظوں نے شہرت دی، انہیں سے تمہیں مقبولیت ملی اور انہیں لفظوں نے تمہیں معتبر بنا دیا ہے۔

مائی ڈیر عطاء الحق قاسمی! میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ تم میں وہ کیا خاص بات ہے تیزی میں گھسیٹے ہوئے لفظوں نے تمہیں دنیا میں بے توقیر نہیں کیا۔ میں آج دیانت اور ذہانت کے نو مینز لینڈ میں مارے مارے پھرتے ہوئے بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے لکھے ہوئے لفظوں نے انہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے مقولے ''بولو کہ پہچان لئے جاؤ'' کا جدید اطلاق میں روزانہ صبح اخباروں میں بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ جو بولتا ہے پہچان لیا جاتا ہے۔ سچ ہے کہ لفظ سے زیادہ سچا دوست اور اس سے زیادہ کھرا دشمن نہیں ہوتا۔ جب تم عطائیے میں شامل تحریریں لکھتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تم ان کے ساتھ سفاکانہ برتاؤ کر رہے ہو، لیکن آج جب میں عطائیے پڑھ رہا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ لفظ تم پر مہربان ہیں۔ وہ خوشگوار منظروں کی طرف کھلنے والے دریچوں کی طرح ہمیں ایک سچے ذہنی اور جذباتی لینڈ سکیپ کی سیر کراتے ہیں۔ ''روزنِ دیوار سے'' کا انتخاب جب شائع ہوا تھا تو لوگوں میں وہ مجموعہ بہت مقبول ہوا اور جب تمہیں کہیں سے داد ملتی تھی تو مجھے یاد ہے تم کھل اٹھتے تھے مجھے پتہ نہیں کہ یہ کتاب اس سے زیادہ مقبول ہوگی یا کم لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ مجھے نسبتاً زیادہ اہم کتاب لگتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے

واقعات، سیر وسفر کے Anectotes اور شخصیتوں کے خاکوں کا یہ مجموعہ ایک اور گہری سطح تک مار کرتا ہے۔

لوگ تمہارے کالموں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں علامتی ویژن پایا جاتا ہے۔ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ تمہاری تحریر میں ایک طرح کی suggestion ہوتی ہے۔ تم محض اپنی ذہانت کے اسیر ہونے کے بجائے اپنے قاری کی ذہانت پر بھی انحصار کرتے ہو۔ چھوٹی چھوٹی تمثالوں میں بیچ کی کڑیاں چھوڑ دیتے ہو، جو کچھ کہنا نہیں چاہتے وہ سمجھا دیتے ہو اور اس طرح اپنے قاری میں چیزوں کو دریافت کرنے کی حیرت اور اس کی خوشگوار مسرت پیدا کرتے ہو، یہی تمہارا بنیادی ہنر ہے اور میرے دوست یہ کوئی اتنا بڑا ہنر نہیں جس پر تم مطمئن ہو کر بیٹھ رہو کہ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم"! لیکن ایک بات بتاؤ کہ تم یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اس قدر لطف لے لے کر کیوں لکھتے ہو۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑی بڑی دانش کیوں ڈھونڈتے ہو۔ تمہیں باتوں کو تہہ دار بنانے کا اس قدر شوق کیوں ہے اور ہاں میں تم سے یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج جب ادب اور فن میں سے آدمی گم ہوتا جا رہا ہے، تمہاری ان تحریروں میں اتنے زندہ لوگ کیوں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں تم ان لوگوں سے ایک زندہ تعلق کس طرح پیدا کر لیتے ہو۔ یہ سب تمہارے اندر موجود ایک زندہ آدمی کا ہنر ہے تم مشاہدہ اور تخیل دونوں کو کام میں اس طرح لاتے ہو جیسے دو آئینے روبرو رکھ دیئے جائیں اور وہ تاحدِ نظر ایک دوسرے میں منعکس ہوتے جائیں۔ دراصل تمہارا مشاہدہ بہت قوی ہے لیکن تم اپنی قوت متخیلہ سے ڈرتے ہو۔ اپنے تخیل کی تیز تلوار کے سامنے تم نے مشاہدے کی ڈھال رکھ دی ہے۔

عطا قاسمی بات یہ ہے کہ تحریر کی دنیا میں دو ہی قسم کے فنکار ہوا کرتے ہیں۔ شاعر اور کہانی کار تم خوش قسمت آدمی ہو کہ تمہاری ذات میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو گئی ہیں اس لیے تم جب چیزوں کو چھوتے ہو تو چاہو نہ چاہو وہ کہانی بن جاتی ہیں۔ تمہارے مشاہدے سے کہانی پیدا ہوتی ہے اور شاعرانہ وژن سے اس میں تہہ داری ابھرتی ہے۔ سو اس لیے لفظوں کے سیل رواں میں تمہارے لفظ زمانے کے تھپیڑوں کو سہتے جا رہے ہیں اور ایک

متاثر کرنے والی قوت کے ساتھ زندہ ہیں اور مجھے عطایئے پڑھ کر ایک اور احساس ہو رہا ہے کہ تم ایک ذہنی اوڈیسی پر روانہ ہو چکے ہو۔ پیارے سفرنامہ نگار! سفر تمہاری اپنے ذات کے اندر سے شروع ہو چکا ہے اور ''عطایئے'' کے کالم، خاکے اور سفرنامے سب اس عطاالحق قاسمی کی تلاش ہیں جس کی گونج تم سنتے ہو لیکن بھرپور طور پر اس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو۔ مجھے اس امر پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک آدمی میں اشیاء اور انسانوں سے زندہ رشتہ ایک ادبی واردات میں ڈھل جاتا ہے مجھے یقین ہے کہ تمہاری ذات میں کہانی کا شجر پنپ رہا ہے۔ پاؤنڈ کی ایک نظم شاید اسی طرح کے تجربے کے بارے میں ہے کہ شجر میرے سینے میں اگتا ہے اور اس کی شاخیں میرے بازوؤں میں پھیل جاتی ہیں۔ سو عطایئے اس شجر کی ایک اور شاخِ تازہ ہے۔ مجھے اس کے پتوں تک پھیلتی ہوئی بہار اچھی لگتی ہے اور اس کتاب کو پڑھنا صرف ایک وقتی خوشگوار تجربہ ہی نہیں بلکہ اس کی شگفتگی کے پیچھے گہری تہہ دار معنویت کے سلسلے ہیں، باقی پھر کبھی۔

تمہارا

**سراج منیر**

# ایک مُردے سے ملاقات

گرم گرم تلی ہوئی مچھلی کھانے کے لیے میں شہر کے پر رونق علاقے میں واقع ایک چھوٹی سی دکان میں داخل ہوا تو بجائے سڑک کی طرف منہ کرنے کے میں دکان کے عقب میں کھلنے والے دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا جسے اندر سے کنڈی لگا کر بند کیا گیا تھا' میں نے مچھلی کا آرڈر دیا اور اپنے سامنے بچھی ہوئی میز کے باوجود خاصے مخمصے میں مبتلا رہا کہ اپنی کہنیاں کہاں جماؤں کیونکہ میز پر گلاسوں سے گرے ہوئے پانی' مچھلی کے کانٹوں اور چکناہٹ کے دھبوں کے بعد کہنیاں جمانے کے لیے کوئی خاص جگہ باقی نہیں بچی تھی' تھوڑی دیر بعد بیرا ایک پلیٹ میں مچھلی اور ایک میں نان لیے آ گیا اور یوں میری مشکل آسان ہوگئی کیونکہ اب میرے دونوں ہاتھ مصروف ہو گئے تھے!

یہ ایک چھوٹی سی دکان تھی جس میں صرف تین چار میزوں کی گنجائش تھی۔ چنانچہ دکان کے عقب میں کھلنے والا دروازہ مجھ سے صرف چند فٹ دور تھا' میں نے ابھی دو چار نوالے ہی لیے تھے کہ بیرا دونوں ہاتھوں میں گندے برتنوں کا ڈھیر اٹھائے دروازے کی طرف گیا اور اس نے کمال مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ہاتھوں میں برتنوں کے ڈھیر کی وجہ سے اپنی انگلیوں سے دروازہ کھولا اور پھر میرے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ دروازے کے بالکل ساتھ ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دکان دراصل قبرستان کے اندر واقع ہے اور یوں میں عین قبرستان کے اندر بیٹھا مچھلی کھا رہا ہوں۔ بیرا ایک قبر کے پاس بیٹھا برتن دھو رہا تھا۔ یہ قبر مجھ سے زیادہ سے زیادہ پانچ سات فٹ کے فاصلے پر تھی مجھے یوں لگا جیسے میں مچھلی نہیں' مچھلی کے کانٹے چبا رہا ہوں اور ایک بڑا سا کانٹا

میرے حلق میں پھنس گیا ہے۔ میرے عقب میں واقع سڑک پر انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو سائیکلوں، موٹر سائیکلوں، کاروں، سکوٹروں، بسوں اور ویگنوں پر افراتفری کے عالم میں کسی بے سمت منزل کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا اور میرے سامنے قبریں تھیں جن میں انہی انسانوں کے بھائی بند اپنے مردہ جسموں پر کفن اوڑھے پڑے تھے!

''یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے سوچا

''کچھ بھی نہیں، زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ تم ڈیڑھ پاؤ مچھلی میرے لیے بھی منگواؤ، بیرے سے کہو مسالہ ذرا کم چھڑ کے!'' مجھ سے چند گز کے فاصلے پر موجود قبر میں سے ایک مردہ باہر نکل کر میرے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور اب وہ میرے بی ہاف پر بیرے کو آرڈر دے رہا تھا!

میرا تصور اتنا سٹرانگ تھا کہ مجھے یہ سب کچھ بالکل حقیقت کی طرح محسوس ہوا تاہم یہ سب کچھ تصوراتی ہونے کے باوجود ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے جسم میں خوف کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی مگر اگلے ہی لمحے، میں مکمل طور پر نارمل ہو گیا!

''یار، یہ تم خواہ مخواہ میرے پیسے ضائع کراؤ گے، تم مچھلی کیسے کھا سکتے ہو، تم تو مردے ہو!'' میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

اس کے جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا ''بہت خوب، میں اگر مردہ ہوں تو کیا تم زندہ ہو؟ تم تو ان سب لوگوں کو بھی زندہ سمجھ رہے ہو گے جو سامنے سڑک پر افراتفری کے عالم میں منہ اٹھائے بھاگے جا رہے ہیں!''

''تم تو مجھے طنز و مزاح نگار لگتے ہو'' میں نے کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''شیکسپیئر نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے'' اس نے میری پلیٹ میں سے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ''ویسے میرا نام غمگین اندوہ پوری ہے!''

''غمگین اندوہ پوری؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی ''نام تمہارا غمگین ہے مگر باتیں

تو بہت زندہ دلی کی کرتے ہو؟''

''انسان جتنا غمگین ہو اس کی باتوں میں اتنی ہی زندہ دلی ہوتی ہے!''

''بہت خوب' تو غمگین صاحب' زندگی میں آپ کیا کرتے تھے؟''

''یہی جو اس وقت کر رہا ہوں''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ مفت بری کرتا تھا' جہاں چار لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے ہوتے' میں ان میں شامل ہو جاتا!''

''تب تو آپ خاصی ناپسندیدہ شخصیت ہوں گے!''

''واہ صاحب' یہ آپ نے کیا بونگی ماری ہے' ہمارے معاشرے میں تو وہ لوگ بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر پلتے ہیں۔ یہ سب بڑے بڑے جاگیردار کیا کرتے ہیں' محنت کوئی کرتا ہے' کھاتے یہ ہیں' بلکہ اسمبلیوں میں محنت کرنے والوں کی نمائندگی بھی یہی کرتے ہیں۔ مشیر وزیر بھی یہی لوگ ہوتے ہیں' افسوس کہ آپ نے مجھے بہت انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے!''

''معافی چاہتا ہوں غمگین صاحب' اصل میں ——''

''آپ اس بات کو چھوڑیں میرے لیے بیرے کو اس کوڈ میں مچھلی کا آرڈر دیں' جس سے وہ سمجھ جائے کہ آپ نے ٹرخانے کے لیے آرڈر نہیں دیا بلکہ آپ سچ مچ چاہتے ہیں کہ آرڈر کی تعمیل کی جائے کیونکہ وہ ابھی تک مچھلی نہیں لے کر آیا اور ہاں دو نان بھی منگوا لیں' اسے کہیں ذرا سینک کر لائے!''

''غمگین صاحب' آپ تو یونہی میرے بارے میں بدگمانی سے کام لے رہے ہیں ——''

''بدگمانی سے کام لینا ضروری ہے' اس قوم کو خوش گمانیوں ہی نے تو مارا ہے۔

گزشتہ 43 برسوں میں ہر آنے والی حکومت پبلک کے سامنے یہی اعلان کرتی ہے کہ ان کے لیے روٹی کپڑے کا آرڈر دے دیا گیا ہے مگر چونکہ آرڈر دیتے ہوئے ایک مخصوص اشارے سے سمجھا دیا جاتا ہے کہ اس کی تعمیل نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ عوام حکمرانوں کو نیک دل سمجھتے رہتے ہیں اور ان کے اہلکاروں کو برا کہتے ہیں۔ معاف کیجئے گا حضرت' میرے ساتھ یہ تکنیک نہیں چلے گی!"

خدا کا شکر ہے کہ بیرا تھوڑی ہی دیر بعد ایک پلیٹ میں ڈیڑھ پاؤ مچھلی اور دو نان لے کر آ گیا' جس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا ورنہ غمگین اندوہ پوری نے اپنے جملوں سے مجھے بھی ادھ موا کر دینا تھا!

"یہ بتائیں آپ کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے دانستہ موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ کے مردہ بھائی بند آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

"ہڑتال پر ہیں"

"ہڑتال پر ہیں؟ وہ کیوں؟"

"اکثر مُردے ان دنوں بغیر کفن کے دفنائے جا رہے ہیں؟"

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں"

"یہ کوئی ایسی نا قابل فہم بات نہیں۔ گزشتہ دنوں جو الیکشن ہوئے' اس میں سڑکوں پر امیدواروں نے اتنے بڑے بڑے بینر لگوائے جس سے کپڑے کی شارٹیج ہو گئی اور یوں اس کی قیمتیں آسمان کو پہنچ گئیں' چنانچہ ان دنوں بیشتر مردے انہی کپڑوں میں دفن ہیں جو انہوں نے مرتے وقت پہنے ہوئے تھے آپ میرے ساتھ آئیں' میں آپ کو دکھاؤں' کوئی دھوتی باندھ کر لیٹا ہوا ہے' کسی نے کھیس اوڑھا ہوا ہے' کوئی چوڑے گھیرے والی شلوار پہنے

ہوئے ہے اور یہ سب لوگ احتجاج کرر ہے ہیں کہ انہیں کفن مہیا کیا جائے!''

''عجیب بات ہے''

''ہاں' مگراس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ الیکشن سے پہلے جومُردے کفن میں دفنائے گئے تھے' وہ ان سے زیادہ پریشان ہیں!''

''وہ کیسے''

''وہ ایسے کہ الیکشن کے دوران سیاسی جماعتوں کے رہنما اپنے کارندوں کے ذریعے ان کے کفن بھی اتار کرلے گئے اور اس کے بینر بنالیے۔اب یہ بیچارے ننگے پڑے ہیں' اوپر سے سردی بھی شروع ہوگئی ہے! خود میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے' میں یہ کفن اپنے ایک ساتھی سے ادھار مانگ کرلایا ہوں' اس نے دے تو دیا مگر درخواست کی کہ یار ذرا جلدی آجانا کہ اگر اس دوران فرشتے آگئے تو میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

''یہ تو آپ مجھے بہت عجیب وغریب باتیں بتارہے ہیں'' میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا

''صاحب! یہ تو کچھ بھی نہیں میں آپ کوایک عجیب بات بتاتا ہوں!''

''وہ کیا؟''

''ان دنوں کچھ مردے ایسے بھی آئے ہیں جن کے لواحقین نے کفن کے لیے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر بچے کھچے بینر اتار کراس کے کفن بنائے چنانچہ بہت سے مردے آئی جے آئی اور پیپلز پارٹی کے بینروں میں دفن ہیں جن پر بڑے بڑے وعدے لکھے ہوئے ہیں!''

''واقعی؟''

''تو کیا میں آپ سے جھوٹ کہوں گا؟ اور ہاں اُن مردوں کی وجہ سے قبرستان کے سکون میں خلل بھی بہت پڑا ہے''

''وہ کیوں؟''

''یہ بے وقوف الیکشن گزرنے کے بعد بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے امیدوار کے حق میں ''آوے ای آوے'' کے نعرے لگانے لگتے ہیں''

''اس وقت آپ کیا کرتے ہیں؟''

''میں صرف آمین کہتا ہوں!''

غمگین اندوہ پوری نے کھانا ختم کرلیا تھا' اب وہ غٹا غٹ پانی پی رہا تھا۔ میں نے جیب میں سے بٹوا نکالا اور سو روپے کا نوٹ بیرے کو دیا کہ باقی پیسے واپس لے آؤ۔

''ایک ڈبی گولڈ فلیک بھی لیتے آنا'' غمگین اندوہ پوری نے بیرے کو مخاطب کر کے کہا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی'' میں نے بقیہ رقم بٹوے میں ڈالتے ہوئے غمگین سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر میں اس سے اجازت طلب کرنے ہی کو تھا کہ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''آپ سے ایک درخواست کرنا تھی''

''فرمایئے؟''

''مجھے ایک ہزار روپے اُدھار چاہئیں!''

''وہ کیوں''

''میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں یہ کفن اپنے ساتھی سے اُدھا مانگ کر لایا ہوں!

''ہاں!''

''اب میں واپس جاؤں گا تو وہ فوراً اتروا لے گا' دیکھیں نا کوئی آ ہی جاتا ہے' کتنی بری بات ہے!''

''ہاں ہے تو سہی' مگر آپ ان ہزار روپوں کا کیا کریں گے؟''

''اپنے لیے کفن خریدوں گا!''

''وہ کیسے؟''

''چند روز پہلے ایک صاحب دفن ہوئے ہیں' وہ اپنے ساتھ ولائتی لٹھے کے کئی تھان لے کر آئے تھے اور اب بلیک کر رہے ہیں! وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک آدھ دانہ ہی بچا ہے' ویسے وہ یہ بات دام بڑھانے کے لیے کئی دنوں سے کہہ رہے ہیں لیکن ممکن ہے اس دفعہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں۔''

میں نے بٹوے میں سے ایک ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور غمگین اندوہ پوری کو دیتے ہوئے کہا ''یہ میرے پاس آخری ہزار روپیہ تھا جو پیش خدمت ہے صرف یہ فرمادیں کہ اس رقم کی واپسی کب ہوگی؟''

''جب آپ دنیا کے جھمیلوں سے فارغ ہو کر ہمارے درمیان تشریف لائیں گے!'' غمگین اندوہ پوری نے کہا ''اور انشاء اللہ آپ جلد آئیں گے۔''

''آپ کو یہ بد دعا دیتے ہوئے شرم آنی چاہیے'' میں نے اس ساری گفتگو کے دوران پہلی دفعہ غمگین کو غصے سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں اگر آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا ہے' مگر بہت سے لوگ صرف اپنی ڈوبی ہوئی رقم کی وجہ سے فوت ہو جاتے ہیں' کل ایک شیخ صاحب دفن ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ وہ مردود شیدا کہاں ہے جو میرے پانچ سو روپے مار کر یہاں آ گیا ہے!''

ضبط کے باوجود بے ساختہ میری ہنسی نکل گئی۔ میں غمگین اندوہ پوری کو داد دینے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھنے ہی کو تھا کہ وہ اچانک میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ قبرستان کی طرف کھلنے والا دروازہ ابھی تک کھلا تھا مگر میں نے اپنا رخ بازار کی طرف کر لیا جہاں انسانوں کا ایک ہجوم سائیکلوں' موٹر سائیکلوں' کاروں سکوٹروں' بسوں اور ویگنوں پر افراتفری کے عالم میں کسی بے سمت منزل کی طرف بھاگا چلا جا رہا تھا۔

14 دسمبر 1990ء

❖❖❖

# جسے ''عیش'' میں یادِ خدا ''بھی'' رہی!

میں نے 59 سالہ مرزا عنایت اشرف عرف عیش سے کہا ''کیا آپ کے لیے کل ممکن ہوگا کہ آپ مجھے ائیر پورٹ لے جائیں تا کہ میں پاکستان واپسی کا شیڈول ری روٹ کراسکوں؟'' انہوں نے جواب دینے سے پہلے ایک امریکی کی طرح سوچا کہ کیا وہ آسانی سے اتنا وقت نکال سکتے ہیں اور پھر کہا ''ہاں' میرے لیے ممکن ہے آپ بارہ بجے تیار رہیں'' اور پھر 63 کلومیٹر فاصلہ طے کر کے بارہ بجے وہ میرے ہوٹل کے کمرے کا دروازہ ناک کر رہے تھے۔ کاریڈور سے گزرتے ہوئے ان کی نظر ایک بلیک امریکی عورت پر پڑی جو ایک کولا ہاتھ میں اٹھائے سامنے سے آ رہی تھی۔ عیش تیزی سے اس کی طرف لپکے اور کولا کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا ''تھینک یو مادام مگر آپ نے میرے لیے اتنی زحمت کیوں کی؟'' مادام اس امریکی طرز مزاح پر کھلکھلا اٹھی اور عیش مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ استقبالیہ پر مناسب خدوخال کی حامل مگر نہایت موٹی الزبتھ کھڑی تھی۔ عیش نے اسے مخاطب کیا اور میری طرف اشارہ کر کے کہا ''میرا یہ دوست تمہارے عشق میں بہت بری طرح مبتلا ہو چکا ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے'' اس پر میں اور الزبتھ دونوں ہنس پڑے۔ الزبتھ نے کہا ''اپنے دوست کا میری طرف سے شکریہ ادا کرو مگر اسے بتاؤ کہ میں شادی شدہ ہوں'' عیش نے جواب دیا ''میرا دوست شادی شدہ عورتوں ہی کو پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی موصوف کاؤنٹر پر پڑی سویٹس مٹھی میں بھر کر باہر کار پارکنگ کی طرف چل پڑے۔

کار میں پہلے سے ایک اجنبی موجود تھا۔ عیش نے اس سے میرا تعارف کرایا ''یہ حافظ عبدالودود صاحب ہیں۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی فیملی کے ساتھ وزٹ

ویزا پر امریکہ آئے ہیں اور اب گزشتہ ایک سال سے بے روزگار ہیں۔ اپنے ساتھ جو رقم لے کر آئے تھے وہ تقریباً ختم ہو گئی ہے اور یوں ان دنوں سخت پریشان ہیں'' یہ کہتے ہوئے عیش نے دو تین سوئیٹس حافظ صاحب کی طرف بڑھائیں اور کہا ''آپ پریشان نہ ہوں' نوکری بھی انشاء اللہ مل ہی جائے گی' آپ فی الحال منہ میٹھا تو کریں؟''

ہیوسٹن کے جارج بش ایئر پورٹ پر مسافروں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی جو چیک ان ہونے کے لیے طویل قطاروں میں پورے صبر کے ساتھ کھڑی تھی ایک گورا دونوں ہاتھوں میں بہت سی چیزیں اٹھائے قطار کے آخر میں کھڑا ہو گیا۔ عیش نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا ''اگر تمہیں اس وقت کوئی گدگدی کرے تو تم اسے کیسے روکو گے؟'' دنوں ہاتھوں میں بہت سی چیزیں اُٹھائے گورا عیش کے اس جملے پر اپنی ٹینشن بھول گیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا ''واقعی' میں نے تو یہ سوچا ہی نہ تھا؟''

متعلقہ ایئر لائن کے کاؤنٹر پر ایک بزرگ امریکی عورت کچھ جلی بھنی سی بیٹھی تھی۔ عیش نے اسے مخاطب کیا اور کہا ''مجھے یقین ہے آپ وہی مہربان ہنس مکھ اور خوش مزاج خاتون ہیں جو گزشتہ رات مجھے خواب میں دکھائی گئی تھیں اور کہا گیا تھا کہ ان کے پاس چلے جاؤ' تمہارا کام فوراً ہو جائے گا!'' مگر اس بزرگ خاتون پر عیش کی اس بذلہ سنجی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اسپاٹ لہجے میں کہا ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں!'' عیش نے جواب دیا ''آپ میرے لیے اپنے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ لا سکتی ہیں!'' اس پر اس عفیفہ نے مسکرانے کی اتنی بھرپور کوشش کی کہ مجھے خدشہ پیدا ہوا کہیں اس کی باچھیں زخمی نہ ہو جائیں۔

کام سے فراغت کے بعد واپس عیش کے گھر کی طرف جاتے ہوئے جہاں ان کی اطالوی بیگم روز میری جواب شائستہ اشرف ہیں نے ہمارے لیے دوپہر کا کھانا تیار کر رکھا تھا' راستے میں ایک ٹریفک سگنل پر رکنا پڑا' ایک فقیر ہاتھ میں مدد کی اپیل کا بورڈ اٹھائے کھڑا تھا عیش نے ڈیش بورڈ میں سے ''جیک ان دی باکس'' کے دو کوپن نکال کر اسے دیئے اور کہا ''یہ لے جاؤ' اس سے دو وقت کا کھانا تمہیں مفت مل جائے گا'' فقیر کے بے رونق چہرے پر

رونق آ گئی۔گاڑی چل پڑی تو خوش شکل عیش نے اپنے ماتھے پر مستقل پڑی لٹ کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے "لٹ الجھی سلجھا رے بالم" والا گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ پھر اچانک انہیں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اجنبی عبدالودود کا خیال آیا۔ انہوں نے کہا "حافظ صاحب میں نے رضوان سے بات کی ہے انشاءاللہ وہ آپ کے لیے کچھ نہ کچھ کرے گا" مگر حافظ صاحب نے اس وعدے پر اظہار اطمینان کی بجائے پھوٹ کر رونا شروع کر دیا" میں ایم اے پاس ہوں آپ خدا کے لیے مجھے کوئی بھی نوکری دلوا دیں، میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کوئی بھی کام کر سکتا ہوں' بیرا گیری کر سکتا ہوں، میں حافظ قرآن ہوں میں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ جوا ایک شیطانی فعل ہے مگر میں یہاں ایک جوا خانے میں بھی کام کر چکا ہوں' میں لوگوں کو جوا کھیلنے کی ترغیب دیتا تھا مگر اس کے باوجود جوئے خانے کے مالک نے مجھے نکال دیا" اس کی حالت دیکھ کر عیش کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ امریکہ میں تلاش روزگار کے سلسلے میں آئے ہوئے بے شمار پاکستانیوں کو اس قسم کی صورتحال سے گزرنا پڑتا ہے۔ غیر قانونی طور پر امریکہ آئے ہوئے ایک لاکھ میں سے دس لوگ ایسے ہوں گے جو وہ سب کچھ حاصل کر سکیں جس کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ امریکہ اوپر چونیٹی کا نام ہے' کسی قسم کی گارنٹی کا نہیں۔

عیش کی بیگم شائستہ اشرف اس وقت مصلّے پر نماز کے بعد سلام پھیر رہی تھیں جب ہم گھر میں داخل ہوئے۔ میں ان سے گزشتہ برس بھی مل چکا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو بہت گرم جوشی سے خوش آمدید کہا اور پھر نہایت شائستہ اردو میں بولیں "یہ تو مجھے پتہ تھا آپ ہماری طرف بھی آئیں گے مگر "انہوں" نے یہ نہیں بتایا کہ آپ ابھی آ رہے ہیں ورنہ میں آپ کے لیے کوئی اسپیشل چیز تیار کرتی۔" پھر وہ ہمارے لیے دیسی کھانا تیار کرنے میں مشغول ہو گئیں۔ وہ ایک خالص پاکستانی خاتون ہیں جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے چھ بچوں کو جنم دیا اور ان کی بہترین تربیت بھی کی۔

اپنے شیرو زی کبوتروں کو دانہ ڈالنے کے بعد مجھے واپس ہوٹل ڈراپ کرتے ہوئے رستے میں عیش کے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف ان کا بیٹا پاکستان سے بول رہا تھا

جسے انہوں نے ایک سال کے لیے صادق آباد کے پبلک سکول میں داخل کرانے کے لیے لاہور میں مقیم اپنے دوست توقیر افضل کے پاس بھیجا تھا۔ اسے لاہور کی گرمی تنگ کر رہی تھی مگر وہ اس کے باوجود بہت خوش تھا۔ میں نے عیش سے پوچھا ''لوگ اپنے بچوں کو پاکستان سے امریکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں' آپ نے اپنے بیٹے کو پاکستان اور پاکستان میں بھی صادق آباد بھیج دیا۔ عیش نے جواب دیا ''میرے بزرگ یوپی سے ہجرت کر کے رحیم یار خاں آباد ہو گئے تھے چنانچہ صادق آباد میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں نے بیٹے کو ایک سال کے لیے پاکستان بھیجا اس لیے ہے تاکہ بعد میں اسے اپنی جڑیں تلاش کرنے میں ذہنی الجھنوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' ماہر نفسیات کے پاس لے جانے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم شروع ہی میں انہیں ان کی بنیادوں کے ساتھ جڑا رکھیں۔

ہوٹل سے میرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے استقبالیہ پر ایک امریکی خاتون اپنی تین سالہ نہایت خوبصورت بچی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس بچی کے بال سنہری تھے۔ عیش اس کی طرف گئے اور اس کے ریشم جیسے سنہری بالوں کو چھوتے ہوئے کہا ''تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں' اب تم بتاؤ تمہیں میری وگ کیسی لگی؟'' بچی حیرت سے اجنبی کو دیکھتی رہی مگر اس کی ماں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عیش نے اپنے اصلی بالوں کی ماتھے پر پڑی لٹ ہاتھ سے پرے کی اور مجھے میرے کمرے کے دروازے تک چھوڑنے چلے آئے اور پھر خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

اور میں سوچ رہا ہوں باہر سے غیر سنجیدہ نظر آنے والا شخص اندر سے کتنا سنجیدہ ہے۔ یہ لوگوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتا ہے ان کے کام بھی آتا ہے اور اجنبی لوگوں کو اپنی ہلکی پھلکی گفتگو سے اس ذہنی تناؤ سے بھی نکالتا ہے جو آج کے دور کے انسان کا مقدر بن چکا ہے وہ امریکہ میں آ کر ''امریکی'' تو ہو گیا ہے' اس نے ان کی اچھی عادتیں اپنا لی ہیں مگر وہ اپنی آئندہ نسل کی تربیت کے حوالے سے بھی کس قدر فکر مند ہے اور اس حوالے سے عملی طور پر کتنا کچھ کرتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے،

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

مگر جس عیش سے میری ملاقات ہوئی تھی اسے طیش بھی نہیں آتا تھا اور اسے عیش میں یادِ خدا بھی حاصل تھی۔ ویل ڈن مائی ڈیئر فرینڈ مسٹر عیش۔

3 جولائی 2005ء

❖❖❖
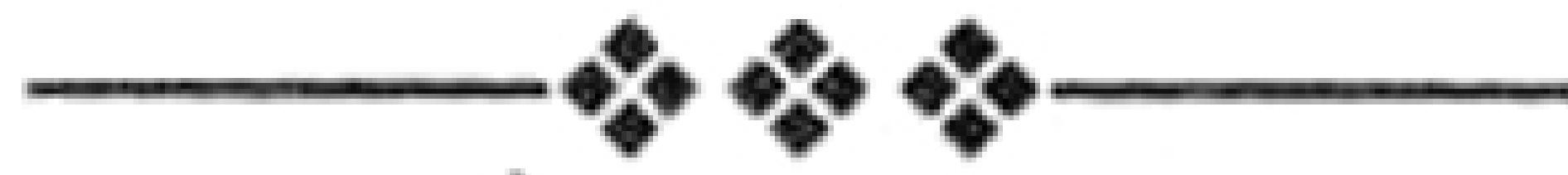
# ایک کبوتر کی کہانی

ٹولنٹن مارکیٹ میں شاپنگ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ یہاں تو ایک چھوٹا سا چڑیا گھر آباد ہے یہاں مور، تیتر، طوطے، بندر، بیٹرے، کتے، بلیاں، کبوتر سب کچھ موجود ہے؟ کتے پنجروں سے باہر زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں اور مختلف نسلوں کے یہ کتے مختلف نرخوں پر دستیاب ہیں جبکہ باقی پرندے اور جانور پنجروں میں بند کیے گئے ہیں، میں نے دو سفید معصوم سی بلیاں دیکھیں جو ایک چھوٹے سے پنجرے میں بند تھیں اور ان کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہ تھا، یہاں بھی قیدیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کسی دشمن ملک کی قید میں ہوں جبکہ یہ "اپنوں" کی قید میں تھے۔ میرا ایک احساس یہ بھی تھا کہ یہ سب تاوان کے لیے اغوا کر کے یہاں رکھے گئے ہیں اور یہ درست تھا کیونکہ ان کی قیمت ادا کر کے انہیں رہا کرایا جا سکتا تھا۔ میں کسی آزاد فرد بلکہ کسی پرند چرند کی نقل و حرکت پر بھی ناجائز پابندی کو ذہناً قبول نہیں کر سکتا۔ میرے بس میں ہو تو میں سب زنجیریں کھول دوں اور ان سب کو آزاد کر دوں جو معاشرے کے لیے ضرر رساں نہیں ہیں جبکہ یہاں بے گناہوں کو قید کیا گیا تھا اور ان کی رہائی "جرمانہ" ادا کر کے ممکن بنائی گئی تھی۔

میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا اس میں سے صرف پچاس روپے کا ایک نوٹ باقی رہ گیا تھا اور ان سب پرند چرند کی رہائی کے لیے لاکھوں روپے درکار تھے، میں دکان کے مالک کے پاس گیا اور پوچھا ایک کبوتر کتنے کا مل سکتا ہے؟ دکاندار نے پوچھا پکانے کے لیے، پالنے کے لیے یا آزاد کرنے کے لیے؟ میں نے جواب دیا آزاد کرنے کے لیے اس نے چالیس روپے قیمت بتائی اور پھر پیسے وصول کر کے کبوتروں کے ایک ڈربے میں ہاتھ ڈالا

اور ایک کبوتر اس میں سے نکال کر میرے حوالے کر دیا میں نے باقی کبوتروں اور ارد گرد کے پنجروں کے قیدیوں سے دل ہی دل میں معذرت کی اور کبوتر کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامے دکان سے نکل کر باہر کھلی فضا میں آ گیا۔

درختوں اور بجلی کے کھمبوں پر بہت سے پرندے بیٹھے آزاد فضاؤں کا لطف اٹھا رہے تھے میں بہت خوش تھا کہ ایک اور معصوم سے پرندے کو اس کی آزادی واپس ملنے والی ہے چنانچہ میں نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پھر مٹھی کھول کر کبوتر کو آزاد کر دیا، کبوتر اڈاری مار کر تقریباً تیس فٹ بلندی تک گیا اور پھر ایک چھوٹے سے دائرے میں چکر کاٹ کر اسی دکان کی منڈیر پر آ بیٹھا جہاں سے میں نے اسے حاصل کیا تھا۔

اب وہ منڈیر پر بیٹھا گردن کو تیزی سے ادھر اُدھر حرکت دے کر آزاد فضاؤں کا نظارہ کر رہا تھا لگتا تھا کہ وہ ابھی کچھ کنفیوژ ہے اور صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے جب اسے منڈیر پر بیٹھے تقریباً دس منٹ گزر گئے تو میں نے جانا کہ وہ ابھی تک خود کو قید سمجھ رہا ہے ورنہ اسے اگر اپنی آزادی کا احساس ہوتا تو ایک لمبی قید کے بعد وہ دوبارہ ایک جگہ بیٹھے رہنے کی بجائے فضا میں لمبی اڈاریاں مارتا۔ اس پر میں نے سڑک پر کھیلتے ہوئے ایک بچے سے کہا کہ وہ منڈیر پر بیٹھے ہوئے کبوتر کو اڑانے کی کوشش کرے بچے نے زمین سے ایک کنکر اٹھا کر کبوتر کو نشانہ بنایا یہ کنکر اس کی ٹانگ کو لگا جس کے نتیجے میں اس نے ایک دفعہ پھر اڈاری ماری اور ایک مختصر سے دائرے میں چکر لگا کر دکان کی چھت پر دھرے ایک بڑے ڈربے کے اوپر جا بیٹھا جس میں اس کے بھائی بند قید تھے!

میں سڑک کے کنارے کھڑی کار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور منتظر رہا کہ وہ کب پرواز کے لیے پر کھولتا ہے لیکن وہ اسی طرح گم سم اس ڈبے پر بیٹھا رہا جب میں نے دیکھا کہ وہ اڑنے کا نام ہی نہیں لے رہا تو میں نے دکان پر کام کرنے والے ایک نوجوان سے کہا کہ وہ اوپر جا کر اس کبوتر کو پکڑ لائے نوجوان دھڑ ادھڑ سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ کبوتر نے رتی بھر مزاحمت نہیں کی تھی میں نے نوجوان کا

شکریہ ادا کیا اور یہ کبوتر دوبارہ فضا میں چھوڑ دیا اس نے ایک بار پھر ایک مختصر سی اڈاری ماری اور دوبارہ چھت کی منڈیر پر جا بیٹھا میں نے سڑک پر کھیلنے والے بچے کی مدد سے اسے وہاں سے اڑایا تو وہ ایک دفعہ پھر چھت پر دھرے ڈربے پر جا بیٹھا میں نے پھر اسی نوجوان سے درخواست کی کہ وہ اسے پکڑ کر لائے جو پہلے بھی اس ضمن میں میرے کام آیا تھا۔ نوجوان چھت پر گیا اور دوبارہ بہت آسانی سے اسے پکڑ لایا۔

جب تیسری بار آزاد کرنے پر بھی ذہنی طور پر غلام اس کبوتر نے آزاد فضاؤں میں آزادانہ پرواز کی سہولت سے فائدہ نہ اٹھایا اور وہ نوجوان اسے میرے لیے تیسری بار پکڑ کر لایا تو میں نے یہ کبوتر اسے واپس کرتے ہوئے کہا ''یہ تم رکھ لو'' نوجوان اس پر بہت خوش ہوا مگر اس نے اوپر اوپر سے کہا ''جناب! میں اس کا کیا کروں گا''

''اسے دکاندار کے پاس بیچ دو جو اسے دوبارہ قید کر دے یا اسے ذبح کر کے کھالینا۔ جو کوئی اپنی آزادی کی حفاظت نہ کر سکتا ہو یا ذہنی غلامی میں پختہ ہو جائے چاہے وہ کوئی پرندہ ہو یا کوئی قوم، اس کے مقدروں میں غلامی یا ذبح ہونا لکھ دیا جاتا ہے!''

(28 جنوری 2003ء)
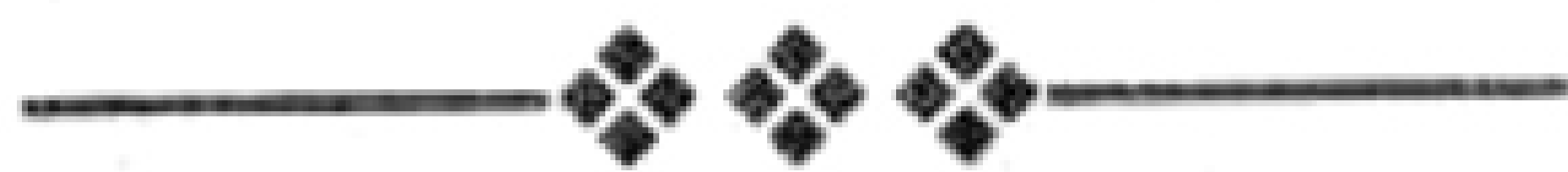
# ماڈرن شیر اور قدامت پسند لومڑی

آج آپ کو ایک کہانی کیوں نہ سنائی جائے؟

یہ ایک شیر اور لومڑی کی کہانی ہے۔ ظاہر ہے شیر بہت طاقتور تھا اور لومڑی اس کے مقابلے میں بہت کمزور، مگر چالاکی میں، پورے جنگل میں اس کا ثانی کوئی نہیں تھا، ایک دفعہ شیر اور لومڑی میں کسی بات پر ٹھن گئی، لومڑی کے دل میں گرہ بیٹھ گئی اس نے شیر کو بے دست و پا بنانے کا ارادہ کرلیا:

لومڑی نے جنگل میں ایک بیوٹی پارلر کھول لیا اور جنگل کے بادشاہ سے استدعا کی کہ وہ اس کا افتتاح کرے، جنگل کا بادشاہ یعنی شیر یہ سن کر ہنسا اور اس نے کہا ''بناؤ سنگھار کے کاموں سے میرا کیا تعلق، یہ کام تم کسی اور سے کراؤ'' لومڑی بولی ''عالی جاہ! میں آپ کی ریپوٹیشن بہتر بنانا چاہتی ہوں، آپ کے متعلق آپ کے دشمن روزانہ نت نئی افواہیں پھیلاتے ہیں، آپ کو تنگ نظر مشہور کیا جارہا ہے، قدامت پسند کہا جاتا ہے اور آپ کو روشن خیالی کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، آپ بیوٹی پارلر کا افتتاح کریں گے تو آپ کے متعلق یہ افواہیں خود بخود دم توڑ جائیں گی'' شیر نے ایک لمحہ اس کی بات پر غور کیا اور پھر افتتاح کی حامی بھرلی۔

شیر نے بیوٹی پارلر کا فیتہ کاٹا، ریچھ، گیدڑ، لگڑ بگڑ اور دوسرے جانوروں نے بھرپور تالیاں بجائیں، اسٹیج سیکرٹری بندر تھا، اس نے پہلے تو اچھل اچھل کر داد دی پھر مائیک پر آکر کہا ''شہنشاہ دوراں: آج آپ نے اس محفل میں تشریف لاکر ثابت کردیا ہے کہ آپ ایک روشن خیال حکمران ہیں، بناؤ سنگھار کی سرپرستی سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ آپ احساسِ جمال

سے بہرہ ور ہیں، آپ خوبصورتی اور حسن کو پسند کرتے ہیں یوں آپ کی ذات کے حوالے سے کیا جانے والا ایک طرفہ پراپیگنڈہ زائل ہوگیا ہے۔'' شیر کو یہ ساری باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں مگر اس نے حاضرین کو تالیاں بجاتے دیکھا تو ان باتوں سے اس کی اجنبیت کم ہونے لگی۔ تقریب کے بعد لومڑی لہنگا پہن کر اسٹیج پر آئی، اس نے سات بار جھک کر شہنشاہ سلامت کو سلام کیا اور کہا ''یہ باندی آپ کی آمد کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ اب آپ کی آمد کی خوشی میں مجرا پیش کرتی ہوں'' پھر اس نے جی بھر کر مجرا کیا ،شیر پہلے تو حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر اسے لطف آنے لگا چنانچہ رقص وسرود کی یہ محفل ساری رات جاری رہی!

صبح لومڑی جنگل کے دوسرے جانوروں کے پاس گئی اور کہا ''شیر کی چیرہ دستیوں میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، اب تو وہ مجھ ایسی شریف زادیوں سے زبردستی مجرا بھی کرواتا ہے، پہلے اس کے ہاتھوں جان محفوظ نہیں تھی، اب کسی کی عزت بھی محفوظ نہیں رہی'' اس طرح کی دو تین ملاقاتوں کے نتیجے میں وہ شیر کے خلاف جنگل کے جانوروں کا ایک اتحاد تشکیل دینے میں کامیاب ہوگئی، اس اتحاد میں چیتا، بھیڑیا اور سانپ کے علاوہ خود شیر کا اپنا ایک بھائی بھی شریک تھا، اسے کہا گیا تھا کہ اگر اتحاد کامیاب ہوگیا تو تمہیں خوراک کے سلسلے میں کوئی تردّد نہیں کرنا پڑے گا، تمہارا دستر خوان انواع واقسام کے کھانوں سے بھر دیا جائے گا!

ایک دن لومڑی شیر کے پاس گئی اور کہنے لگی ''ظلِ الٰہی، جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟'' ظلِ الٰہی اس وقت ایک ہرن نوش جاں فرمانے کے بعد اونگھ رہے تھے، غنودگی کے عالم میں بولے ''کہو'' لومڑی نے دست بستہ عرض کی ''شہنشاہ دوراں آپ کی روشن خیالی کی دھوم تو پورے جنگل میں ہے لیکن چیتے، ریچھ اور سانپ نے آپ کے خلاف ایک کولیشن تشکیل دی ہے، آپ جانتے ہیں یہ بہت ظالم جانور ہیں۔ ان سب سے بیک وقت ٹکرانا مصلحت کے خلاف ہے، میرے پاس ایک تجویز ہے جس پر عمل کرنے سے ان کے غبارے سے ہوا نکالی جاسکتی ہے'' شیر نے غصے میں دھاڑتے ہوئے کہا ''تجویز پیش کی جائے'' ، لومڑی بولی ''بادشاہ سلامت، آپ کے خلاف سارا پروپیگنڈہ آپ کے پنجوں

اور آپ کے جبڑے کی وجہ سے ہے'' اس پر شیر نے غصے سے لومڑی کو دیکھا اور دھاڑتے ہوئے کہا ''تو کیا میں یہ نکلوا دوں'' لومڑی بولی ''خدا نہ کرے ایسا ہو لیکن اگر آپ صرف پنجوں کے ناخن کٹوا دیں اور سامنے والے دانت نکلوا دیں تو آپ کی طاقت بھی بحال رہے گی اور دشمن کا پراپیگنڈہ بھی خاک میں مل جائے گا۔'' شیر کو ڈر تھا کہ کہیں چیتے اور بھگیاڑ مل کر اس کی بادشاہت کا خاتمہ نہ کر دیں، اس نے بادل نخواستہ لومڑی کی یہ تجویز منظور کر لی!

اگلے روز شیر شکار کے لیے اپنے کچھار سے نکل کر ایک ہرن پر جھپٹا، اس نے دوڑ لگا دی، کئی کلومیٹر دوڑنے کے بعد شیر نے اسے قابو کر لیا لیکن جب اس کے جسم میں اپنے پنجے گاڑنا چاہے تو ناخن نہ ہونے کی وجہ سے یہ پنجہ پھسل گیا اور اپنے دانت ہرن کی گردن میں گاڑنے کی کوشش کی تو یہ کوشش بھی ناکام رہی اس جدوجہد کے دوران ہرن اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد شیر نے کئی دوسرے جانوروں پر قسمت آزمائی کی لیکن کوئی بھی اس کے قابو نہ آیا، شام تک بھوک کے مارے اس کا برا حال ہو گیا اور بالآخر وہ نڈھال ہو کر گر گیا!

اس کی آنکھیں اس وقت خوشی سے چمک اٹھیں جب اس نے رات کو لومڑی کو اپنی کچھار میں آتے دیکھا، لومڑی اسے دیکھ کر نہ کورنش بجا لائی، نہ اسے ظل الٰہی یا شہنشاہ دوراں کہا بلکہ ایک فاصلہ سے اسے مخاطب کیا اور طنزیہ انداز میں کہا ''بھوک تو بہت لگی ہو گی!'' شیر نے نقاہت سے کہا ''ہاں، بہت زیادہ! تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کرو، میں نے تمہارے مشورے پر اپنے ناخن کٹوائے اور اگلے دو دانت نکلوائے، اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرے لیے دو وقت کے گوشت کا بندوبست کرو!'' لومڑی نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور کہا ''اے بیوقوف چوپائے، کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا ........ ہاں تمہارے ساتھ چونکہ ایک تعلق بن گیا ہے، میں تمہارے لیے گوشت تو نہیں گھاس کا انتظام کر سکتی ہوں''

یہ سن کر شیر کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے جھپٹا مگر لومڑی جو پہلے سے چوکس تھی اور شیر جو ایک دن کے فاقے سے نڈھال تھا، اسے پکڑنے

میں ناکام رہا۔

تیسرے دن لومڑی پھر اس کے پاس آئی شیر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا اس نے لومڑی کو دیکھا تو کہا "مجھے گھاس کھانا منظور ہے، خدا کے لیے کہیں سے میرے لیے گھاس کا انتظام کرو، میں تو چل پھر کر اب گھاس بھی تلاش کرنے کے قابل نہیں رہا" لومڑی نے اس کی بے بسی دیکھی تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے کہا "گھاس بھی تمہیں اس شرط پر مل سکتی ہے کہ تم اپنے منہ سے میاؤں کی آواز نکال کر دکھاؤ" یہ سن کر شیر کا جی چاہا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے لیکن جسے اپنے وقار سے زیادہ اپنی جان عزیز ہو اس کی اس طرح کی خواہش پوری نہیں ہوا کرتی، چنانچہ شیر نے اپنا جی کڑا کر کے منہ سے میاؤں کی آواز نکالی اور پھر رحم طلب نظروں سے لومڑی کو دیکھنے لگا!

لومڑی نے اسے حقارت سے دیکھا اور کہا "یہ میاؤں کی آواز تم نے صحیح نہیں نکالی، کچھ دن ریاضت کرو، جب تم میاؤں کی آواز بالکل صحیح نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے اس دن سے تمہیں باقاعدگی سے گھاس ملنا شروع ہو جائے گی"

آخری اطلاعات آنے تک یہ شیر ان دنوں منہ سے میاؤں کی آواز نکالنے کی ریاضت میں مشغول ہے اور اسے اس میں کافی دسترس حاصل ہوتی جا رہی ہے!

❖❖❖
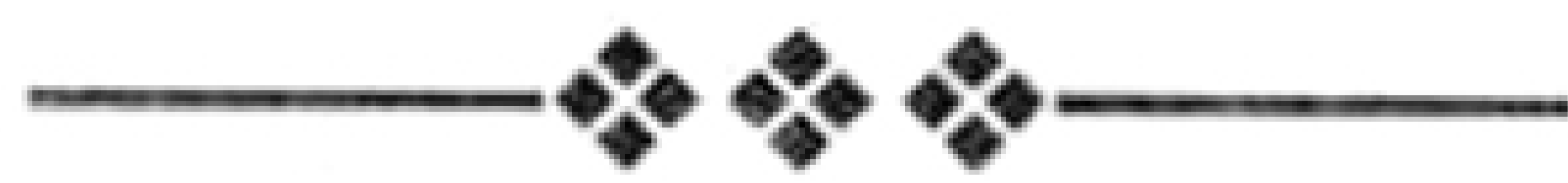
# بول میری مچھلی!

میں نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے دریا میں کنڈی ڈالی اور پھر مچھلی کے انتظار میں سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد کنڈی میں حرکت ہوئی' میں نے فوراً ایک جھٹکے سے اسے اوپر کی طرف کھینچا' مگر میں نے دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ کوئی مچھلی پھنسی نہیں بلکہ کنڈی کے ساتھ لگا گنڈویا بھی غائب تھا۔ میں نے ایک اور گنڈویا کنڈی میں پھنسایا اور ڈوری دریا میں پھینک دی اور ایک دفعہ پھر بگلا بھگت بن کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے ''اباسیاں'' آنے لگی تھیں' مگر مچھلی تھی کہ پھنسنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اتنے میں امید کی ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی یعنی ڈوری میں ایک بار پھر حرکت پیدا ہوئی' میں نے فوراً اسے اپنی طرف کھینچا مگر اس دفعہ بھی نہ صرف یہ کہ اس میں مچھلی کوئی نہیں تھی بلکہ وہ گنڈویا بھی غائب تھا' جو میں نے کنڈی کے ساتھ اس غرض سے پھنسایا تھا کہ یہ مچھلی کی خوراک بنے گا اور اس کے ذریعے مچھلی میری خوراک بنے گی' اب مجھ پر جھنجھلاہٹ سی طاری ہونے لگی تھی' ایک تو اس خیال سے کہ اتنی دیر میں کوئی مچھلی نہیں پھنسی تھی اور دوسرے یہ سوچ کر کہ مچھلیاں مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں۔ وہ اس صفائی سے گنڈوئے پر ہاتھ صاف کرتی تھیں کہ خود کنڈی کی زد میں آنے سے بچ جاتی تھیں' بلکہ تیسری دفعہ جب ڈوری میں حرکت ہوئی اور میں نے اسے اپنی طرف کھینچا تو مجھے مچھلیوں کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ مجھے ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سب مل کر میری توہین کر رہی ہوں۔ مگر میں نے ایک بار پھر اپنے غصے پر قابو پایا' میں دراصل جان گیا تھا کہ غصے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا چنانچہ میں نے اس کا سیاسی حل تلاش کرنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد میں یہ حل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے ڈوری دریا میں سے نکالی' اسے اپنے تھیلے میں بند کیا اور مترنم آواز میں گانا شروع کر دیا ۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

مجھے یوں لگا جیسے یہ گیت میرے علاوہ کسی نے نہیں سنا حتیٰ کہ اس جنگل میں مجھے اس کی بازگشت بھی سنائی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر اپنا سارا ترنم یکجا کیا اور آواز میں سوز پیدا کرتے ہوئے کہا ۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

مگر اس بار بھی دریا میں مکمل خاموشی تھی' تیسری بار میری آواز میں واقعی غم کا عنصر پیدا ہو گیا اور یہ غم احساس شکست کی وجہ سے پیدا ہوا تھا چنانچہ جب میں نے اس دفعہ ۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

کہا تو میری آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک ساتھ بہت سی مچھلیاں دریا کی سطح پر نمودار ہوئیں۔ انہوں نے کچھ دیر کے لیے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر انہوں نے ''کھڑ ولّیاں'' مار کر ہنسنا شروع کر دیا۔ جب وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کھل کر ہنس چکیں تو ان میں سے ایک مچھلی نے پھدک کر ساحل کے قریب آتے ہوئے کہا ''یہ تم کیا بے معنی سا گیت گا رہے ہو' تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ سمندر نہیں دریا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ہرا نہیں ہے۔ تم اس قسم کے رجعت پسندانہ سلوگنز سے اب ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے'' اس کے ساتھ ہی اس مچھلی نے حلق کی پوری قوت سے

سرخ ہے سرخ ہے ایشیا سرخ ہے

کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے اس مچھلی سے کہا ''میں نے تمہاری بات سن لی ہے' لیکن اگر تم میری بات بھی سن لو' تو شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں'' بیشتر اس کے کہ یہ مچھلی کوئی جواب دیتی' ایک اور مچھلی نے پھدک کر پانی سے اپنا سر باہر نکالا اور کہا ''تمہارے قول اور فعل میں تضاد ہے ایک طرف تم ''ہرا سمندر'' کہہ کر ہمیں امن اور سلامتی کا تصور دے رہے ہو' مگر دوسری طرف تم ہمیں شکار کرنے کے لیے کنڈی بھی دریا میں ڈالتے ہو'' اور پھر اس کے ساتھ ہی اس نے

المدد المدد یا خدا یا خدا

کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس مچھلی سے کہا ''میں نے تمہاری بات سن لی ہے لیکن اگر تم میری بات بھی سن لو' تو شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ جائیں'' مگر اس نے پانی میں غوطہ لگایا اور دریا کی تہہ میں چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی دوسری مچھلیاں بھی غوطہ مار کر نظروں سے غائب ہو گئیں۔

اب میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ میں ان نافرمان مچھلیوں کو ان کے کیے کی پوری سزا دیتا۔ چنانچہ میں نے کنڈی تو تھیلے ہی میں رہنے دی' اور اس کی جگہ ایک بڑا سا جال نکال کر دریا میں پھینک دیا اور ایک دفعہ پھر سگریٹ سلگا کر مچھلیوں کے پھنسنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ دریا میں سے کھسر پھسر کی آوازیں آرہی ہیں اور پھر یہ آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ مگر پھر رفتہ رفتہ یہ آوازیں مدھم ہونا شروع ہوئیں' حتیٰ کہ دریا میں مکمل خاموشی چھا گئی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہر طرف سناٹوں کا راج ہے۔ مجھے ان سناٹوں سے خوف آنے لگا اتنے میں جال میں حرکت ہوئی' میرا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا' میں نے فوراً پوری قوت سے جال کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ جال کے دوسری طرف کوئی مجھے کھینچ رہا ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر اپنی ساری قوتیں مجتمع کیں' مگر میرے پاؤں زمین پر سے اکھڑ رہے

تھے۔ پیشتر اس کے کہ میں ایک جھٹکے کے ساتھ دریا میں جا گرتا' لاکھوں مچھلیاں سطح آب پر نمودار ہوئیں اور انہوں نے بیک آواز کہا ''تم اگر اپنی اور ہم سب کی سلامتی چاہتے ہو تو جال کا یہ سرا جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ فوراً چھوڑ دو!'' میں نے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے اپنے لہجے میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہوئے کہا ''یہ نہیں ہوسکتا'' ان بے شمار مچھلیوں میں سے ایک مچھلی پانی پر سے پھدک کر ساحل کے قریب پہنچی اور کہا ''میں ان لاکھوں مچھلیوں کی طرف سے جو اس وقت سطح آب پر میرے ساتھ ہیں' تم سے ہاتھ جوڑ کر التماس کرتی ہوں کہ تم جال کا یہ سرا جو تمہارے ہاتھ میں ہے فوراً چھوڑ دو کہ اس میں تمہاری اور ہم سب کی سلامتی ہے!'' مجھے اس مچھلی کے لہجے میں ایک عجیب سا اضطراب نظر آیا' میں نے پوری قوت سے زمین میں اپنے قدم گاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''یہ تم بار بار میری اور اپنی سلامتی کا مشترکہ ذکر کیوں کر رہی ہو؟'' اس پر اس مچھلی نے مزید مضطرب انداز میں کہا ''باتوں کے لیے وقت بہت کم رہ گیا ہے' تم وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں کیونکہ جال کے اس طرف تم اور جال کے دوسری طرف اس دریا کا سب سے بڑا مگرمچھ ہے۔ ہم میں سے کچھ نادان مچھلیوں نے اس کی مدد طلب کی ہے' مگر یہ نہیں جانتیں کہ یہ مگرمچھ جوان کا غم خوار بن کر انہیں اپنے قریب لانے میں کامیاب ہوا ہے تم سے نجات دلانے کے بعد یہ ہم سب کو کھا جائے گا۔ دریا کے دوسرے کنارے کی مچھلیوں کو اس مگرمچھ کا تجربہ ہو چکا ہے اور ہم نہیں چاہتیں کہ یہ تجربہ اس کنارے پر بھی دہرایا جائے۔ یہ سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جال پر میری گرفت کمزور ہو رہی ہے اور پھر میں نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ ایک بار یوں لگا جیسے دریا میں زلزلہ آ گیا ہو۔ پانی کی تند و تیز موجیں ساحل سے اپنا سر ٹکرانے لگیں اور پانی ساحل سے باہر بہنے لگا۔ دریا میں طوفان سا آ گیا تھا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد اس طوفان میں کمی آ گئی۔ لہریں پرسکون ہونا شروع ہوئیں اور پھر دریا پوری نغمگی کے ساتھ بہنے لگا۔ میں نے مچھلیاں شکار کرنے والا تھیلا دریا میں پھینکا اور پھر واپس مڑتے ہوئے ایک دفعہ ہولے سے کہا۔

ہرا سمندر گوپی چندر

بول میری مچھلی کتنا پانی

اس پر لاکھوں کروڑوں مچھلیاں ایک بار پھر سطح آب پر نمودار ہوئیں اور انہوں نے خوشی سے بھری ہوئی آواز میں اپنے ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے کہا "اتنا پانی"

❖❖❖
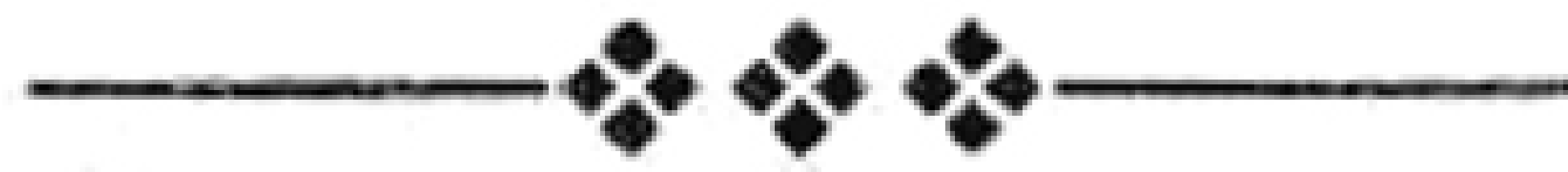
# ہنسنے والا بوڑھا

کراچی ائیر پورٹ پر ایک دوست نے ایک بوڑھے شخص کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ ہنسنے والا بوڑھا ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کیا مطلب؟" دوست نے کہا اس کے سامنے اگر کوئی ہنسے تو جواب میں یہ بوڑھا بھی ہنسنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اس کی ہنسی رکتی ہی نہیں! میں نے غور سے اس بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید لمبی داڑھی تھی، پوپلے منہ میں صرف دو دانت تھے جو منہ کھولنے پر باہر کی طرف جھانکنے لگتے تھے۔ یہ بزرگ صورت انسان دیکھنے میں بہت سنجیدہ لگتا تھا، اس نے سفید وردی پہنی ہوتی تھی، وہ غالباً سول ایوی ایشن میں ملازم تھا۔ اتنے میں میرا دوست اس کی طرف بڑھا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے میرے پاس لے آیا۔

"صاحب! خدا کے لیے آپ ہنسنا نہیں" بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کی اس بات پر بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ جس پر بوڑھا کھلکھلا کر ہنس پڑا، اس کے بے ساختہ ہنسنے پر میری ہنسی تیز ہو گئی۔ مجھے اس طرح ہنستے دیکھ کر بوڑھے نے پیٹ پکڑ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ اب میرے لیے اپنی ہنسی کو تہذیب کی حدوں میں رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری ہنسی بھی تقریباً چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ اس پر بوڑھا ہنستے ہنستے فرش پر لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر قہقہوں کے درمیان رک رک کر منت سماجت میں مشغول ہو گیا۔ "خدا کے لیے بس کریں بابو جی، خدا کے لیے ہنسنا بند کریں۔ نہیں تو ہنستے ہنستے میرا دم نکل جائے گا۔" اس صورتحال پر میرے لیے ہنسی روکنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ میں بوڑھے سے کافی

فاصلے پر منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تا کہ اسے میرا ہنستا ہوا چہرہ نظر نہ آئے۔ تھوڑی دیر بعد میری ہنسی ویسے ہی تھم گئی۔ اس دوران بوڑھا کپڑے جھاڑ کر فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ ایک دفعہ پھر بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور کہا ''بابا جی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی' شکر ہے اس دور میں کوئی ہنسنے والا تو ملا۔'' بوڑھے نے بھی جواباً بہت گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور میں اسے تھپکی دے کر اپنے دوست کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''یہ ہنسنے والا بوڑھا تمہیں کیسا لگا؟'' دوست نے ہنستے ہوئے پوچھا

''بہت اچھا' اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔''

''مگر یہ ہنسنا اس کے لیے عذاب بن کر رہ گیا ہے۔ لوگ محض اسے ہنسانے کے لیے اس کے سامنے آ کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔''

''پھر؟''

''پھر یہ ہنستا چلا جاتا ہے۔ خدا خدا کر کے اس کی ہنسی تھمتی ہے تو کوئی دوسرا اسے ہنسانے چلا آتا ہے اور یوں یہ بیچارا سارا دن بس اسی کام میں لگا رہتا ہے۔''

''پھر تو واقعی یہ شخص پرابلم میں ہے۔ اسے سنجیدہ کرنے کے لیے تم نے کچھ سوچا؟''

''نہیں' تم ہی کوئی حل بتاؤ۔''

''اسے کہو جلے بھنے لوگوں کی صحبت میں رہا کرے۔ مثلاً افسروں وغیرہ کے ساتھ اٹھا بیٹھا کرے۔''

''افسروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو خیر کیا ہے کہ غریب آدمی ہے مگر رہتا انہیں افسروں کی صحبت میں ہے۔ سارا دن ان کی جھاڑیں کھاتا ہے اور ہنستا رہتا ہے۔''

''اسے سنجیدہ کرنے کا ایک طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے۔'' میں نے چٹکی

بجاتے ہوئے کہا۔ ”پھر مجال ہے کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی آ جائے۔ اسے کسی حسینہ کی محبت میں قید کر دو“

”یہ بڑا ڈھیٹ بابا ہے“ دوست نے ہنستے ہوئے کہا ”یہ اپنی محبت کے قصے سناتا ہے تو ہنس ہنس کر دہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ کیا نادانی کے دن تھے۔“

”اچھا۔ تو پھر یوں کرو اسے کسی فائل کے چکر میں ڈال دو۔ دفتروں کے پھیرے لگے تو ساری عمر کے لیے ہنسنا بھول جائے گا۔“

”یہ اس چکر میں پڑ ہی نہیں سکتا۔ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ ہوتا تو اس طرح ہنستا؟“

”اچھا تو پھر یوں کرو اس کی دوسری شادی کرا دو“

”پھر وہی بچوں والی بات۔ میرے یار اس نے ابھی تک پہلی شادی بھی نہیں کی۔ کیا تمھیں اس کے قہقہوں سے اندازہ نہیں ہوا؟“

”ہاں کچھ ہوا تو تھا، میں سمجھا ممکن ہے طلاق ہو گئی ہو“

”لگتا ہے تمہارے پاس اس ہنسنے والے بوڑھے کو غمزدہ کرنے کے لیے مزید کوئی تجویز نہیں رہی؟“

”ہے، مگر یہ آخری ہے۔ تم آزما کر دیکھنا، مجھے یقین ہے اس کے بعد ہمارے معاشرے کے ہر فرد کی طرح اس کے چہرے سے بھی مسکراہٹ غائب ہو جائے گی“

”وہ کیسے؟“ دوست نے بے تابی سے پوچھا

”وہ ایسے کہ صبح صبح اس کے سامنے اخبار رکھ دیا کرو، اگر یہ خود پڑھ سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے سرخیاں پڑھ کر سناؤ۔ جب یہ روزانہ نہار منہ اتنی ڈھیر ساری دل دہلانے والی خبریں سنے گا تو اس کی سات پشتوں کے چہرے پر بھی کوئی ہنسی آ جائے تو تم میرا نام بدل دینا۔“

''بہت مؤثر تجویز ہے'' دوست نے کہا'' مگر بہت ظالمانہ ہے۔ اگر ہمارے ماحول سے ہنسی بالکل غائب ہوگئی تو لوگ آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔ میرے خیال میں اس بوڑھے کو اسی طرح ہنسنے دو۔ اس کی وجہ سے اس کے ارد گرد کی فضاؤں میں مسکراہٹوں کے کتنے ہی گلاب کھلتے ہیں۔ بلکہ اس شخص سے اتنے ہنسنے کی وجہ بھی نہیں پوچھنی چاہئے۔ کیا پتہ اس ہنسی کے لیے اس نے غم کے کتنے سمندر عبور کیے ہیں؟''

---❖❖❖---
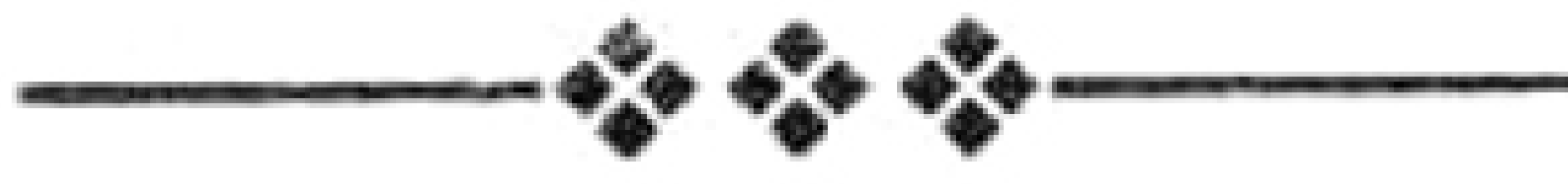
# کچا پنکچر

ماڈل ٹاؤن ایف بلاک میں پروفیسر منان یسٰین کا گھر تلاش کرتے ہوئے جب میں نے بائیں جانب کو ٹرن لیا تو کچھ یوں محسوس ہوا۔ جیسے موٹر سائیکل کو میرا موڑ کاٹنے کا فیصلہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ کیونکہ ان لمحوں میں مجھے اس ''شیطانی چرخے'' کو قابو میں رکھنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک بار پھر یوں لگا۔ جیسے موٹر سائیکل کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔ اس بار میں نے چیک کرنے کے لیے نیچے اتر کر اسے سٹینڈ پر کھڑا کیا۔ اور اگلا ٹائر ''ٹوہ'' کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ پنکچر ہو چکا ہے۔

''اب کیا کیا جائے؟'' میں نے رفیق نشست احمد حسن حامد سے کہا: ''اس خوبصورت بستی میں میں نے زندگی کے قریباً پندرہ برس گزارے ہیں۔ اور میں جانتا ہوں۔ یہاں قرب و جوار میں موٹر سائیکلوں کی کوئی دکان نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو آج جمعہ ہے۔''

بس سٹاپ بھی کچھ اتنا نزدیک نہیں تھا۔ چنانچہ ایک گھوڑے کی طاقت کے مالک (CC100) اس موٹر سائیکل کو چند قدم گھسیٹنے کے بعد میرا سانس پھول گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ اس گھوڑے کے مقابلے میں' میں ایک لاغر گھوڑا ہوں۔ اتنے میں ایک کار میرے قریب آ کر رکی۔ اس میں مکیش بیٹھا تھا اور وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال رہا تھا۔

مکیش کا اصل نام جاوید تھا۔ مگر وہ بچپن میں مکیش کے گانے ہو بہو مکیش کی آواز میں دوستوں کو سنایا کرتا تھا۔ جس سے اس کا نام مکیش پڑ گیا تھا۔

''تم میرے ساتھ بیٹھو۔ یہاں قریب ہی ایک سائیکلوں کی دکان ہے۔ جو موٹر

سائیکلوں کے پنکچر بھی لگاتا ہے۔ ذرا دیکھتے ہیں!۔ وہ دکان آج کھلی بھی ہے یا نہیں؟'' مکیش نے کہا۔ دکان بند تھی۔

البتہ ایک لڑکا ایک سائیکل میں پمپ سے ہوا بھر رہا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ اس کے پاس کھوکھے کی چابی تو ہے۔ لیکن جمعہ کی نماز کا وقت چونکہ قریب ہے۔ اس لیے اس کے پاس پکا پنکچر لگانے کا وقت نہیں۔ کیونکہ اس کے لیے بھٹی گرم کرنا پڑے گی۔ البتہ وہ کچا پنکچر لگا دے گا۔

اس نے ہمیں مشورہ دیا کہ یہ عارضی پنکچر لگوانے کے بعد ہم وقت ضائع کیے بغیر ہی سی بلاک میں واقع موٹر سائیکلوں کی دکان سے پنکچر لگوالیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ کسی بھی وقت دوبارہ پنکچر ہوسکتا ہے۔

موٹر سائیکل میں سائیکل کا پنکچر لگوانے کے بعد میں نے احمد حسن حامد کو جلدی سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ اور پھر میں نے موٹر سائیکل کا رخ فل سپیڈ پر سی بلاک کی طرف موڑ دیا۔ میں جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا کہ عارضی پنکچر کہیں راستے ہی میں نہ اکھڑ جائے اور یوں ہمیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔

راستے میں شک پڑنے پر میں نے ایک جگہ موٹر سائیکل کھڑا کیا اور اگلے پہیے کی ہوا چیک کی۔ اور مجھے بڑی خوش گوار سی حیرت ہوئی کہ ہوا اپنی پوری مقدار میں موجود تھی۔

سی بلاک میں پنکچر کی دکان کھلی تھی۔ میں نے وہاں بریک لگائی اور ایک بار پھر ہوا چیک کی تو وہ ٹھیک تھی۔ چنانچہ میں نے حامد سے کہا:

''یہ دکان دار مصروف ہے۔ آگے کسی دوسری دکان سے پنکچر لگوالیں گے۔''

اور پھر موٹر سائیکل کا رخ فیروز پور روڈ کی طرف پھیر دیا۔ راستے میں پنکچر کی دو ایک دکانیں کھلیں تھیں۔ مگر مجھے جلدی تھی۔ چنانچہ میں اسی طرح چلتا ہوا اپنے گھر ونڈسر پارک پہنچ گیا۔ میں نے سوچا پکا پنکچر کل لگوالیں گے۔

اگلے روز صبح گھر سے نکلتے وقت میں نے اگلا ٹائر چیک کیا اور مجھے یہ جان کر

مسرت ہوئی کہ ابھی تک ہوا کی پوری مقدار اس میں موجود ہے۔ تاہم میں نے فیصلہ کیا۔ رستے میں کہیں سے پکا پنکچر لگوالیا جائے۔ تاکہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن یکے بعد دیگرے کی فوری مصروفیات کے باعث میری یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اس دوران میں کئی دکانوں کے سامنے سے بھی گزرا۔ مگر اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے پنکچر نہ لگوا سکا۔ تاہم اس تمام عرصے میں میرے دل کو ایک دھڑ کا سا لگا رہا کہ کہیں یہ چلتے چلتے اچانک پنکچر نہ ہو جائے۔ چنانچہ شام کو جب میں بخیریت گھر پہنچ گیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ دل میں تہیہ کیا کہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ:

"ایک گھوڑے کی طاقت کے مالک اس موٹر سائیکل کو پکا پنکچر لگواؤں گا۔"

مگر جب اگلی صبح بھی میں نے ٹائر کو صحیح حالت میں پایا تو میرے اندر ایک نئی خود اعتمادی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ کچا پنکچر بھی کوئی ایسی کچی چیز نہیں ہے۔ اس ضمن میں مزید تقویت مجھے اپنے بعض دوستوں کی طرف سے حاصل ہوئی۔ جنہوں نے مجھے یقین دلایا کہ کچے پنکچر اور پکے پنکچر میں کوئی فرق نہیں۔ اصل چیز مستری کی مہارت ہے۔ اگر پنکچر لگانے والا ماہر ہو تو کچا پنکچر بھی لوہے کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ اناڑی ہو تو پکا پنکچر بھی عارضی ثابت ہوسکتا ہے۔ لہٰذا تم بے فکر ہو کر موٹر سائیکل چلاؤ۔ خطرے کی کوئی بات نہیں: چنانچہ میں نے اپنے ذہن کے سارے خدشات جھٹک دیے اور یہ فیصلہ کیا کہ پکا پنکچر لگوانے پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں اور پھر میں پورے اعتماد سے پورے شہر میں موٹر سائیکل پر دندناتا رہا۔

جب اگلے روز شہر سے گیارہ میل دور ایک ویران جگہ پر موٹر سائیکل کا کچا پنکچر اچانک اکھڑ گیا تو مجھے شدید غصہ آیا۔ اور آج کئی دن گزرنے کے بعد بھی میں اس کوفت کا سوچتا ہوں جو اس واقعہ کی وجہ سے مجھے اٹھانا پڑی تو ایک بار پھر جھنجھلا اٹھتا ہوں۔ یہ اسی کوفت کا نتیجہ ہے کہ میں یہ تمام واقعہ اپنے تمام دوستوں کو اس تفصیل کے ساتھ سناتا ہوں مگر وہ بیچ ہی میں بور ہو جاتے ہیں۔ اور "اباسیاں" لینے لگتے ہیں۔ بس ایک دوست ایسا تھا۔

جس نے یہ واقعہ پوری دلچسپی سے سنا۔ اور پھر آخر میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

''یہ واقعہ صرف تمہارے ساتھ ہی پیش نہیں آیا۔ بار ہا پوری قوم کے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ جب کبھی گاڑی کا کوئی پہیہ پنکچر ہوتا ہے۔ مارشل لاء کا کچا پنکچر لگا دیا جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ٹائر میں ہوا کی پوری مقدار برقرار رہے اور دوستوں کی طرف سے حوصلہ افزا مشوروں کے نتیجے میں ڈرائیور میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کچے پنکچر ہی کو پکے پنکچر کا متبادل سمجھنے لگتے ہیں۔ جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ خیر چھوڑو! یہ بتاؤ پھر تم نے موٹر سائیکل کا کیا کیا؟''

''کرنا کیا تھا؟'' میں نے کہا: ''مجھے قریباً تین میل تک اسے گھسیٹنا پڑا۔ مگر موٹر سائیکلوں کی کوئی دکان نظر نہ پڑی۔ یہاں بھی سائیکلوں ہی کی ایک دکان دکھائی دی۔ جہاں مستری نے کچا پنکچر لگایا اور مجھے ہدایت کی کہ اولین فرصت میں پکا پنکچر لگوالوں۔''

''پھر تم نے پکا پنکچر لگوایا کہ نہیں؟'' دوست نے پوچھا۔

''ایک دو دن میں انشاءاللہ لگوالوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے موٹر سائیکل ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔ میں نے متعدد بار اس کی ہوا چیک کی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔

اور پھر یار! یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ ہر بار کوئی تلخ تجربہ ہی ہو۔ مجھے تو یہ مستری پہلے مستری سے بہتر لگا ہے۔ اصل چیز تو مہارت ہے نا۔ میرے خیال میں اب کے کچا پنکچر چل جائے گا۔

# رات کے گیارہ بجے

گزشتہ روز میرے ایک دوست نے فون کیا۔ میں نے کہا ''رات کو گیارہ بجے کے بعد فون کرنا'' اور فون بند کر دیا۔

ایک دوست ملنے آئے' میں نے انہیں دروازے ہی سے رخصت کر دیا اور کہا ''رات کو گیارہ بجے کے بعد تشریف لائیں' آرام سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔''

بچوں نے سکول کا کام کرنے کے لیے بستے کھولے تو میں نے انہیں ڈانٹ کر کہا ''یہ کام کرنے کا وقت ہے' رات کو گیارہ بجے کے بعد کرنا۔''

والد ماجد جن کی عمر ماشاء اللہ 86 برس ہے۔ سونا چاہ رہے تھے مگر انہیں نیند نہیں آرہی تھی' میں نے کہا ''آپ گیارہ بجے کے بعد سونے کی کوشش کریں' انشاء اللہ نیند آجائے گی۔''

ایک دوست کا فون آیا کہ ''یار مجھے بخار سا ہو رہا ہے گھر پر کوئی نہیں ہے اگر ہو سکے تو مجھے ڈاکٹر سے دوا لا دو'' میں نے کہا ''میں حاضر ہوں' مگر تم کوشش کرو کہ بخار تمہیں رات کے گیارہ بجے کے بعد چڑھے کہ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔''

میرے دوست اور عزیز واقربا میری طرف سے عائد شدہ اس عجیب وغریب ٹائم کی پابندی سے بہت نالاں تھے' چنانچہ میں نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کا فیصلہ کیا!

دوست کا فون آیا تو میں نے اس سے گپ شپ کرنا شروع کر دی' چند لمحوں کے بعد اس نے کہا ''یار یہ جو تم نے گانوں کی ٹیپ لگائی ہوئی ہے' خدا کے لیے اسے تو بند کرو' یا

اسے آہستہ ہی کر دو، تمہاری آواز سنائی نہیں دے رہی!'' میں نے کہا ''برادرم! یہ گانوں کی ٹیپ نہیں، سلطان باہو کا کلام گایا جا رہا ہے اور یہ آواز میرے کمرے سے نہیں، برابر والی مسجد سے آ رہی ہے!''

دوست نے کہا ''ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر بعد فون کرلوں گا!'' میں نے کہا ''تھوڑی دیر بعد نہیں، رات کے گیارہ بجے کے بعد کرنا' کیونکہ یہ پروگرام رات گیارہ بجے تک جاری رہتا ہے۔''

ایک دوست ملنے کے لیے آئے تو میں نے انہیں دروازے ہی سے رخصت کرنے کی بجائے ڈرائینگ روم میں بٹھایا' چائے منگوائی اور گپ شپ شروع کر دی' تھوڑی ہی دیر بعد وہ ناراض ہو گئے اور کہنے لگے ''یہ تم نے کیا کہا کہ تم دوزخ میں جاؤ گے؟'' میں نے کہا ''برادر! یہ میں نے نہیں کہا برابر والی مسجد کے مقرر صاحب کہہ رہے ہیں!'' یہ سن کر انہوں نے معذرت کی اور کہا ''میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا' تاکہ آرام سے باتیں تو ہو سکیں!'' میں نے کہا ''رات کے گیارہ بجے کے بعد آنا کہ یہ سلسلہ اس سے پہلے ختم نہیں ہوتا۔''

بچوں نے سکول کا کام کرنے کے لیے بستے کھولے تو میں نے انہیں پچکار کر کہا ''شاباش اچھے بچوں کی طرح اب سکول کا کام کر کے ہی اٹھنا!'' مگر تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے بستے بند کر دیئے اور کہا ''ابو اسے منع کرو، ہم سے سکول کا کام نہیں ہو رہا!'' میں نے کہا ''بیٹے میں کیسے منع کر سکتا ہوں' میں نے مرنا ہے۔ تم سکول کا کام رات کے گیارہ بجے کے بعد کر لینا!''

والد صاحب عشاء کی نماز پڑھ کر سونے لگے تو میں نے انہیں کہا ''آپ سکون سے گہری نیند سوئیں میں آپ کو صبح تین بجے جگا دوں گا' کیونکہ اس وقت علامہ صاحب نے بھی جاگنا ہوتا ہے!'' مگر کچھ دیر بعد والد صاحب بے آرام سے ہو کر اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے ''میں رات کو گیارہ بجے کے بعد ہی سوؤں گا!''

بخار والے دوست کا فون اگلے روز خود ہی آ گیا' اس نے کہا'' یار' تم ٹھیک کہتے تھے' رات کو گیارہ بجے سے پہلے بیمار نہیں ہونا چاہئے' میرے محلے میں بھی چاروں طرف لاؤڈ سپیکر فٹ ہیں' ان کی وجہ سے بخار تیز ہوتا گیا' لیکن رات گئے جب لاؤڈ سپیکر خاموش ہوئے' میرا بخار اترنا شروع ہوا اور اب اللہ کا شکر ہے' میں ٹھیک ہوں' آئندہ میں کوشش کروں گا کہ رات کو گیارہ بجے سے پہلے بیمار نہ پڑوں!''

دوستوں کو تو میں نے مطمئن کر دیا کہ میں انہیں رات کے گیارہ بجے کے بعد کا ٹائم کیوں دیتا ہوں' مگر میں نے اپنے طور پر سوچا کہ انسان کو حالات کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کرنا چاہئے چنانچہ مسجد کے میناروں میں مشرق' مغرب اور شمال جنوب کی طرف فٹ چاروں لاؤڈ سپیکروں سے خود کو غافل کر کے میں سر شام ہی اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھ گیا اور کالم لکھنے کی تیاریاں کرنے لگا' مگر مجھے یوں لگا جیسے میرے کمرے کے اندر جلسہ ہو رہا ہے' چنانچہ میں نے سوچا کہ لاؤنج میں بیٹھ کر لکھنا چاہئے' مگر لاؤنج میں اصل آواز کے علاوہ آواز کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی' اس پر میں نے باورچی خانے کا رخ کیا کہ چولہے کے پاس بیٹھ کر لکھ لوں گا' لیکن جب میں چولہے کے پاس بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا جیسے یہ آواز چولہے کے اندر سے آ رہی ہے' اب لے دے کے گھر کا غسل خانہ رہ گیا تھا' میں نہانے کی چوکی پر بیٹھ گیا مگر مقرر کی آواز میں اتنی کڑک تھی کہ اس سے پیدا ہونے والی تھرتھراہٹ سے چوکی اپنی جگہ سے اٹھ کر فضا میں بلند ہونے لگی' اس پر میں نے گھبرا کر گھر کی چھت کا رخ کیا' مگر وہاں تو جیسے کہرام مچا ہوا تھا' چنانچہ میں ہڑبڑا کر نیچے آ گیا اور دوبارہ اپنی لکھنے کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور قارئین! میں اپنی لکھنے کی میز پر بیٹھا ہوں اور کالم لکھ رہا ہوں اور اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں!

❖❖❖

# عیادت کرنا منع ہے

ہمارے ایک دوست حال ہی میں طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئے ہیں۔ موصوف چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو پہلا ''بیان'' انہوں نے عیادت کرنے والوں کے خلاف داغا بولے ''تمہیں پتہ ہے بیماری میں مجھے سب سے زیادہ تکلیف کس نے پہنچائی ؟''

''کس نے؟'' میں نے پوچھا

''عیادت کرنے والوں نے'' دوست نے جواب دیا

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ صبح سے شام تک ان کا تانتا بندھا رہتا تھا' ایک آتا تھا' دوسرا جاتا تھا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے' اپنوں اور غیروں کا پتہ ایسے مواقع پر چلتا ہے!''

''میں نے کب کہا ہے کہ یہ اچھی بات نہیں!''

''تمہاری باتوں سے تو مجھے یہی محسوس ہوا''

''تم نے ابھی میری بات سنی کب ہے؟ یہ عیادت کرنے والے میری حالت دیکھ کر ایسے مغموم چہرے بناتے تھے کہ لگتا تھا مجھ سے زیادہ دکھی یہ ہیں۔''

''ظاہر ہے عزیز واقارب کو دکھ تو ہوتا ہی ہے۔''

ہاں! تمہاری بات اصولی طور پر ٹھیک ہے۔ غلط تو یہ اس وقت ثابت ہوئی جب ان میں سے کچھ نے کہا کہ کوئی مسئلہ ہو تو ہمیں بتاؤ اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا لیکن

انہوں نے اصرار کیا کہ نہیں ہمیں خدمت بتاؤ ہم تمہیں صحت یاب دیکھنا چاہتے ہیں!''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں سمجھا کہ وہ خلوص دل سے اس مشکل وقت میں میرے کام آنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک سے جھجکتے جھجکتے کہا ''میری علالت کی وجہ سے بچے سکول نہیں جا رہے کیونکہ انہیں لانے لے جانے والا کوئی نہیں جس سے ان کی تعلیم کا حرج ہو رہا ہے' آپ اپنے بچوں کو سکول چھوڑنے جاتے ہیں' رستے میں میرے بچوں کو بھی ''پک'' کر لیا کریں۔''

''تو کیا انہوں نے انکار کر دیا؟''

''نہیں! پورے ایک ہفتے تک بچوں کو لے جاتے رہے' اس کے بعد انہوں نے شکل ہی نہیں دکھائی!''

''یہ تو واقعی بری بات ہے!''

''ابھی تو میں نے تمہیں اور بھی بہت سی بری باتیں سنانی ہیں۔''

''مثلاً''

''مثلاً یہ کہ میری بیوی میری دیکھ بھال کرتے کرتے خود بیمار ہو گئی' اس پر میں نے ایک غم خوار سے کہا کہ آپ آج کی رات میری دیکھ بھال کے لیے یہیں رک جائیں' میں کل کوئی اور انتظام کر لوں گا۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے کہا۔

''کیوں نہیں' کیوں نہیں میں گھر اطلاع دے کر ابھی آتا ہوں۔'' مگر تھوڑی دیر بعد ان کی جگہ ان کی بیوی کا فون آیا کہ گھر آتے ہی انہیں تیز بخار ہو گیا ہے اس لیے وہ نہیں آ سکیں گے!''

''چلو چھوڑو یار! کوئی اور بات کرو!'' میں نے بدمزہ ہو کر کہا۔

''کیسے چھوڑوں! مجھے تو ان خالی عیادت کرنے والوں سے چڑ ہو گئی ہے' شکر ہے

تم ان دنوں بیرون ملک تھے۔''

''اچھا دفع کرو' کوئی اور بات کرتے ہیں۔''

''اچھی بات تو تم نے کہہ دی......''

''میں نے ابھی اپنی بات نہیں کہی' کیونکہ یہ عیادت کرنے والے اب بھی سخت پریشان کرتے ہیں۔''

''وہ کیوں! تم تو ٹھیک ہو گئے ہو!''

''میں تو ٹھیک ہو گیا' یہ ٹھیک نہیں ہوئے' ابھی کل ایک صحافی دوست آئے' ملکی حالت پر سخت پریشان تھے۔ پاکستان کا نام ان کی زبان پر آتا تھا تو آب دیدہ ہو جاتے تھے۔ میں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو کہا کہ آپ اگر چاہیں تو ملک کو ان خطرات سے نکال سکتے ہیں بولے وہ کیسے؟ میں نے کہا آپ ان تمام افراد کے چہروں پر سے نقاب اُٹھائیں جو حکومت کے اندر اور حکومت کے باہر ملکی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہیں! کہنے لگے حتی المقدور یہ کام کرتا رہتا ہوں' میں نے کہا حتیٰ المقدور کیا ہوتا ہے' اگر ملک بچانا ہے تو پورا سچ لکھنا ہوگا۔ کہنے لگے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے میں بے عمل ضرور ہوں تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے پاکستان سے محبت نہیں......اور پاکستان کا نام زبان پر آنے پر ایک بار پھر وہ آبدیدہ ہو گئے!''

یہ عیادت کے ذکر میں پاکستان کہاں سے آ گیا!''

''کیا تمہیں نہیں...... پتہ یہ کیسے درمیان میں آ گیا؟ یہ لوگ بیمار پاکستان کی عیادت دن میں کئی بار کرتے ہیں۔ مگران میں سے کوئی اس کی صحت یابی کے لیے اپنا کردار ادا نہیں کرتا۔ صحافی سچ نہیں لکھتا۔ استاد موسیٰ کی بجائے فرعون پیدا کرتا ہے۔ سیاست دان اقتدار کے لیے ملک دشمنوں سے گٹھ جوڑ کر لیتا ہے' عالم فساد پھیلاتے ہیں' انکم ٹیکس والے لاکھوں کے لیے کروڑوں کا ٹیکس چھوڑ دیتے ہیں' صنعت کار ہوس زر میں مبتلا ہے' حکمرانوں کو حکومت کا چسکا ہے۔ دانشور دل کی باتیں کہنے کی بجائے فیشن ایبل باتیں کرتا ہے۔

جرنیل ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ سب لوگ پاکستان کی عیادت بھی کرتے رہتے ہیں اس طرح یہ اس کے دکھوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ میں تو انہی دنوں میں ایک تختی لکھوا کر مینار پاکستان پر لگا رہا ہوں!''

''کونسی تختی؟''

''چند لفظوں پر مشتمل تختی ............ اس پر لکھا ہوگا ''عیادت کرنا منع ہے۔''

شاید یہ تختی لوگوں کو عیادت کے آداب سکھا دے؟

# خوف

''ملک صاحب! اس وقت آپ کی عمر کتنی ہے؟'' میں نے اپنے پڑھے لکھے بزرگ دوست ملک خورشید احمد سے پوچھا!

''ایک سودس برس'' ملک صاحب نے کہا

''آج آپ اپنی طوالت عمر کا راز بتا ہی دیں!''

''اب یہ راز بتانے کا کیا فائدہ کیونکہ اب تو گنتی کے چند سانس رہ گئے ہیں۔ آج نہیں تو کل اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔''

''چھوڑیں ملک صاحب' یہ ''لارا'' تو آپ ہمیں کب سے دے رہے ہیں آپ یہ بتائیں کہ اتنی طویل عمر کا راز کیا ہے؟''

''تو گویا میں مذاق کر رہا ہوں''

''تو پھر سن لو...... میری طوالت عمر کا راز شدید خوف کے عالم میں زندگی بسر کرنے میں ہے'' ملک صاحب نے خوف سے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب وہی جو تم سمجھے ہو۔ جب میں پیدا ہوا تو میرا وزن ساڑھے چار پاؤنڈ تھا' ڈاکٹروں نے کہا اس کا زندہ بچنا مشکل ہے۔ مگر میں نہ صرف یہ کہ بچ نکلا بلکہ مہینوں ہی میں خاصا صحت مند بھی ہو گیا۔''

''یہ تو آپ کے ہوش سے پہلے کا واقعہ ہے۔''

ہاں مگر ذہن پر اس کا اثر تو رہتا ہے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو والدہ نے گھریلو حالات سے تنگ آ کر مٹی کے تیل کی بوتل پی لی' جس سے ان کا کلیجہ چھلنی ہو گیا اور وہ میرے سامنے سسک سسک کر مر گئیں۔''

''پھر؟''

''پھر اس کے بعد تو ذہن پر خوف اس قدر سوار ہوا کہ آج تک اسی خوف کے سہارے زندہ ہوں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''میں تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا۔ میں تو تمہاری فرمائش پر کچھ حقائق بیان کر رہا ہوں یہ باہر کھڑاک کیسا ہوا ہے؟''

''آپ تو ایسے ہی ڈر جاتے ہیں کوئی بلی ولی ہو گی''

''کوئی کلاشنکوف والی بلی نہ ہو۔ ذرا ہمت کرو' اٹھ کر دیکھ ہی لو'' ملک صاحب نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

باہر کوئی بھی نہیں تھا' چنانچہ میں دوبارہ ملک صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''عین عالم شباب میں ایک اور خوف دامن گیر ہوا'' ملک صاحب نے بتایا ''عالم شباب کا یہ خوف عالم شباب ہی کے حوالے سے تھا۔ حکیموں اور سنیاسی بابوں کے اشتہاروں نے میری راتوں کی نیند اڑا دی۔''

''پھر کیا ہوا'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا ہونا تھا' بچے ہوئے' ان کی شادیاں ہوئیں''

''پھر؟''

''پھر ان بچوں کے بارے میں تفکرات شروع ہو گئے اب ان تفکرات کے سہارے زندہ ہوں' اللہ کے فضل سے کوئی نہ کوئی مسئلہ سامنے آتا ہی رہتا ہے۔''

''مگر ان تفکرات اور خوف کا طوالت عمر سے کیا تعلق ہے؟''

''اس مسئلے پر بھی بات ہوگی۔ پہلے میں تمہیں یہ تو بتالوں کہ اشیائے خورونوش میں ملاوٹ' زندگی بچانے والی جعلی ادویات' دن دہاڑے ڈکیتی کی وارداتیں' بچوں کے خرکار کیمپ' ہتھوڑا گروپ کی وارداتیں اور اس طرح کے دوسرے بے شمار خوف مجھے زندہ اور صحت مند رکھے ہوئے ہیں!''

''یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں' مختلف بیماریوں کی اخبارات اور ٹیلی ویژن کلینک میں تشہیر بھی اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔''

''وہ کیسے''

''وہ اس طرح کہ اخبارات میں شائع ہونے والے ڈاکٹروں کے کالموں اور ٹیلی ویژن کے طبی پروگراموں میں بیماری کی جو علامات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر مجھ میں پائی جاتی ہیں۔ اور یوں میں 24 گھنٹے شدید خوف میں مبتلا رہتا ہوں مثلاً کینسر کی ایک علامت یہ ہے کہ منہ میں لعاب زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دنوں میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ لعاب دہن زیادہ پیدا ہو رہا ہے اس طرح ذیابیطس میں پیشاب زیادہ آتا ہے۔ مجھے بھی دن میں کئی دفعہ باتھ روم جانا پڑتا ہے۔ دل کی تکلیف میں بازو درد کرتا ہے۔ میرا بازو بھی اکثر درد کرتا رہتا ہے۔ اخبارات میں ایڈز کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ انسان کی قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے چنانچہ نزلہ زکام کھانسی وغیرہ بھی لاحق ہو جائیں تو ٹھیک ہونے میں نہیں آتیں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ کئی مہینوں سے میری کھانسی ٹھیک نہیں ہو رہی۔ بلڈ پریشر میں چکر بہت آتے ہیں اور میرا یہ حال ہے کہ ان چکروں کی وجہ سے کئی دفعہ اپنی جگہ پر کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ میں بلڈ پریشر' ہارٹ ٹربل' ذیابیطس' کینسر اور ایڈز جیسے مہلک امراض کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں' اس خوف نے میری راتوں کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں۔''

ایڈز کے لفظ پر میں نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

''ایک خوف ان کے علاوہ بھی ہے'' ملک صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''وہ نت نئے ایٹمی ہتھیاروں اور عالمی جنگ کے حوالے سے ہے۔ اس کے علاوہ اتنی کائنات میں انسان کی حیثیت کے بارے میں جو سائنسی انکشافات ہوئے ہیں'' وہ بہت خوفزدہ کرنے والے ہیں'' اس کائنات میں ہمارے کرۂ ارض کی کوئی حیثیت نہیں انسان کی کیا حیثیت ہے اور اگر بنی نوع انسان کی کوئی حیثیت نہیں تو پھر میری ذاتی حیثیت تو زمین پر رینگنے والے ایک کیڑے سے بھی کم ہے۔ کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر حیثیت میں زندہ رہنے کا احساس بہت جان لیوا ہے۔''

مجھے اب ملک صاحب کی باتوں سے وحشت سی آنے لگی تھی چنانچہ میں نے سلسلہ کلام مختصر کرتے ہوئے کہا ''خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ ذاتی طوالت عمر اور عمدہ صحت کا راز بتائیں؟''

''تو اتنی دیر سے اور میں کیا بتا رہا ہوں'' ملک صاحب نے ناراضگی سے کہا ''میں تمہیں یہی بتا رہا ہوں کہ یہ سارے خوف مجھے زندہ اور توانا رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ان دنوں پاکستان کے بارے میں غفار خان، جی ایم سید، ولی خان اور ممتاز بھٹو وغیرہ جس طرح کے بیانات دے رہے ہیں اور ان لوگوں کے جلسوں میں پاکستان توڑنے کے جو نعرے لگ رہے ہیں، یہ سب صورت حال میرے خوف میں اضافے کا باعث بن رہی ہے۔ بلکہ ان لوگوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے محبِّ وطن قوتیں جس طرح ایک دوسرے کے لیے تیغ بے نیام بنی ہوئی ہیں، فرقہ پرست مولوی جس طرح دشمنوں کے ساتھ مل کر پاکستان سے محبت کرنے والوں کے خلاف محاذ آرا ہیں اور ایسے معاملات میں سچ کا ساتھ دینے کی بجائے میں اور تم جس طرح مصلحتاً خاموش ہیں، یہ سب چیزیں مجھے اندر سے شدید بے چین رکھتی ہیں چنانچہ میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں اپنے ملک کے بارے میں اور بنی نوع انسان کے مستقبل کے بارے میں سخت متفکر ہوں لیکن میرے عزیز یہی خوف مجھے میرے ملک کو اور

بنی نوع انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''مگر وہ کیسے؟''میں نے اس دفعہ چڑ کر سخت جھنجھلاہٹ کے عالم میں کہا۔

''وہ ایسے کہ خوف کمزور سے کمزور اور بزدل سے بزدل انسان کو بھی خطرات کے مقابلے کے لیے تیار کرتا ہے۔'' ملک صاحب نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا''یا کم ازکم اس میں تیار کرنے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے جسے استعمال میں لا کر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔''

''اور اپنے کان ادھر لاؤ ملک صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کپکپاتی آواز میں کہا'' میں تمہیں آخر میں ایک راز کی بات بتاتا ہوں ...... یہ جو بلی ہے نا ...... یہ سنسان اور ویران جنگلوں میں بالکل اکیلی رہا کرتی تھی ایک روز یہ جنگل کی ویرانیوں اور ہولناک سناٹوں سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ مارے خوف کے شیر بن گئی۔''

میں ملک صاحب کی بات سے متاثر ہوا مگر میں نے پوچھا اور یہ جو بلیاں شہروں میں چوہوں کا شکار کرتی اور انسانوں کے پاؤں چاٹتی نظر آتی ہیں' یہ کون ہیں؟''

''یہ وہ بلیاں ہیں جو جنگل کی ہولناک سفاکیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے شہروں میں آگئیں اور یوں پر خطرات زندگی کے ثمر سے محروم ہوگئیں چنانچہ شیر بننے کی بجائے یہ شہروں میں چوہوں کا شکار کرتی ہیں اور انسان کے پاؤں چاٹتی ہیں۔ میرے عزیز! یہ بھگوڑی بلیاں ہیں جو مارے خوف کے شیر بن سکتی تھیں مگر پر سکون زندگی کی خواہش نے انہیں پاؤں چاٹنے والی مخلوق بنا دیا!۔''

# بیمارِ محبت

ان دنوں ہمارے ایک دوست تازہ تازہ اسیر محبت ہوئے ہیں' گزشتہ روز صبح صبح ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے ''میں شدید طور پر محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں' مجھے نصیحت کرو'' ہم نے جواب میں انہیں یہ شعر سنایا ؎

میں آج بھی بھولا نہیں آداب جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

کہنے لگے ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی' یہ تو تم الٹا مجھے ''اُ کسا'' دے رہے ہو''

ہم نے کہا ''چلو تم یہی سمجھ لو' مگر تم اچھے عاشق ہو کہ چارہ ساز اور غم گسار ڈھونڈنے کی بجائے ناصح تلاش کر رہے ہو۔''

بولے ''تم نے کبھی محبت کی ہے؟''

ہم نے کہا لاحول ولاقوۃ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کا سوال ہے۔''

ہمارا یہ جواب سن کر ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور کہنے لگے ''تمہیں استاد اور کالم نگار ہونے کی بجائے ڈپلومیٹ ہونا چاہئے تھا۔''

ہم نے عاشق زار کی اس ڈپلومیٹک تعریف کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''تمہاری مہربانی ہے مگر یہ بتاؤ کہ تمہیں نصیحت کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

کہنے لگے ''میں ایک دنیادار آدمی ہوں اور دنیادار ہی رہنا چاہتا ہوں مگر محبت نے سود و زیاں سے غافل کر دیا ہے۔''

ہم نے کہا ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

بولے ''خاک اچھی بات ہے' تم پوری بات تو سن لو۔''

ہم نے کہا ''سناؤ اور دل کھول کر سناؤ میں ہمہ تن گوش ہوں میں گفتگو کے دوران مداخلت نہیں کروں گا۔''

یہ سن کر ان کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار نمایاں ہوئے اور کہنے لگے ''میں اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھنے لگا ہوں میرا مذاق نہ اڑانا' بات یہ ہے کہ اب میرا کسی کام میں دل نہیں لگتا شام کو سیلز مین دن بھر کی آمدنی کا حساب دیتا ہے تو میرا دھیان اس حساب کتاب کی طرف نہیں ہوتا۔ سیلز مین کو میری عدم دلچسپی کا اندازہ ہو گیا ہے چنانچہ مجھے خدشہ ہے کہ وہ گڑبڑ کر رہا ہے یا گڑبڑ کرے گا۔''

ہم نے کہا ''یہ تو بہت بری بات ہے' کاروبار تباہ ہوا تو محبوب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے' تم نے میر تقی میر کا یہ شعر نہیں سنا ۔

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

یہ شعر سن کر ہمارے دوست نے خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہا ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں میر کے محبوب کی بات نہیں کر رہا۔''

اس پر ہم نے پوچھا ''تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟''

بولے ''میں عاشق ہوں پاگل نہیں کہ تمہیں اس کا نام اور پتہ بتاؤں۔''

ہم نے کہا ''چلو دفعہ کرو' تم اپنی کیفیات بتا رہے تھے!''

بولے ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرا جی اب کسی کام میں نہیں لگتا صرف یہی نہیں بلکہ نیم دیوانگی کی کیفیت میں ہوں' سارا سارا دن اور ساری ساری رات محبوب ہی کے دھیان میں گزرتی ہے۔ اسی کو سوچتا رہتا ہوں اس کی عدم موجودگی میں اسی سے باتیں کرتا

رہتا ہوں' بس ہر وقت گم سم سا رہتا ہوں اور یوں دنیا کی تمام نعمتوں سے محروم ہو گیا ہوں"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دوست جن کے ساتھ گھنٹوں گپ بازی کی محفلیں ہوتی تھیں اب میں ان محفلوں میں اجنبیوں کی طرح بیٹھا ہوتا ہوں' اپنی دلی کیفیت چھپانے کے لیے ہنستا ہوں' حالانکہ مجھے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس بات پر ہنس رہے ہیں' چنانچہ کئی دفعہ تو کسی غلط موقع پر ہنس بیٹھتا ہوں جس پر بہت لعن طعن ہوتی ہے تمہیں پتہ ہے مجھے اچھے کپڑے پہننے کا بھی شوق تھا لیکن اب یہ صورتحال ہے کہ محبوب سامنے ہو تو کچھ پہننے کو جی نہیں چاہتا"

"کچھ نہ کچھ بہر حال پہن لینا چاہئے کہ کوئی آ ہی نہ جائے!"

اس پر ہمارے یہ دوست ایک بار پھر ناراض ہوئے' مگر تھوڑی ہی دیر بعد پھر نارمل ہو گئے "اور تمہیں پتہ ہے کہ میری جمالیاتی حس کی بڑی دھو میں ہوتی تھیں مگر اب صورت حال یہ ہے کہ میری آنکھوں کو کوئی جچتا ہی نہیں ہے۔"

"یہ بھی اچھی بات ہے ورنہ اپنی جمالیاتی حس کی بدولت ایک روز تم نے حدود آرڈیننس کے تحت پکڑے جانا تھا۔"

"میں نے تمہیں شروع میں ہی کہا تھا کہ میرا مذاق نہ اڑانا' خیر تمہیں ان جذبوں کا کیا پتہ' میں کہہ رہا تھا کہ کسی ایک کا ہو کر رہنے سے مجھے وحشت سی ہونے لگی ہے کیونکہ لگتا ہے میں اندھا اور بہرہ ہو گیا ہوں اب یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو واقعی اچھی بات نہیں کہ انسان اندھا اور بہرا ہو کر رہ جائے۔"

"لیکن اصل بات جس کے لیے میں آج تمہارے پاس آیا ہوں' وہ یہ کہ تم شاعر لوگ محبت میں گرفتار لوگوں کے لیے "بیمار محبت" کا لفظ استعمال کرتے آئے ہو اور مجھے یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ محبت تو ایک لطیف جذبہ ہے' یہ تو انسان کو خوشیاں دیتا ہے تو پھر اردو شاعری میں عاشقوں کو بیمار محبت کیوں کہا جاتا ہے' اب خود عشق کیا ہے' تو بات سمجھ میں آئی ہے' کیونکہ میں اس دن سے خود بیمار رہنے لگا ہوں۔"

''لاحول ولاقوۃ ''بیمار محبت'' کا مطلب سچ مچ بیمار ہونا نہیں ہے''

''بیمار محبت'' کا سو فیصد مطلب یہی ہے جو میں نے تم کو بتایا ہے کیونکہ کسی عاشق کے صحت مند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔طبی اصولوں کے مطابق کھانا پوری یکسوئی کے ساتھ نہ کھایا جائے تو وہ ہضم نہیں ہوتا اور اگر کھانا ہضم نہ ہو تو اس سے انسان کا پورا جسم متاثر ہوتا ہے۔جبکہ عاشق کھانا کھاتے ہوئے بھی اپنے محبوب کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے جس سے اس کا نظام ہضم اپ سیٹ ہو جاتا ہے اور یوں اسے گونا گوں عوارض لاحق ہو جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عاشقوں کو ''بیمار محبت کہا جاتا ہے۔''

ہم ابھی تک اپنے دوست کی باتیں سنتے ہوئے حتی المقدور جملے بازی سے گریز کر رہے تھے کہ کہیں اس کی دل آزاری نہ ہو' مگر اس مقام پر پہنچ کر ہماری ہنسی چھوٹ گئی اور ہم نے کہا ''تم عشق کے نہیں مالی خولیا کے مریض لگتے ہو۔''

ہمارا خیال تھا کہ اس پر موصوف ہمارا سر توڑ دیں گے' مگر ہمارا یہ جملہ سن کر وہ اچھل پڑے اور بولے ''ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ مالی خولیا اس کے علاوہ ہے کیونکہ مستقل ایک ہی خیال میں مگن رہنے سے ذہن انسانی متوازن نہیں رہتا اور یوں عاشق میں مالی خولیا کے آثار بھی پیدا ہو جاتے ہیں! بلکہ آج میں ان خدشوں اور وسوسوں کی بنا پر بھی تمہارے پاس آیا تھا کہ تم مجھے اس سلسلے میں کوئی نصیحت کرو تا کہ میں محبت کے آزار سے نکل جاؤں!؟''

تب ہم نے اپنے اس عاشق دوست کو ہمدردی کی نظروں سے دیکھا اور کہا ''محبت بری چیز نہیں' بہت اچھی بلکہ نہایت فائدہ مند چیز ہے اس سے انسان کمزور نہیں بلکہ ہٹا کٹا ہو جاتا ہے' نیز یہ کہ محبت سے ذہنی عوارض پیدا نہیں ہوتے بلکہ اس سے ذہن کو جلا ملتی ہے اور انسان جوڑ توڑ اور گٹھ جوڑ کے ضمن میں پہلے سے بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم اپنے رہنماؤں پر نظر ڈالو ماشاءاللہ نوے نوے سال کی عمر میں

لمبے سفر کرتے ہیں گٹھ جوڑ کرتے ہیں' حالانکہ یہ بھی ہر وقت ایک ہی خیال میں مگن رہتے ہیں مگر ان کا نظام ہضم اتنا پرفیکٹ ہے کہ آدھا ملک ہضم کر گئے ہیں اور باقی ماندہ پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ رہنماؤں میں سے ایک آدھ کی صحت بہتر نہیں باقی تو ماشاءاللہ ریسلنگ چیمپئن شپ کے مقابلے میں بھیجے جاسکتے ہیں سو میرے عزیز اگر تم نے محبت کرنا ہی ہے تو کسی انسان سے نہ کرو' اپنے مفادات سے کرو' اقتدار سے کرو اور پھر دیکھو تمہاری ناتوانی کس طرح طاقت میں بدلتی ہے اور ہاں اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے پورے جثے سمیت خود کو باآسانی ''بیمار محبت'' بھی کہلا سکتا ہے اور صرف کہلا ہی نہیں سکتا' اسے ''بیمار محبت'' ماننے والے بھی پیدا ہو جاتے ہیں!''

# کانا عاشق

گزشتہ روز ہماری ملاقات ایک عاشق زار سے ہوئی۔ جو بیک وقت دو محبوبوں کا ذکر کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ جیب سے کنگھی نکال کر بال سنوارتا جاتا تھا۔ ان ہر دو محبوبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس پر رقت طاری ہوجاتی تھی اور پھر وہ (BRUT) میں ڈوبے ہوئے رومال سے آنکھوں کو تھپتھپانے کے بعد ٹائی کی ناٹ درست کرنے لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں اور جوتے آئینے کی طرح صاف شفاف تھے۔ ہم نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو کہا:

''اے برادر! اگر تیرا عشق صادق ہے تو پھر تیرا حال عاشقوں جیسا کیوں نہیں؟''

اس نے رومال سے پسینہ پونچھنے کے بعد بغلوں میں (Deodrant) سپرے کرتے ہوئے پوچھا:

''کیا مطلب؟''

ہم نے کہا:

یہی کہ کسی ایک سے دل لگا۔ اس کے بعد شیو بڑھا۔ گریباں چاک کر اور سر پر خاک ڈال کر جنگلوں کی طرف نکل جا۔''

یہ سن کر اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا:

''اے برادر یوسف! تو صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ میں تیرے حق میں ان سے دستبردار ہوجاؤں؟''

ہم نے اس شکی مزاج عاشق کو تاسف کی نظروں سے دیکھا اور اسے ملامت کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کے ذہن میں ایسی گھٹیا بات کیونکر آئی اور پھر اس نے اس قدر بدگمانی سے کیونکر کام لیا کہا گر وہ ایسا کر گزرے تو ہم نیکی کا بدلہ نیکی سے ادا نہیں کریں گے؟

جس پر یہ شخص مذکور ہنسا۔ وان ہاؤزن شرٹ کے کالر پر سے گرد جھاڑی اور پھر بولا:

''نہ میں نے کوئی گھٹیا بات کہی ہے اور نہ کسی بدگمانی سے کام لیا ہے۔ اگر میں تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شیو بڑھا لوں۔ گریباں چاک کر بیٹھوں اور جنگلوں کی طرف نکل جاؤں تو ہفتے عشرے بعد تم ہر دو کے بارے میں اخباروں میں یہ خبر پڑھو گے کہ ''بے وفا محبوبہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی اور عاشق غل غپاڑہ کرتے ہوئے پکڑا گیا۔''

جب ہم نے اس دیوانے کے منہ سے یہ فرزانوں والی بات سنی تو جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا:

''مرشد! دنیا بھر کے عاشقوں کے لیے کوئی پیغام دیتے جاؤ۔''

اس پر اس نے ہمیں شفقت سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا:

''عاشقوں کے لیے میرا پیغام یہی ہے کہ وہ دوران محبت صرف ایک آنکھ بند رکھیں اور دوسری بہر صورت کھلی رہنے دیں۔ نیز وہ ایک متبادل محبوب کا بندوبست بھی ضرور کریں۔ جس نے دونوں آنکھیں بند کیں یا کسی ایک کا ہو کر رہ گیا وہ ہمیشہ خون کے آنسو رویا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی سپورٹس ماڈل کار سٹارٹ کی اور فل ایکسی لیٹر دیتے ہوئے ایک کوچہء جاناں کو ہو لیا۔

اس ہوش مند عاشق کے جانے کے بعد ہم نے اس کی باتوں پر غور کیا تو ان

کی صداقت کچھ اور واضح ہوئی ۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے اردگرد جتنے بھی کامیاب عاشق ہیں ۔ یہ وہی ہیں ۔ جنہوں نے اپنی ایک آنکھ کھلی رکھی ہوئی ہے ۔ اور ایک متبادل محبوب کا بندوبست بھی کیا ہوا ہے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست ہیں ۔ جو انقلاب کے عشق میں ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ پتہ بھی کھڑکتا ہے تو ان کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہیں کہ شاید وہ آگئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس عشق میں اپنی دونوں آنکھیں بند نہیں ہونے دیں۔ بلکہ ایک کھلی رکھی ہے۔ جو ہر وقت ریڈیو ٹی وی پروگراموں پر لگی رہتی ہیں۔

ایک مولانا سے ہماری یاد اللہ ہے۔ دیندار بھی ان کے پاؤں چومتے ہیں اور ہم ایسے دنیا کے کتے بھی ان کے در پر جانے کے لیے مجبور ہیں ۔ کیونکہ ان کی خدا اور خداوند دونوں تک رسائی ہے۔ ایک ایسے مخیّر سرمایہ دار کو بھی ہم جانتے ہیں جس کا ایک ہاتھ ہمہ وقت سخاوت کرنے اور دوسرا ہاتھ ہمہ وقت یہ سخاوت واپس لینے میں لگا رہتا ہے۔ ایک ایسا حریت پسند ہماری نظروں میں ہے۔ جو گفتگو حکومت وقت کے خلاف کرتا ہے اور لکھتا اس کے حق میں ہے۔ ایک بزرگ شاعر کو ہم نے یہ کہتے سنا ہے کہ 1965ء کی جنگ میں انہوں نے جو ترانے لکھے وہ اس نوع کے تھے کہ پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی مقبول ہوئے۔ حزب اختلاف سے متعلق بعض لوگ حزب اقتدار کے دلوں میں اور بلوں میں بھی جگہ اور حصہ رکھتے ہیں ۔ اور پھر ان کے علاوہ ہمارے اردگرد پھیلتے ہوئے کامیاب عاشقوں میں وکیلوں کا گروہ شامل ہے۔ جو قاتل اور مقتول دونوں کا مقدمہ بڑی کامیابی سے لڑتا ہے۔ استاد ہیں جو فرعون پر لعنت بھیجتے ہیں اور کالجوں میں موسیٰ کی پیدائش روکنے کا فریضہ بھی پوری دیانت داری سے انجام دیتے ہیں۔ کچھ علما ہیں جو حسین کا اسوہ بیان کرتے ہیں اور ہر دور میں یزید کی صفوں میں بھی نظر آتے ہیں بعض لیبر لیڈر ہیں جو لیبر افسر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں اور کچھ صحافی ہیں جو اپنے اخبار اور اپنے ''محکمے'' کے لیے بیک وقت رپورٹنگ بھی کرتے ہیں۔

ان سب عاشقوں نے متبادل محبوب کا انتظام کیا ہوا ہے۔ یہ ایک آنکھ کھلی رکھنے والے عاشق ہیں۔ یہ کانے عاشق ہیں۔

# الہ دین کے جن کا زوال

الہ دین کا چراغ نسل در نسل ہوتا ہوا جب الہ دین ہفتم کے ہاتھ آیا (جو ایک سیدھا سادہ انسان تھا) تو اس نے باپ کی وفات کے اگلے ہی روز چراغ زمین پر رگڑا جس سے فضا میں دھواں پھیل گیا اور پھر اس دھوئیں میں سے ان کا خاندانی جن خوفناک قہقہے لگاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے بازو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے تھے اور قد آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

جب یہ دھواں چھٹا اور اس قوی ہیکل جن کی دہلا دینے والی آواز فضا میں گونجی:

"کیا حکم ہے میرے آقا؟"

الہ دین ہفتم نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کہا:

"ذرا دوڑ کر نکڑ والی دکان سے میرے لیے ایک سانچی پان لاؤ"۔

جن کو اپنے نئے باس کے اس حکم کی تعمیل میں بڑی شرم محسوس ہوئی مگر اس نے تعمل کی اور دوبارہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

الہ دین نے اسے حکم کا منتظر پایا تو کہا:

"میں نہانا چاہتا ہوں۔ بالٹی اٹھاؤ اور سرکاری نلکے سے پانی بھر کر اسے صحن میں رکھ دو"۔

جن کو اگرچہ ایک بار پھر بڑی سبکی محسوس ہوئی مگر اس نے "جو حکم میرے آقا" کہا اور غائب ہو گیا۔

نہانے سے فراغت پا کر الہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی، فضا دھوئیں سے بھر گئی اور پھر خوف ناک قہقہے لگاتا ہوا جن نمودار ہوا۔

اس نے جھک کر کہا:

"کیا حکم ہے میرے آقا؟"

الہ دین نے کہا:

"بازار سے سبزی وغیرہ لے کر آؤ اور میرے لیے جلدی سے کھانا تیار کرو۔ بڑی بھوک لگی ہے!"

یہ سن کر جن بہت شرمسار ہوا اور گردن جھکا کر بازار کی طرف چل پڑا۔

کھانا وغیرہ کھا کر الہ دین نے ایک بار پھر چراغ رگڑا جس پر جن ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا نمودار ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ الہ دین نے حکم دیا کہ:

"ہمسایوں سے تھوڑی سی پتی مانگ کر لاؤ اور چائے بناؤ"۔

یہ سن کر پسینے کے قطرے جن کی پیشانی پر نمودار ہوئے جو اس نے فوراً ہاتھ سے پونچھ ڈالے اور بادل نخواستہ حکم کی تعمیل میں مشغول ہو گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ دن، مہینے اور سال گزرتے گئے اور وہ اپنے آقا کی خدمت میں اسی طرح مشغول رہا۔ اس کے کپڑے دھوتا۔ استری کرتا۔ جوتے پالش کرتا۔ برتن مانجھتا اور نکڑ کی دکان سے اس کے لیے پان اور سگریٹ خرید کر لاتا اور پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

اس دوران جن میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی جسامت پہلے سے بہت کم ہو گئی اس کا قد بھی گھٹتا چلا گیا اور اس کے قہقہوں کی گونج بھی مدھم پڑ گئی۔ ایک اور تبدیلی اس میں یہ رونما ہوئی کہ الہ دین کے چراغ رگڑنے پر وہ کاندھے پر رومال رکھے نمودار ہوتا اور "کیا حکم ہے میرے آقا؟" کی بجائے "کیا حکم ہے صاحب جی؟" کہتا۔ یہ

جن آہستہ آہستہ اپنی پہچان بھولتا جارہا تھا۔

سوالہ دین کے اس جن کی نقاہت اب روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ اس کا قد گھٹتے گھٹتے اپنے آقا کے قد کے برابر ہوگیا۔اس کے بازو اب مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے نہیں تھے بلکہ وہ سکڑ کر اپنے آقا جتنا ہی رہ گیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کی کمر میں درد ہونے لگا اور پٹھے بھی درد کرنے لگے جس کے لیے وہ باقاعدگی سے ''سریکس ٹی'' کھانے لگا تاہم وہ اب بھی اپنے ''صاحب جی'' کی خدمت میں ہمہ تن مشغول رہتا۔

اس دوران الہ دین کو اپنے محلّے کی ایک لڑکی سے عشق ہوگیا مگر سخت نگرانی کی وجہ سے اس کے ساتھ نامہ و پیام کا موقع نہیں ملتا تھا۔ایک روز الہ دین نے چراغ رگڑا، ایک معمولی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر دھوئیں میں سے مدقوق چہرے والا جن نمودار ہوا۔

الہ دین نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا:

''یہ رقعہ بلبلہ کو دے آؤ۔''

جن کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ابھرے اور اس نے کہا:

''صاحب جی! میں جن ہوں کوئی......''

مگر الہ دین نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی دس کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیا۔جن کی ''سریکس ٹی'' کی شیشی ختم ہونے والی تھی سو اس نے یہ نوٹ جیب میں ڈالا اور جھینپتے جھینپتے وہ رقعہ بلبلہ تک پہنچا آیا بلکہ اس کی موثر کارکردگی کو دیکھ کر محلے کے دوسرے نوجوان بھی اب اس سے یہ خدمت لینے لگے۔شروع شروع میں اسے اس کام سے ندامت محسوس ہوتی تھی مگر پھر یہ اس کی عادت بن گئی۔اس دوران وہ خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگا۔اب وہ پہلے سے کرّ وفر والا جن نہیں تھا بلکہ وہ اپنی شناخت بھول گیا تھا سو اُب اسے بلانے کے لے چراغ رگڑنے کی ضرورت نہ تھی۔وہ کاندھے پر رومال رکھے، دھوتی اور بنیان پہنے ایسے ہی سب کی نظروں کے سامنے پڑا رہتا۔اس کا قد الہ دین کے قد

سے بھی چھوٹا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اب الہ دین نے اسے بلانا ہوتا تو وہ اسے ''اوئے چھوٹے! ادھر آؤ'' کہہ کر آواز دیتا۔

ایک دن اس نے الہ دین سے کہا:

''صاحب جی! اگر اجازت دیں تو میں کہیں اور کام تلاش کرلوں۔ آپ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس میں آپ کا اپنا گزارہ بھی نہیں ہوتا۔''

الہ دین یہ سن کر جھینپ گیا اور پھر اس نے رضامندی کے اظہار کے لیے ہولے سے اپنی گردن ہلا دی!

سو یہ جن آجکل بابو ہوٹل میں ملازم ہے اور ''چھوٹے اوئے'' کی آواز سن کر تھکے تھکے قدموں کے ساتھ ایک میز سے دوسری میز کی طرف جاتا ہے۔ کبھی کبھی اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے تو اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے بازو اور آسمان سے باتیں کرتا ہوا قد! بڑے بڑے بادشاہوں کے محلات کو اپنی ہتھیلی پر اٹھا لینے والا ماضی! چشم زدن میں نئی دنیائیں تعمیر کرنے والا ماضی! چنانچہ ان لمحوں میں وہ دوبارہ جن کے روپ میں آنے کے لیے اپنی تمام قوتیں جمع کرتا ہے۔

مگر۔

اپنی اس تمامتر کوشش کے نتیجے میں وہ سگریٹ کے دھوئیں جتنے مرغولے میں سے اپنی دکھتی کمر پر ہاتھ رکھے نمودار ہوتا ہے۔ اس پر وہ مارے ندامت کے سر جھکا لیتا ہے اور ہولے سے کہتا ہے:

''میں بڑے کرّ وفر والا جن تھا مگر میرے آقاؤں نے مجھے کمزور کر دیا۔''

اور پھر ایک دم خوفزدہ ہو کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے کہ کہیں کسی نے یہ سن تو نہیں لیا کہ وہ کبھی بڑے کرّ وفر والا جن تھا!

❖❖❖

# اَب اور تب

میں نے یاسر سے کہا:

''بیٹے! تمہیں معلوم ہے جب ہم چھوٹے تھے اور وزیر آباد میں رہتے تھے تو ہمارے ہاں بجلی نہیں ہوتی تھی؟ ہم لالٹین جلا کر پڑھا کرتے تھے؟''

''اچھا! آٹھ سالہ یاسر نے حیرت سے کہا۔ ''مگر ابو! یہ لالٹین کیا ہوتی ہے؟''

''بیٹے! یہ کبھی ہوتی تھی۔ اِن دنوں بڑے شہروں میں نہیں، قصبوں اور دیہات میں ہوتی ہے۔ تم اس کا ذکر چھوڑو، میں تمہیں ایک بات بتاؤں اس زمانے میں ٹیلیوژن بھی نہیں ہوتا تھا۔''

''اچھا! تو آپ شام کو کیا کِیا کرتے تھے!!''

''بہن بھائی آپس میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ کھیلا کرتے تھے۔ لڑا کرتے تھے اور سنو! اس زمانے میں ہمارے گھر میں ٹیلی فون بھی نہیں تھا اور ہاں ___ ان دنوں یہ ٹھنڈے اور گرم پانی کے نلکے بھی نہیں تھے بلکہ گھروں میں ہینڈ پمپ ہوتا تھا۔ ہم ہاتھ سے پمپ گیڑ کر بالٹی میں پانی جمع کرتے تھے اور پھر اس سے نہاتے تھے!''

''ابو! یہ ہینڈ پمپ کیا ہوتا ہے؟''

''یہ بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ آجکل بھی بہت سے گھروں میں ہے تمہیں کسی روز دکھاؤں گا۔''

''ابو! اس زمانے میں اور کیا کیا نہیں ہوتا تھا؟''

"بیٹے! یہ فلش سسٹم نہیں ہوتا تھا۔ ایئر کنڈیشنر بھی نہیں تھا۔ سیلنگ فین پیڈسٹل فین بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان کی جگہ لوگوں نے چھتوں کے ساتھ کپڑے کے پنکھے لٹکائے ہوتے تھے جنہیں رسی کے ساتھ کھینچا جاتا تھا اور ہاں یہ ریفریجریٹر بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہم گھڑے کا پانی پیا کرتے تھے جس پر گرمیوں میں موتیے کے ہار پڑے ہوتے تھے۔"

میرا خیال تھا کہ اب وہ پوچھے گا کہ یہ گھڑا کیا ہوتا ہے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ سب کچھ سن کر پریشان سا ہو گیا۔ تاہم تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور اس نے اپنے ننھے منے ہاتھ جوڑ کر کہا:

"شکر ہے اس زمانے میں میں پیدا نہیں ہوا تھا!"

لیکن ایئر کنڈیشنر، بجلی کے قمقمے، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈر، وی سی آر، ٹیلی فون ٹیلی وژن اور اس طرح کی دیگر بے شمار سائنسی ایجادات اپنے ساتھ صرف آسائشیں ہی نہیں، آہستہ آہستہ ایک نیا اخلاق اور معاشرتی نظام بھی لائی ہیں ___ سوان لمحوں میں میں نے سوچا کہ کوئی پتہ نہیں آج سے سو پچاس سال بعد اس سرزمین پر کسی "یاسر" کی اپنے کسی "ڈیڈ" کے ساتھ کچھ اس قسم کی گفتگو ہو رہی ہو:

"بیٹے! ہمارے زمانے میں لڑکے لڑکیاں یوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سڑکوں پر نہیں پھرا کرتے تھے اور یوں کھلے بندوں "لپ سروس" (lip servic) کا مظاہرہ بھی نہیں ہوتا تھا۔"

"تو آپ لوگ کیا کیا کرتے تھے؟"

"بیٹے! ہمارے زمانے میں ملاقاتیں سیڑھیوں میں ہوا کرتی تھیں یا ہوٹلوں کے کیبنوں میں یا یونیورسٹی لائبریری میں۔ ہم جب باہر ملتے تھے تو ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں تھے اور پھر ہمارے زمانے میں بوائے فرینڈ یا گرل فرینڈ نہیں صرف "کزن" ہوا کرتے تھے اور یہ جو "لپ سروس" ہے ہمارے زمانے میں سرعام نہیں ہوتی تھی۔ سرعام تو اس کا مفہوم صرف "بول بچن" کا تھا۔ اس بول بچن کے ذریعے لوگ بڑے بڑے کام

نکالتے تھے!''

''ڈیڈ! آپ کے زمانے میں تو پھر بلُو فلموں والے سینما بھی نہیں ہوتے ہوں گے جس میں لڑکے اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ فلم دیکھنے آتے ہوں گے؟''

''نہیں بیٹے! کچھ سینما ایسے تھے مگر یہ در پردہ انتظامیہ سے چھپ کر یہ کام کرتے تھے وہ آٹھ روپے کا ٹکٹ بیس روپے میں بیچتے تھے۔ پہلا آدھ پون گھنٹہ وہ سنسر بورڈ سے منظور شدہ اصل فلم دکھاتے جس کا اشتہار اخباروں میں شائع ہوا ہوتا۔ اس کے بعد وہ اندر سے دروازے اور باہر کا گیٹ بند کر کے صرف پانچ منٹ کے لیے ان بلُو فلموں کے ٹوٹے دکھاتے اور پھر قومی پرچم لہرا کر شو کے ختم ہونے کا اعلان کر دیتے تھے مگر ان سینماؤں میں صرف مرد آیا کرتے تھے اور یا پھر جن لوگوں کے پاس وی سی آر ہوتا وہ کسی گھر میں فلم شو کا اہتمام کرتے اور وہاں سبھی شائقین جمع ہو جاتے تھے!''

''ڈیڈ! یہ فیملی سسٹم کیا ہوتا ہے؟''

''بیٹے! یہ بھی ہوتا تھا۔ اس میں ایک باپ ہوتا تھا۔ ایک ماں ہوتی تھی۔ ان کے بچے ہوتے تھے اور یہ سب مل کر ایک گھر میں رہتے تھے۔ اس فیملی سسٹم میں خالہ، پھوپھی چچا اور دیگر رشتے دار بھی آتے تھے۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے سے جھگڑتے بھی تھے مگر اس کے باوجود ان کی خوشیاں اور دکھ سانجھے ہوتے تھے۔ کنبے کا سربراہ اس خاندان کا بزرگ ہوتا تھا اور سب اس کا احترام کرتے تھے۔''

''ڈیڈ! آپ کے زمانے میں اولڈ پیپلز ہوم ہوتے تھے؟''

''نہیں بیٹے!''

''تو پھر آپ لوگ بوڑھوں کو کہاں جمع کراتے تھے؟''

''ہم میں سے جو بوڑھے ہو جاتے تھے ہم انہیں اپنے گھروں میں ہی رکھتے تھے۔ ان کی بہت دیکھ بھال کرتے تھے اور ان کی دعائیں لیتے تھے۔''

ڈیڈ''یہ دُعائیں کیا ہوتی ہیں''؟

'' بیٹے !یہ بھی کبھی ہوا کرتی تھیں۔خیر چھوڑو!میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں ہمارے زمانے میں طلاقیں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔بچے اپنے گھروں میں پلتے تھےاوران کے ابّو اور امّی انہیں بہت پیار کرتے تھے۔جن بچوں کو ہوٹلوں،سائیکلوں کی دکانوں ، قالینوں کے کارخانوں اور ورکشاپوں وغیرہ میں کام کرنا پڑتا تھا،ان کے والدین اندر ہی اندرخون کے آنسوروتے تھے!''

''اس کا مطلب یہ ہوا ڈیڈ کہ آپ کے زمانے میں لڑکیاں اورلڑکے اپنے دوستوں کے ساتھ علیحدہ فلیٹس میں نہیں رہتے تھے؟''

'' بیٹے ! میں نے تمہیں بتایا نا کہ ہمارے زمانے میں ایسانہیں ہوتا تھا۔لڑکیاں شام کے بعد بغیر ضرورت کے گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں اورلڑکے بھی اگر ذرا لیٹ ہو جاتے تو والدین پریشان ہوجاتے تھے۔''

''تو ڈیڈ! گویا آپ لوگوں کے ہاں فرد کی آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔آپ کو بڈھوں کے چونچلے برداشت کرنا پڑتے تھے،شادی کے بعد مرد کو ساری عمر ایک عورت اور ایک عورت کو ساری عمر ایک مرد کے ساتھ گزارنا پڑتی تھی۔کنبے کا سربراہ گاڈفادر ہوتا تھا جو ہرایک پرحکم چلاتا تھا؟''

''نہیں بیٹے !ایسانہیں تھا،تم اس سوسائٹی کو___ ''

مگر وہ''یاسر'' اپنے''ڈیڈ'' کوٹوک دیتا ہے اور سینے پر کراس کا نشان بناتے ہوئے کہتا ہے___ ''اوہ جیزز! شکر ہے میں اس زمانے میں پیدا نہیں ہوا تھا!''

❖❖❖

# گھوڑوں کے شہر میں!

پنڈی سے لاہور جانے والی ریل کار میں کھڑکی کی جانب اپنی سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو ماحول خاصا خوش گوار نظر آیا۔ دراصل خوشحالی آہستہ آہستہ چہروں کا جغرافیہ بھی بدل دیتی ہے وِنگے چِبّے چہرے اپنے آپ پدرے ہو جاتے ہیں اور پھر خوشنما لگنے لگتے ہیں۔ سو یہاں بھی چہروں کی نمائش لگی تھی مگر میری نظریں اپنی برابر والی سیٹ پر جمی تھیں کہ یہ سیٹ تا حال خالی تھی۔ میرے لیے انتظار کا مرحلہ سخت جانگسل تھا کہ اس نشت کے "مکین" سے میرا مستقبل وابستہ تھا۔ بور ہمسفر کے ساتھ زندگی کا پوارا سفر تو طے ہوسکتا ہے کہ اس صورت میں انسان کو بالآخر صبر آجاتا ہے لیکن ایسے ہمسفر کے ساتھ چھ گھنٹے گزارنا خاصے دل گردے کا کام ہے کیونکہ ان چھ گھنٹوں کے دوران چھبیس دفعہ گھڑی دیکھنا پڑتی ہے۔

میری "قسمت" کا فیصلہ ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے کیونکہ گاڑی کی روانگی کا وقت قریب تھا۔ میرے برابر والی نشست خالی تھی میرے مقدر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

قدرت نے میرے مقدر کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ گاڑی سٹیشن سے سرکنا شروع ہوئی تو میری برابر والی سیٹ کے پائدان پر کسی نے بوری سے سلا ہوا خاکی رنگ کا ایک تھیلا لا کر رکھ دیا اور بعد ازاں وہ خود اس سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

یہی میرا ہمسفر تھا۔

اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر سفید کترویں ڈاڑھی، گال

قدرے پچکے ہوئے، ناک کی ہڈی ابھری ہوئی اور استری سے بے نیاز قمیض اور پتلون میں ملبوس۔ موصوف ڈاک خانے میں ملازم لگتے تھے ___ اور لگتا تھا کہ ڈاک کا کوئی خصوصی تھیلا لاہور میں پہنچانے پر مامور ہوئے ہیں۔

میں نے اردگرد پھیلے ہوئے خوش نما چہروں پر نظر ڈالی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے!

"میں نے گھر سے نکلتے وقت دعا مانگی تھی کہ مجھے اچھا ہمسفر نصیب ہو۔" موصوف مجھے مخاطب کر کے انگریزی میں ممیا رہے تھے۔

"بزرگو! دعا تو میں نے بھی یہی مانگی تھی!" میں نے دل ہی دل میں کہا اور پھر خیر سگالی کے اظہار کے لیے اپنے دانت نکال دیے۔ ان لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ میں ایشیا کا ممتاز ترین منافق ہوں!

اس ایک مسکراہٹ کے بعد میں نے اپنا سر سیٹ کے ساتھ ٹکا دیا تھا اور ان کی قربت سے گوش دل کو غافل کر دیا تھا مگر میرے کانوں کو ان کی ممیا بدستور سنائی دے رہی تھی۔ موصوف بڑی چابکدستی کے ساتھ انگریزی پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو کو قدرے غور سے سنا تو اندازہ ہوا وہ اردو کی بجائے انگریزی کو ذریعہ اظہار بنانے پر معذرت کر رہے ہیں اور اس کی کچھ وجوہات بھی بیان فرما رہے ہیں۔

میں نے مروّت، وضعداری اور اخلاق کے اعلیٰ اصولوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے اپنا چہرہ ایک بار پھر ان کی طرف کر لیا اور ان کی مسلسل گفتگو کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اثبات میں سر ہلانے لگا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں جناب کی گفتگو پوری توجہ کے ساتھ سن رہا ہوں، حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ موصوف کیا فرما رہے ہیں؟ کیونکہ میں سرے سے ان کی گفتگو نہیں سن رہا تھا۔ میں تو اس دوران اس ذاتی اجتہاد سے کام لے رہا تھا کہ چونکہ اللہ کی ذات بڑی بے نیاز ہے اس لیے ایسے مواقع پر اس کے بندوں کو بھی بے نیاز ہو جانا چاہیے۔

تاہم کچھ دیر کے بعد میں نے دوبارہ اپنی سیٹ پیچھے کو سرکالی تھی اور کبوتر کی طرح آنکھیں بھی بند کر لی تھیں لیکن بیچ بیچ میں ہنکارہ بھرتا چلا جاتا تھا اور غالباً میری اس مروّت ہی کا فیضان تھا کہ موصوف کی گفتگو جاری و ساری تھی ؛ تاہم میرے ضبط کے بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹے جا رہے تھے حتیٰ کہ میرا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے ''دشمن'' کے خلاف جوابی کاروائی کی ٹھان لی۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی نشست ایک بار پھر آگے کو سرکائی۔ اپنے بیگ میں سے بیاض نکالی اور جونہی ان کا ''فقرۂ جاریہ'' ختم ہوا، دوسری غزل، تیسری غزل، چھوتھی غزل، حتیٰ کہ میں نے پوری پانچ غزلیں مصرعوں کی بار بار تکرار کے ساتھ ان کے گوش گزار کر ڈالیں مگر میں نے محسوس کیا کہ ''دشمن'' کے حوصلے پست ہونے کی بجائے پہلے سے زیادہ بلند ہو گئے ہیں یعنی اس کے چہرے پر بشاشت آ گئی ہے۔

اس پر میں نے جھنجھلا کر اپنی مختصر نظموں کو طوالت کے ساتھ سنانا شروع کر دیا اور میں نے محسوس کیا کہ موصوف اس دوران بھی ہمہ تن گوش ہیں، صرف ہمہ تن گوش ہی نہیں بلکہ ''مستحق'' مقامات پر بڑے سلیقے سے داد بھی دے رہے ہیں۔

یہ دیکھ کر میں نے ایک بار پھر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک تازہ ادبی پرچے میں اپنے بارے میں شائع ہونے والے مضمون کی قرأت شروع کر دی مگر میں نے دیکھا کہ موصوف اس مضمون کا ایک ایک لفظ پورے غور سے سن رہے ہیں۔

اس پر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔

میں نے بیاض اور پرچہ دونوں بیگ میں ڈالے اور ایک بار پھر سر نشست کے ساتھ ٹکا دیا۔

''نوجوان! میں نے اچھے ہمسفر کے لے جو دعا مانگی تھی، تم سے تمہارے باطنی تعارف کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ پوری ہو گئی ہے۔''

بزرگ تو حسب سابق انگریزی ہی میں رواں تھے مگر اب میری رائے ان کے

بارے میں بدل گئی تھی کہ نہ صرف قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ میری سنتے رہے تھے بلکہ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ برابر میں بیٹھے ہوئے انسان اور اُس کی سوچوں کے ساتھ اُن کی وابستگی میری طرح ظاہری نہیں، بہت گہری ہے۔ میں دراصل ان کے تھیلے سے دھوکا کھا گیا تھا اور میرے دل میں ان کی برتری اور اپنی کمتری کا احساس نمودا ہوا۔

''میں سمجھتا ہوں بڑا شاعر وہ ہے جو عوام کی طرف سفر کرتا ہے اور عوام اس کی طرف سفر کرتے ہیں؛ چنانچہ میرے نزدیک وارث شاہ، سچل سرمست، شاہ بھٹائی اور خوش حال خاں خٹک بڑے شاعر ہیں۔''

بزرگ نے اس بار اپنی گفتگو کا آغاز لٹریچر کے وسیلے سے کیا تھا اور یہ آغاز خاصا چونکا دینے والا تھا۔ گو میرے لیے ایک چونکا دینے والا امر یہ بھی تھا کہ متواتر انگریزی بولنے والے یہ بزرگ جنھوں نے اپنا نام سیّد کاظم حسین رضوی بتایا تھا خاص اکبر آباد کے رہنے والے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ اسلام آباد میں ٹیلی فون کے محکمے میں ایک اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہیں۔

''آپ بجا فرماتے ہیں۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن کیا اردو میں بھی کوئی ایسا شاعر موجود ہے جو عظمت کے اس پیمانے پر پورا اترتا ہو؟'' میں نے اپنا رخ ان کی طرف موڑ کر دلچسپی سے پوچھا۔

''میرے نزدیک اقبال کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے'' بزرگ نے کہا:

''لیکن یہ اقبال ڈاکٹر اقبال ہے جو اپنے شکوہ، جواب شکوہ اور طلوع اسلام وغیرہ کے ساتھ عوام کی طرف سفر کرتا ہے۔''

اب گفتگو کا رخ ادب سے مذہب کی طرف پھر گیا تھا۔

''ہمارے دکھوں کا علاج مذہب میں ہے''۔ یہ ایک گھسا پٹا فقرہ تھا مگر یہ بزرگ اپنا فقرہ ابھی مکمل کر رہے تھے: ''ایک شاعر کے لیے مذہبی ہونا ضروری نہیں مگر ایک مذہبی شخص کے لیے پوئٹک وژن بہت ضروری ہے''۔

ان کے اس فقرے میں جو "وِزڈم" تھی اس نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا اور پھر جوں جوں میں ان کی گفتگو غور سے سنتا چلا گیا۔ یہ احساس قوی تر ہوتا چلا گیا کہ میں زیاں کار تھا جو اتنا وقت اس بزرگ کی قربت میں گزارنے کے باوجود اس کے فیضان سے محروم رہا۔ بزرگ کی اس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا ان کی گفتگو میں اگرچہ بیسیوں مغربی فلاسفروں، دانشوروں، مفکروں اور ان کی کتابوں کے حوالے درمیان میں آئے لیکن ان کی بنیادی سوچ قرون اولیٰ کے مسلم دانشوروں کی طرح ان کی اپنی کوکھ سے ابھرتی تھی۔

ٹرین ایک سٹیشن پر آن رکی تھی۔

دو نوجوانوں نے میری نشست کی کھڑکی کا شیشہ بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشارے سے باہر بلایا۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا مگر وہ مجھے میری تحریروں اور تصویروں کے حوالے سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں جیالوجی کے طالب علم ہیں اور ایک سٹڈی ٹور سے واپسی پر لاہور جا رہے ہیں۔ ٹرین چلی تو وہ بھی ساتھ سوار ہو گئے مگر ہم گارڈ کے کیبن اور آمنے سامنے واقع باتھ رومز کے درمیانی حصے میں کھڑے باتیں کرتے رہے۔ اگلے سٹیشن پر یہ نوجوان اتر کر واپس اپنے ڈبے میں چلے گئے تو میں دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔

"لوگوں کا تمہیں جاننا ایک پری وِیلج privilege ہے" بزرگ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "مگر تمہارا لوگوں کو جاننا اس سے بڑی پری وِیلج ہے میں کے ٹو کو عظیم نہیں سمجھتا کیونکہ اسے سب جانتے ہیں وہ کسی کو نہیں جانتا"۔

اتنے میں لاہور سٹیشن قریب آن پہنچا تھا۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا اور پورے احترام کے ساتھ ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ میں نے آج آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"میں نے تمہیں کچھ نہیں سکھایا"۔ بزرگ نے اپنا خاکی تھیلا پائیدان سے اٹھا کر کاندھوں پر ڈالتے ہوئے کہا: "تم نے وہی کچھ سیکھا ہے جو تمہارے اندر تھا"۔

اور پھر گاڑی رکنے پر سفید کترویں ڈاڑھی' ابھرے ہوئے ناک، پچکے ہوئے گالوں اور استری سے بے نیاز قمیض اور پتلون میں ملبوس یہ نحیف ونزار سا شخص میرے ایسے انسانوں کے ہجوم میں گم ہوگیا!

# گاڑی کے دو ڈبے

راولپنڈی جانے کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ریل کار کے عمومی درجے میں جب میں نے داخل ہونے کی کوشش کی تو دروازے میں انسانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے پایا۔ میں نے صرف چند گھنٹے پیشتر اپنی سیٹ بُک کرائی تھی اور میرے سفارش کنندہ نے معذرت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس وقت صرف عمومی درجے میں ایک سیٹ دستیاب ہے اور وہ بھی بس یوں سمجھیں کہ صرف آپ کے لیے ہے اور اب میرے سامنے سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار تھی جسے چیر کر مجھے اپنی سیٹ تک جانا تھا۔ میں نے پائیدان پر بڑی مشکل سے پاؤں جمائے اور اپنے لیے راستہ بنانے کی خاطر اپنی داہنی کہنی دروازے میں کھڑے ایک قوی ہیکل شخص کے پیٹ میں گھونپ' دی۔ اس نے لحہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر بے نیازی سے سیٹی بجانے میں مشغول ہو گیا۔ میری کہنی کی حیثیت غالباً ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں تھی جو اسے تھوڑی دیر کے لیے اپنے پیٹ پر رینگتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر وہ اس چیونٹی سے غافل ہو گیا۔

اس ''آستانے'' سے مایوس ہو کر میں نے برابر والے در پر اپنا سر نیاز جھکا دیا، جہاں ایک نحیف سا انسان کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا مگر میری تمامتر ''قوتِ ایمانی'' کے باوجود وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوا کیونکہ اس کے پیچھے انسانوں کا جم غفیر تھا جو ایک دوسرے میں کچھ اس طرح دھنسے ہوئے تھے کہ کسی بڑے آپریشن ہی کے ذریعے انہیں علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے اپنا پاؤں پائیدان سے واپس پلیٹ فارم پر رکھ دیا اور ریلوے کی سفید وردی میں ملبوس، بازو پر سرخ پٹی باندھے ہوئے ٹکٹ کنڈیکٹر

کے پاس گیا اور کہا:

"مجھے بتایا گیا تھا کہ ائیر کنڈیشنڈ بوگی میں کوئی سیٹ دستیاب نہیں ہے؛ تاہم ممکن ہے اس دوران کسی مسافر نے اپنی سیٹ کینسل کرادی ہو، اگر ایسا ہوا ہو تو براہ کرم یہ سیٹ مجھے بُک کر دیں"۔

اس پر چارٹ ہاتھ میں پکڑے ہوئے کنڈیکٹر نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ میں کوئی اسامی نہیں ہوں' اس نے بے رخی سے کہا:

"گاڑی روانہ ہونے تک میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ گوجرانوالہ اسٹیشن پر مجھ سے پتہ کریں"۔

اس اثنا میں گارڈ نے سیٹی بجائی اور پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ میں دوڑ کر عمومی درجے کی بوگی کے پائیدان سے لٹک گیا۔ وہاں انسانوں کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار اسی طرح موجود تھی، قریب تھا کہ میرے ہاتھ سے ہینڈل چھوٹ جاتا مگر اس بار دروازے میں کھڑے اس قوی ہیکل شخص نے مجھے فوراً بازو سے اپنی طرف کھینچا اور پھر مجھے راستہ دینے کے لیے قدرے ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا لیکن اس دیوار کے آگے اور بہت سی دیواریں تھیں اور میں ان سب کو پھلانگتا ہوا بمشکل تمام اپنی سیٹ تک پہنچا۔

اس "جدوجہد" میں سارا جسم پسینے میں نہا گیا تھا اور میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی ــــ!

یہ بوگی انجن کے بالکل ساتھ "واقع" تھی اور میری نشست سے ایک گز کے فاصلے پر جو دروازہ تھا وہ انجن کی طرف کھلتا تھا۔ یہ دروازہ تھوڑی دیر کے بعد خود بخود کھل جاتا اور سارا کمپارٹمنٹ ایک خوفناک شور سے گونج اٹھتا۔ ادھر کھڑکی سے تیز دھوپ بھالے کی طرح میرے جسم میں اتر رہی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ میرے برابر میں کھڑے مسافروں میں سے ایک نے خود کو سہارا دینے کے لیے اپنا ایک ہاتھ میری نشست کی ٹیک پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گھٹڑی تھی جو میرے چہرے کے عین سامنے تھی اور یوں میں اپنا

سر نہ پیچھے لے جا سکتا تھا نہ سیدھا رکھ سکتا تھا اور نہ اسے آگے کو لے جا سکتا تھا۔

میری زبان کانٹے کی طرح خشک ہو رہی تھی مگر میری رسائی باتھ روم میں لگے بیسن تک ممکن نہیں تھی کہ یہ راستہ بھی انسانوں سے اٹا ہوا تھا۔ میری نشست سے ذرا فاصلے پر ایک پاگل صرف لنگوٹی باندھے کھڑا تھا۔ اس کی داڑھی بے ہنگم طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ بال کھلے تھے اور اس کے بڑھے پیٹ پر مَیل کی تہیں جمی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنے دونوں ہاتھ پہیوں کی طرح چلاتے ہوئے اور منہ سے ''چھک چھک'' کی آواز نکالتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اور جب اسے رستہ نہ ملتا تو وہ منہ سے انجن کی طرح خوفناک چیخ مارتا۔

گوجرانوالہ اسٹیشن پر میں کھڑکی کے راستے باہر کُودا اور دوڑ کر ٹکٹ کنڈیکٹر کے پاس گیا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

''میں نے ابھی چیک کیا ہے۔ آپ کو ائیر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں سیٹ مل سکتی ہے آپ چل کر بیٹھیں۔ میں آ کر ٹکٹ کاٹتا ہوں''۔

اسے اب غالباً گاہک کی امید نہ تھی؛ تاہم میں نے یہ خوش خبری سن کر اپنی چال میں ایک وقار سا پیدا کیا اور یوں ہولے ہولے چلتا ہوا ائیر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

یہ کمپارٹمنٹ دودھیا روشنیوں اور دودھیا چہروں سے منور تھا. یہاں لوگ اس طرح اطمینان سے بیٹھے تھے جس طرح گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوں. یہاں دھوپ کی نوکیلی کرنوں اور حبس کا داخلہ ممنوع تھا. اس بدترین موسم میں بھی کمرے کی فضا میں ہلکی سی خنکی کا احساس پیدا ہو رہا تھا. میں نے اپنی سیٹ تلاش کی اور پھر اسے پیچھے کی طرف سرکا کر نیم دراز ہو گیا. قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی حبسِ بیجا سے رہائی کے بعد میں خود کو ایک عجیب عالم میں محسوس کر رہا تھا اور سرشاری کی ایک نامعلوم سی کیفیت میرے جسم میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ ان لمحوں میں مجھے احساس ہوا کہ میں کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والا ایک انسان

نہیں بلکہ سچ مچ کا اشرف المخلوقات ہوں. میں نے اپنی نشست کے ساتھ لگی بیل (BELL) پر انگلی رکھ دی اور تھوڑی دیر بعد ایک باوردی ویٹر میرے پاس آ کر نیم ایستادہ ہو گیا. میں نے اسے یخ بستہ کوک گلاس میں لانے کا آرڈر دیا اور پھر کھڑکی کے بڑے بڑے شیشوں میں سے تیزی سے گزرتے ہوئے خوبصورت مناظر کو آنکھوں میں سموتے ہوئے میں نے کوک کی چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ گلاس میں برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے جس سے گلاس کے باہر کی سطح نم آلودہ ہو رہی تھی۔

گجرات تک پہنچتے پہنچتے میرے اوسان مکمل طور پر بحال ہو چکے تھے؛ چنانچہ کچھ دیر کے لیے گاڑی رکی تو پلیٹ فارم پر اتر کر پھر وہی باوقار سی چال چلتا ہوا اپنے پہلے ٹھکانے کی طرف گیا. میں یونہی اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے جھلسا دینے والی دھوپ ڈبے میں داخل ہو رہی تھی۔ یہاں ڈبے کے مکین پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے پیاس کی شدت سے ان کی زبانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور ان کے سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے. عورتیں، بچے اور بوڑھے چھت سے چپکے ہوئے سہارے کے ساتھ چمگادڑوں کی طرح لٹک رہے تھے. ان کے درمیان لنگوٹی میں ملبوس بے ہنگم داڑھی والا پاگل اپنے میلے ننگے پیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ مجھے کھڑکی میں سے اس کا صرف نچلا دھڑ نظر آیا اور پھر مجھے اس کے منہ سے نکلتی ہوئی چھک چھک کی آواز سنائی دی. اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم بڑھائے اور جب اسے راستہ نہ ملا تو اس نے انجن کی طرح خوفناک چیخ ماری مگر اس ڈبے کا صرف یہی مسافر ایسا تھا' ورنہ باقی مسافر تو پہلے کی طرح اپنی چیخیں اپنے سینوں میں دبائے بیٹھے تھے!

---

# دو آسمانوں کے درمیان

اس روز آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے. لاہور ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ہمیں خاتون اناؤنسر کی آواز سنائی دی: ''راولپنڈی کی فلائیٹ لاہور پہنچ گئی ہے۔''

''واقعی پہنچ گئی؟'' میرے دوست نے چہرے پر حیرانی بکھیرتے ہوئے ہنس کر کہا. پھر اس نے مجھے مخاطب کیا اور کہا: ''ذرا ان پی آئی اے والوں کو دیکھو ان کے لیے فلائٹ کا راولپنڈی سے لاہور بخریت پہنچ جانا باقاعدہ ایک خبر ہے جسے وہ پورے اہتمام کے ساتھ لاؤڈ سپیکر سے نشر کرتے ہیں۔''

اس ستم ظریف کو ابھی اس ''خبر'' پر مزید تبصرہ آرائی کرنا تھی مگر دریں اثنا لاہور سے راولپنڈی جانے والی فلائٹ بھی ''اناؤنس'' ہوگئی؛ چنانچہ ہم نے دوڑ کر کڑک مرغی ایسے ''فوکر'' میں پناہ لی. ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی تھی اور جہاز تک پہنچتے پہنچتے ہمارے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد فوکر فضا میں تھا. میں نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی مگر نیچے دھند تھی اور گہرے بادل تھے. زمین بھی آسمان لگ رہی تھی۔ ہم دو آسمانوں کے درمیان پرواز کررہے تھے۔

''ہم ایک ہی آسمان سے شکوہ کناں رہتے ہیں، آج دو ہو گئے ہیں'' میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا. اس کی نظریں بھی کھڑکی ہی کی جانب تھیں۔

''ٹمز لاں گے'' اس نے ہنستے ہوئے کہا: ''مگر تم ان فوکر صاحب کا حلیہ ملاحظہ کر رہے ہو؟''

''ہاں! وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں'' میں نے نشستوں اور دیگر سازوں سامان کی خستہ حالی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا: ''فوکر تو مجھے ویسے بھی جہاز نہیں لگتا، بلکہ لگتا ہے جیسے جہاز کے بچے نکلوائے ہوئے ہوں''۔

میرے دوست نے حفاظتی پیٹی کھول لی تھی اور اب ٹانگیں پسارنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش کے دوران اس کے گھٹنے بار بار اگلی سیٹ سے جا ٹکراتے تھے۔

''اس مسافر کو دیکھ رہے ہو؟'' میرے دوست نے بائیں جانب کی ایک نشست پر براجمان ایک خوفناک سی شکل وصورت کے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''یہ مجھے ہائی جیکر لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ اٹھ کر کاک پٹ کی طرف جائے گا اور پائلٹ کو طیارے کا رخ لیبیا وغیرہ کی طرف موڑنے کو کہے گا ـــ آہا میں نے ابھی تک لیبیا نہیں دیکھا''۔

یہ فقرہ مکمل کر کے ابھی وہ روٹین کا قہقہہ لگانے ہی کو تھا کہ جہاز ایک جھٹکے سے یکدم نیچے کو ہو گیا، بالکل اسی طرح جیسے کسی بات پر بیٹھے بیٹھے دل ڈوب سا جاتا ہے اور پھر وہ مسلسل ڈولنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی رکشہ ٹوٹے ٹبوں والی سڑک پر چل رہا ہے۔

''تم بھی اپنی حفاظتی پیٹی باندھ لو'' ـــ میرے ہنسوڑے دوست نے دوبارہ اپنی حفاظتی پیٹی باندھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اس کی ہنسی غائب ہو گئی تھی اور اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ غالباً وہ کلمہ طیبّہ کا وِرد کر رہا تھا۔

''ایسے موسم میں ائیر پاکٹس زیادہ ہوتی ہیں مگر اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں''۔ میں نے اسے تسلّی دینے کی کوشش کی جبکہ جہاز کے دیگر مسافروں کی طرح خوف کے مارے میری زبان بھی تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

میں نے حفاظتی پیٹی باندھ لی اور اب اپنا دھیان بٹانے کے لیے یونہی اردگرد نظر دوڑا رہا تھا۔

"دراصل بات یہ ہے کہ....."

میرے دوست کا فقرہ نامکمل رہ گیا؛ کیونکہ جہاز ایک بار پھر پورے شدّ ومدّ کے ساتھ ہچکولے کھانے لگا تھا۔ اس نے اپنا دھیان دوسری طرف مبذول کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں میں اخبار تھام لیا اور اپنے ہونٹ مضبوطی سے سکیڑ لیے۔

اب جہاز متواتر جھٹکوں کی زد میں تھا۔

میری اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ جہاز کے دیگر مسافر بھی شدید خوفزدہ نظر آرہے تھے مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ سکاؤٹ خطرے میں مسکراتا ہے اور سیٹی بجاتا ہے۔ سو میں نے خطرہ سامنے پا کر مسکرانے کی کوشش کی اور سیٹی بجانے کی کوشش کی۔

میں غالباً ان میں سے اوّل الذکر کوشش میں کامیاب ہو سکا کیونکہ میرے سہمے ہوئے دوست نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور جھلا کر کہا:

"یہ دانت کیوں نکال رہے ہو؟"

"میں خود دانت نہیں نکالوں گا تو تھوڑی دیر بعد ویسے ہی نکل جائیں گے لہذا بہتر یہی ہے کہ اپنے دانت آپ نکالے جائیں۔ تم بھی کوشش کرو"۔

غالباً میری بات میرے دوست کی سمجھ میں آ گئی تھی، کیونکہ تھوڑی دیر بعد وہ مسکرانے کی منزل طے کر کے قہقہے لگانے کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔

جہاز نے ایک بار پھر غوطہ کھایا۔

"یار ذرا کھڑکی سے دیکھنا کہ مقام فوتیدگی کون سا ہے۔ کہیں سبزۂ نورستہ بھی ہے یا نہیں؟ اور ذرا یہ بھی پتہ کرو کہ لحد پر شبنم افشانی وغیرہ کا بندوبست کیا ہے؟"

میرے دوست کا چہرہ خوف سے متغیر تھا مگر وہ ہنستا جا رہا تھا۔

وہ دو روز قبل ٹریفک کے ایک حادثے کا شکار ہوا تھا اور اس کی پیشانی پر چوٹوں کے خاصے نشان واضح تھے۔ وہ انہیں ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب معلوم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں"۔ میں نے قہقہہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "تمہارے بارے میں تو امدادی کام کرنے والوں میں یہ کنفیوژن پیدا ہو جائے گا کہ اس کی پرانی چوٹیں کون سی ہیں اور نئی کون سی ہیں؟"

اس پر میرے دوست نے بھرپور قہقہہ لگایا اور اس اثنا میں میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مسافروں کو ہمارے یہ قہقہے زہر لگ رہے ہیں، کیونکہ بہت سی آنکھیں کھا جانے والی نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھیں؛ مگر پھر یہ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور ہونٹ ہلنے شروع ہو گئے، کیونکہ جہاز ایک بار پھر شدید ہچکولوں کی زد میں تھا۔

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟" میں نے تھوک نگلتے ہوئے اپنے دوست کو مخاطب کیا: "میں نے احتیاطاً کلمہ طیبہ کا ورد کر لیا ہے کہ اللہ جانے موقع پر اس کا موقع ملے نہ ملے"۔

جواب میں میرے دوست نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کی دہلیز پار نہ کر سکی۔ مجھے صرف اس کے لب ہلتے ہوئے محسوس ہوئے۔

باہر وہی دو آسمان تھے۔ ایک نیچے اور ایک اوپر اور ہمارا فوکر پھدکتا ہوا ان کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔

دریں اثنا اناؤنسمنٹ بوتھ میں سے ائیر ہوسٹس نے اعلان کیا:

"خواتین و حضرات! ہم تھوڑی دیر بعد اسلام آباد ائیر پورٹ پر لینڈ کریں گے۔ ہمیں امید ہے آپ کا سفر بہت خوش گوار گزرا ہو گا"۔

اس بار ہم دونوں کا قہقہہ خاصا بلند تھا اور اس قہقہے میں غالباً منزل مقصود تک پہنچنے کے اعلان کی مسرت بھی شامل تھی۔

ائیرپورٹ پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ جہاز کی سیڑھیاں اترنے کے بعد سطح زمین پر قدم رکھتے ہوئے میں نے ایک طویل سانس لیا اور پھر اپنے دوست کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''تم جانتے ہو جہاز کے باقی مسافر کتنے خوفزدہ تھے اور اس کے برعکس ہم دونوں اتنے گونجدار قہقہے کیوں لگا رہے تھے؟ اس لیے کہ وہ ہم تھے جو سب سے زیادہ خوفزدہ تھے سب سے زیادہ خوف زدہ آدمی کی بڑھک سب سے زیادہ گونجدار ہوتی ہے''۔

———❖❖❖———

# ریت کی دیواریں

''مطبوعات'' کے دفتر کا دروازہ بغیر کسی دستک کے کھلا اور سبز لبادے میں ملبوس ایک ملنگ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کڑے اور گلے میں منکوں کی مالا تھی۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر چھوٹی چھوٹی سفید ڈاڑھی تھی۔ نو وارد کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر وہ جسمانی طور پر خاصا صحت مند تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی۔

اس نے اندر داخل ہوتے ہی نوٹ بک خالد احمد کے ہاتھوں میں تھمائی اور کہا:

''بچہ تو بہت کچھ پڑھتا ہے، یہ بھی پڑھ کر دیکھ!''

ایک طویل عرصے سے بے روزگار خالد احمد نے اپنے بڑھے ہوئے شیو میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر یہ نوٹ بک اس سے ''وصول'' کر کے بڑی بے نیازی سے میری طرف بڑھا دی۔

میں نے اشتیاق سے اس نوٹ بک کا کچ بٹن کھولا اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

اور میرے لیے اس نوٹ بک کی ورق گردانی ایک عجیب و غریب تجربہ تھا؛ کیونکہ اس نوٹ بک میں وکیلوں، مجسٹریٹوں، سول ججوں اور پولیس انسپکٹروں وغیرہ کے تصدیقی سرٹیفکیٹ تھے جن کے مطابق یہ ملنگ موصوف ''ولایت'' کے مقام پر فائز تھے۔ ان اسناد کے نیچے باقاعدہ مہر اور دستخط ثبت تھے۔

میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودا ہوئی۔ گویا اولیاء اللہ دنیاداروں سے ''ولایت کی اسناد حاصل کرتے ہیں۔

''فراڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ یہ نکلا اور میں نے یہ نوٹ بک نجیب احمد کو تھمادی۔

نجیب احمد نے بھی ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر یہ واپس ملنگ کو لوٹا تے ہوئے کہا: ''معاف کرو''۔

معافی بھی مل جائے گی بچہ!'' ملنگ نے عصا زمین پر مارتے ہوئے کہا: ''یہ علیؓ کا ملنگ آیا کس لیے ہے؟''۔

میں، خالد اور نجیب گپ شب کے موڈ میں تھے اور یوں اس کی یہ ''معرفت'' کی گفتگو ہمیں کچھ اچھی نہیں لگی؛ چنانچہ ہم تینوں نے یک بار کہا: ''باباجی! اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ سے ایک بار کہہ دیا ہے معاف کریں۔ اب آپ جائیں''۔

''میں بابا فریدؒ کے دربار سے آیا ہوں۔ میرا نام بابا مستان شاہ ہے۔ پاکپتن سے آیا ہوں۔ تم کہتے ہو تو چلا جاتا ہوں''۔ ملنگ نے کہا مگر وہ بدستور اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور کنکھیوں سے ہمارے ردِعمل کا جائزہ لے رہا تھا۔

اور ان لمحوں میں مَیں ایک اور عجیب وغریب تجربے سے دوچار ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اس شخص کا اولیائی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض بہروپیا ہے مگر اس کے باوجود میں نے اپنے جسم میں ایک سنسنی سی محسوس کی۔ میرے ذہن میں سوچ کی ایک لہر آئی کہ اگر یہ واقعی کوئی بزرگ ہے تو ہمیں اپنی اس بے ادبی کا خمیازہ یقیناً بھگتنا پڑے گا۔ غالباً یہی ردعمل خالد احمد اور نجیب احمد کے چہروں سے بھی نمایاں تھا، کیونکہ مستان شاہ پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔

''ہاں، میں نے بابا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دی ہے''۔ نجیب نے کہا۔

''تو پھر میں چلا جاؤں؟'' اس نے عجیب وغریب انداز میں پوچھا اور ہم تینوں

کہ اندر سہمے ہوئے تھے، گونگے ہو کر رہ گئے۔

''نہیں، میں نہیں جاؤں گا!''

وہ ہماری کیفیت بھانپ گیا تھا اور پھر دو قدم چل کر میری طرف آیا: ''میں پنجتن کے نام پر تمہیں زور سے پانچ مکّے ماروں''۔ اس نے مٹھی فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

گو اس کے بارے میں میرے خیالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی یعنی مجھے یقین تھا کہ وہ فراڈ ہے لیکن میں نے ایک عجیب بے بسی کے عالم میں کہا:

''مارلو''۔

''نہیں ماروں گا''۔ مستان شاہ نے مشفقانہ سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور میرے کاندھوں پر پیار سے ہولے ہولے پانچ مکّے مارے۔

''مولا حسینؓ کے نام پر اگر میں تم سے چندہ مانگوں تو دو گے؟'' اب وہ حرف مدعا زبان پر لے آیا تھا مگر پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا اس نے گھمبیر آواز میں کہا۔نہیں لوں گا''۔اور پھر نجیب احمد کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں پنجتن کے نام پر زور سے پانچ مکّے ماروں؟''

''مارو''۔ نجیب نے گلو گیر لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں ماروں گا!'' اس نے کہا اور پھر اسے بھی پیار سے ہولے ہولے پانچ مکّے مارے۔

''مولا حسینؓ کے نام پر اگر تم سے چندہ مانگوں تو دو گے؟'' اس نے دوسرا سوال دہرایا اور پھر حسبِ سابق نجیب کے جواب سے پہلے خود ہی کہا: ''نہیں لوں گا''

اور اب خالد احمد کی باری تھی۔

مستان شاہ نے پنجتن کے نام پر پانچ مکّوں کی فرمائش اور پھر اثبات میں جواب ملنے پر ''نہیں ماروں گا'' کہہ کر دوسرا سوال دہرایا:

''مولا حسینؓ کے نام پر اگر تم سے دس روپے مانگوں تو دو گے؟''

خالد احمد نے اس کی طرف دیکھا کہ وہ ابھی خود ہی ''نہیں لوں گا'' کہہ دے گا مگر جب اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا تو خالد نے بے بسی سے کہا:

''ہاں دوں گا!''

''تو پھر نکالو!'' مستان شاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

خالد احمد نے بڑی تابعداری سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے نکال کر اسے دے دیے۔

''یہ تم اپنی خوشی سے دے رہے ہو۔ اگر خوشی سے نہیں دیے تو واپس لے لو''۔ مستان شاہ نے کہا مگر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ نوٹ جیب میں ڈال چکا تھا۔

''فقیر اب تمہارے لیے دعا کرے گا''۔ مستان شاہ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس کے ساتھ ہم بھی دعا میں شریک ہو گئے۔

دعا کے بعد اس نے نوٹ بک بغل میں دبائی جس میں پولیس انسپکٹروں وغیرہ نے اس کی ''ولایت'' کی تصدیق کی تھی اور دوسرے ہاتھ میں عصا تھام کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یہ دعا کے لیے ہاتھ ہم نے تمہارے لیے نہیں اٹھائے تھے'' اس کے جاتے ہی میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ نکلا ''بلکہ یہ دعائے مغفرت تو اس دس کے نوٹ کے لیے تھی جس سے تم محروم ہو گئے ہو''۔

''ہاں یار میرے ساتھ تو واقعی ہاتھ ہو گیا ہے''۔ بے روزگار خالد احمد نے جھینپی جھینپی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اور اپنے بڑھے ہوئے شیو میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''میں تو کہتا ہوں تم نوکریوں کے پیچھے دربدر ہونا چھوڑو اور مستان شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے یہی کام شروع کر دو''۔ نجیب احمد نے کہا اور پھر تینوں نے پیٹ پکڑ کر ہنسنا

شروع کر دیا۔

مگر ہم تینوں کہ اندر سے کمزور اور سہمے ہوئے اور باہر سے پڑھے لکھے روشن خیال نوجوان تھے، ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو گئے اور پھر ہمارے چہروں پر خوف کی لکیریں پھیلتی چلی گئیں۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی اور پھر ہم ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر اپنے ان گھروں کی طرف لوٹ گئے جن کے گرد ریت کی دیواریں ہیں اور جن پر اَن دیکھے خوف کے سائے ہیں!

# غالبؔ کے ساتھ

لاہور سے مری کی طرف سفر کے دوران میں نے اسد اللہ غالبؔ کو اندھا دھند کار چلاتے دیکھا تو پوچھا:

''مرشدی! وہ آپ کا ایک بھلا سا شعر ہے، کیا ہے وہ؟

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے، تھمے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب ہیں!''

بولے: ''ہاں شعر تو یہی ہے مگر پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟''

میں نے سپیڈو میٹر پر ایک نظر ڈالی اور کہا: ''کچھ نہیں۔ بس یوں ہی پوچھا تھا!''

یہ اسد اللہ غالبؔ، مرزا اسد اللہ غالبؔ نہیں تھے مگر قحط الرّجال کے اس دور میں ہم نے انہی کو غنیمت جانا اور لاہور سے مری، مری سے منگلا اور منگلا سے میر پور اور میر پور سے واپس لاہور آنے تک ہم نے انہیں مرزا غالبؔ ہی قرار دیا اور اس دوران ان سے گفتگو اکثر و بیشتر ''انہی'' کے شعروں کے حوالے سے کرتے رہے۔

مری کی مال روڈ پر پھیرے لگا لگا کر جب میں، امجد، گلزار، وحید اور غالبؔ خود کو بھائی پھیرو ''محسوس کرنے لگے تو میں نے غالب سے پوچھا:

''مرشدی اب کیا کیا جائے؟''

غالبؔ نے جواب دیا: ''اب پنڈی پوائنٹ پر چلا جائے''۔

پنڈی پوائنٹ کو چھو کر لوٹے تو ایک بار پھر استفسار کیا کہ ''حضت! اب کیا کیا جائے؟''

بولے: ''اب کشمیر پوائنٹ تک واک کی جائے!''

کشمیر پوائنٹ سے واپسی پر پوچھا:

''اب کیا کیا جائے؟''

فرمایا: ''اب پھر مال روڈ کے پھیرے لگائے جائیں''۔

مال روڈ کی وہی اونچائیاں اور پھر وہی نچائیاں تھیں۔ وہی مرد اور عورتیں تھیں۔ وہی دکانیں اور وہی دکاندار تھے یعنی وہی ''تم'' اور وہی ''ہم'' تھے۔

مرد وزن کے اس بیکراں ہجوم میں چلتے چلتے میں نے ایک بار پھر غالب سے پوچھا:

''مرشدی! وہ آپ کا ایک بھلا سا شعر ہے، کیا ہے وہ؟

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیشدستی ایک دن

گھبرا کر بولے: ''ہاں، شعر تو یہی ہے مگر پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟''

میں نے کہا:

''کچھ نہیں۔ بس یونہی پوچھا تھا۔''

چھ ہزار فٹ کی بلندی پر چلتے چلتے امجد اسلام امجد اور گلزار وفا ایک جگہ سانس لینے کے لیے رکے اور پھر ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ ریلنگ کے پیچھے دور تک پھیلے ہوئے چیڑ کے درختوں کا ہجوم تھا جو ڈھلوان پہاڑوں کے ساتھ نیچے اترتا جا رہا تھا اور پھر نظروں کے سامنے پتلی لکیر ایسی تھی جو راولپنڈی کی طرف لڑھکتی جا رہی تھی!

''واپسی پر تو اُترائی ہی اُترائی ہے جلدی پہنچ جائیں گے؟ گلزار وفا نے پتلی کمر یا

ایسی سڑک پر ایک نظر ڈالتے ہوئے استفہامی انداز میں کہا؛

''ہاں بہت جلدی''۔ امجد نے جواب دیا۔''بلکہ سائنس نے تو اتنی ترقی کرلی ہے کہ اگر تم چاہو تو آنکھ جھپکنے میں پنڈی پہنچ سکتے ہو، بس اس کے لیے تمہیں ایک پیشگی تحریر لکھ کر ہمیں دینا ہوگی۔ کیا خیال ہے؟''

غالب اور وحید چہل قدمی کرتے ہوئے کافی آگے نکل گئے تھے۔ گلزار نے وہیں کھڑے کھڑے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر انہیں تلاش کیا اور جب وہ دکھائی نہ دیے تو کہا ــــ ''ہمیں بھی چلنا چاہیے۔''

''مری میں کوئی کسی سے نہیں بچھڑتا۔ یہاں تو بچھڑے ہوئے ملتے ہیں''۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''تم نے اس پاگل کی حکایت تو سنی ہے نا کہ جسے کسی نے پتھر مارا تو وہ قبرستان میں جا کر بیٹھ گیا کہ اسے پتھر مارنے والے بالآخر یہاں آئیں گے''۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئے۔

غالب کے ہاتھ میں کپاس سے ملتے جلتے کچھ ملائم سے ریشے تھے:

''حضرات! یہ سنبل ہے جس کی شاعری میں بہت دھومیں ہیں۔ ذرا آگے جا کر دیکھیے، اس کے ریشے فضاؤں میں اڑ رہے ہیں جس پر ریشہ خطمی ہوتے ہیں، اس کی آنکھوں میں گھستے چلے جاتے ہیں''۔ غالب نے سنبل کا قصیدۂ ہجویہ پڑھتے ہوئے کہا۔''اور حضرات! اردو فارسی شاعروں میں سنبل کے ساتھ ریحان کا ذکر بھی بہت آتا ہے۔ کیا وہ حضرت بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہیں؟''

بعد میں ہم نے لغت دیکھی تو پتہ چلا کہ سنبل کوئی اور چیز ہوتی ہے!

واپسی پر اسی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے غالب نے ایک جگہ کار کو بریک لگائی اور کہا:

''میں آپ کو یہ اطلاع بہم پہنچانا چاہتا ہوں کہ کار کی ہینڈ بریک درست نہیں ہے

اور ظاہر ہے اترائی میں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ مجھے یہ اطلاع مری کی پہاڑیاں چڑھتے ہوئے آپ کو دینی چاہیے تھی۔ میں اطلاع میں اس تاخیر پر معذرت چاہتا ہوں"۔

مری کی پہاڑیاں اترنے کے بعد غالب نے ایک بار پھر کار روکی اور کہا:

"حضرات! ذرا گردن موڑ کر یہاں سے ان بلند و بالا پہاڑوں پر ایک نظر دوڑائیں جہاں سے ہم ابھی لوٹے ہیں۔ ان ہزاروں فٹ گہرے کھڈوں کو بھی ذہن میں لائیں جو ان راہوں میں موجود ہیں اور پھر ایک اطلاع یہ سنیں کہ کار کے چار پہیوں میں سے دو پہیوں کا سائز کچھ اور ہے اور دو پہیوں کا سائز کچھ اور ہے۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت میں بوجہ مصروفیت ٹائر بدلوا نہیں سکا تھا۔ میں اطلاع میں اس تاخیر پر بھی معذرت چاہتا ہوں اور گزارش کرتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر ان بلند و بالا پہاڑوں پر ایک نظر دوڑائیں جہاں سے ہم ابھی لوٹے ہیں"۔

کار میں سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس سناٹے کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے غالب سے پوچھا:

"مرشدی! وہ آپ کا ایک بھلا سا شعر ہے، کیا ہے وہ؟

سَو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے !"

بولے: "ہاں شعر تو یہی ہے مگر پوچھنے کی نوبت کیوں آئی؟"

میں نے گردن موڑ کر بلند و بالا پہاڑوں پر ایک نظر ڈالی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا___ "کچھ نہیں۔ بس یونہی پوچھا تھا!"

# پختونستان ہوٹل

جنوری ۱۹۷۰ء میں کابل (اور یورپ) کی یخ بستہ سردی کا تصور کر کے جب میں لاہور سے کابل اور پھر آگے یورپ جانے کے لیے پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہونے لگا تو خود بخود مجھے اپنی ہیئت کذائی پر ہنسی آ گئی۔ اونی بنیان: بنیان کے اوپر سویٹر، سویٹر کے اوپر قمیض، قمیض کے اوپر پھر سویٹر، سویٹر پر کوٹ اور کوٹ پر اوورکوٹ۔ پاؤں میں ایک کے بجائے جرابوں کے دو جوڑے، نیچے لیگنگ اور پھر گرم پتلون! اگر ان دنوں بھی ائیر پورٹ پر مسافروں کی تلاشی کا موجودہ ''فحش'' طریق کار ہی رائج ہوتا تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ممکن تھی کہ یا تو اس روز یہ پرواز کابل کے لیے روانہ ہوتی اور یا پھر میری جامہ تلاشی کا مرحلہ مکمل ہوتا۔

بہر حال طیارے میں ہیٹنگ سسٹم کی موجودگی کے باعث کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے جسم میں آگ سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن میرا رفیق نشست آتش شوق میں جل رہا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ائیر ہوسٹس اپنی مسکراہٹ تیز کر کے ہمارے پاس پہنچی اور پوچھا:

''آپ کیا پئیں گے؟''

''جوس!'' دریں حالات جوس ہی میرے جسم کی آگ کو سرد کر سکتا تھا۔

''اور آپ؟'' اس نے میرے رفیق نشست سے پوچھا جو پورے خضوع وخشوع سے والہانہ انداز میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"میں؟" میرے رفیق نے عینک اتاری "ہا... ہا... ہا"

یہ "ہاہاہا" غالباً جہاز میں دستیاب نہیں تھا، چنانچہ ائیر ہوسٹس نے اپنی کند ہوتی مسکراہٹ کو دوبارہ سان پر لگایا اور اپنا سوال دہراتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیا پئیں گے؟

"آپ ضرور کچھ پلانا چاہتی ہیں؟" اس عاشقِ زار نے رومال سے اپنی عینک کے شیشے صاف کیے اور پھر رومان میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: "جو چاہیں پلا دیں۔ ہم پی لیں گے"۔

میں اپنے جوس سے بھی محروم ہو گیا تھا کیونکہ وہ ائیر ہوسٹس پھر لوٹ کر نہیں آئی۔

کابل برف سے اٹا ہوا تھا۔

گلی کوچوں میں جمی ہوئی برف پر میں احتیاط سے قدم جماتا ہوا شیر محمد حسین کا گھر ڈھونڈ رہا تھا جس کا پتہ مجھے لاہور میں ایک دوست نے دیا تھا جو اس افغانی کا قریبی عزیز تھا۔ اوپر شٹل کاک برقعہ اور نیچے سکرٹ پہنے ہوئے ایک افغانی خاتون میرے برابر سے گزری مگر میں نے دیارِ غیر میں اس سے ایڈریس پوچھنے کا رِسک نہ لیا۔ ناگاہ میری نظر اس سنسان گلی میں ایک مردِ سرو قد پر پڑی جس نے ترکستانیوں جیسی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔

اس نے میرے استفسار پر انگلی سے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برفیلی ڈھلان پر اتر گیا۔

میری دستک پر مکان کی دوسری منزل میں سے قندھاری انار ایسی ایک خاتون نے کھڑکی میں سے اپنا سر باہر نکالا اور میرے استفسار پر اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا.... اس نے غصہ سے کہا:

"وہ حرامزادہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اب ایک اور مکان میں رہتا ہے"۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے زور سے کھڑکی بند کر دی۔

میں پریشان ہو کر چلنے ہی کو تھا کہ کھڑکی ایک بار پھر کھلی اور اس سرخ و سفید خاتون نے سر باہر نکال کر کہا:

''تم مہمان لگتے ہو۔ میں اپنا ملازم تمہارے ساتھ بھیجتی ہوں، وہ تمہیں اس خنزیر کے گھر چھوڑ آئے گا۔''

میں نے اپنے میزبان کو (جس کا ابتدائی تعارف ''اس کی سابقہ بیوی نے کرایا تھا) اس کے عزیز کا رقعہ دیا تو اس نے پُرجوش طریقے سے میرا خیر مقدم کیا اور اپنے گھر کے دروازے میرے لیے وا کر دیے۔ یہ ہنس مکھ شخص مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خورونوش کا انتظام کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم کی آرائش سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نفیس ذوق رکھنے کے علاوہ خاصا متمول بھی ہے۔ یہ کمرہ بھاپ والے پائپوں سے گرم کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں کچھ دیر بعد جسم پر استوار کئی منزلہ'' کپڑوں کی'' ''عمارت'' مجھے بار لگنے لگی؛ چنانچہ میں نے تمام زائد کپڑے اتار دیے اور صرف پتلون اور قمیض پہن کر نرم نرم صوفے پر دراز ہو گیا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور میزبان کی نظر قالین پر پڑے کپڑوں کے ڈھیر پر گئی تو اس نے بھرپور قہقہہ لگایا اور افغانی لہجے کی اردو میں کہا:

''یہ سب کپڑے تم نے اتارے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ یہ سارے کپڑے ایک دفعہ پھر مجھے پہن کر دکھاؤ۔''

اور کابل میں اردو بولنے والے افغانی مجھے وافر مقدار میں ملے۔ ایک عمارت کے باہر ''پختونستان ہوٹل' کا بورڈ دیکھ کر میرا جذبۂ تجسس بیدار ہوا اور اس میلے کچیلے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

یہاں لتا اور رفیع کے گانوں کے ریکارڈ بجائے جا رہے تھے اور اس پرشور فضا میں چوڑی چکلی چھاتیوں والے افغانی کرسیوں پر اکڑوں بیٹھے ہوئے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔

میرے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک گاہک نے مجھ سے اردو میں پوچھا:

''تم پاکستان سے آئے ہو؟''

''ہاں!''میں نے مختصر سا جواب دیا اور قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔

''برادر ملک! برادر ملک!!''اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے افغانی نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے''السلام علیکم'' کے ساتھ ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھا دیے۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ میں قہوہ پی کر''بل'' کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر کی طرف جانے لگا تو ان میں سے ایک نے مجھے روک دیا:

''تم پیسہ نہیں دو گے، تم پاکستان سے آئے ہو!''

میں نے ہوٹل سے نکل کر ایک نظر باہر آویزاں''پختونستان ہوٹل'' پر ڈالی۔ ایک نظر اندر بیٹھے ہوئے پُر خلوص عوام کو دیکھا اور پھر پوچھتا پچھاتا واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا جہاں میرا میزبان کھانے پر میرا منتظر تھا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر کپڑوں کے ڈھیر تلے دبا دیکھ کر بھر پور قہقہہ لگایا اور کہا:

''میں دوسرے کمرے میں جاتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں اپنی''پیکنگ'' کھول کر ذرا آرام کرلو''۔

❖❖❖

# بند کنوؤں سے سنائی دینے والی چیخیں!

سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عرس کی تقریبات اختتام پذیر ہوئیں تو اگلے روز قریباً ایک سو پاکستانی زائرین پر مشتمل وفد سرہند سے قریباً ۲۰ کلومیٹر پر واقع ایک قصبہ براس کی طرف روانہ ہوا جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرام مدفون ہیں۔

زائرین کے لیے دو بسیں مخصوص کی گئی تھیں مگر اس کے باوجود زائرین ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے بس میں سوار ہو رہے تھے۔ مسافروں میں زائرین پر متعین بھارتی انٹیلی جنس کی فوج ظفر موج کے کچھ ''معزز ارکان'' بھی شامل تھے۔ مجھے ان میں سے خصوصاً وہ ''صوفی صاحب'' بہت دلچسپ لگے تھے جنہوں نے لمبی داڑھی اور زلفیں رکھی ہوئی تھیں سر پر گول ٹوپی تھی اور جو گزشتہ دو دنوں سے خصوصی طور پر مجھ سے ''اظہارِ محبت'' فرما رہے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف سہارنپور کے ایک بڑے تاجر کے طور پر کرایا تھا اور ''موراوور'' کے طور پر یہ بتایا تھا کہ وہ شاعر بھی ہیں، چنانچہ انہوں نے گزشتہ رات ترنم سے اپنی کچھ بے وزن غزلیں بھی سنائی تھیں۔

ان صوفی صاحب کی حقیقت مجھ پر اس وقت آشکار ہوئی جب دو روز قبل رات کو میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں ابکائی کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مزار کے باہر عارضی طور پر قائم شدہ ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میرے حلق سے نکلنے والی آوازیں سن کر ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ فوراً جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگے۔

ابکائی سے فارغ ہو کر میں نے ان سے کہا: ''حضرت آپ اتنی سردی میں باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟''

فرمایا:

''بس نیند نہیں آ رہی تھی، یونہی ادھر چلا آیا''۔

اور یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں ایک بار پھر بند ہو گئیں۔

اس کے بعد رات کے دو بجے میں نے انہیں اسی طرح تھڑے پر بیٹھے اونگھتے دیکھا اور پھر صبح چار بجے بھی وہ ''نیند نہ آنے کی وجہ سے'' تھڑے پر مراقبے کے عالم میں تشریف فرما تھے اور اس وقت وہ پاکستانی زائرین کے لیے مخصوص بسوں میں سے ایک بس میں سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ''کھنگورا'' مار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ آواز ان تک نہ پہنچی؛ شاید اس لیے کہ فروری کے مہینے میں چار پانچ روز تک فرش پر سونے کی وجہ سے کھنگورے میں وہ دم خم نہیں رہا تھا۔

میری نشست پاکستانی وفد کے قائد مسٹر جسٹس صدیق چودھری کے ساتھ تھی۔ کھردری لکڑی سے تیار شدہ جسٹس صاحب کا عصا اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھا۔ بس اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی تو جسٹس صاحب (جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں) نے اپنے خالص دیہاتی لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ میرے لیے ان کی یہ گفتگو حقیقتوں کا عرفان تھی۔

جسٹس صاحب قیام پاکستان کے بعد مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے قائم شدہ کمیشن کے رکن تھے اور اس عرصے میں انہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ وہ بتا رہے تھے:

''اس وقت تم سڑک کے دونوں جانب جو ہرے بھرے کھیت دیکھ رہے ہو ۱۹۴۷ء میں یہاں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے سروں کی سرخ فصلیں کاٹی گئی تھیں۔ تم نے عورت کے کئی روپ دیکھے ہوں گے مگر اس کی بے چارگی اور مظلومیت کا رخ شاید اس طرح نہ دیکھا ہو جس طرح میں نے دیکھا ہے۔ جب مجھے پتہ چلتا کہ کسی گاؤں

میں مسلمان عورتیں درندوں کے قبضے میں ہیں تو میں پولیس کے چند سپاہیوں کے ساتھ خون کے پیاسے افراد کے درمیان میں سے گزر کر ان تک پہنچتا مگر کئی باریوں ہوا کہ مغویہ ہمیں دیکھ کر ہمارے ساتھ چلنے کی بجائے اس وحشی کے پہلو میں جا کھڑی ہوتی جس نے اس کے والدین کو قتل کر دیا تھا اور اسے اٹھا کر اپنے گھر ڈال لیا تھا لیکن جب ہم اسے یقین دلاتے کہ اب وہ مکمل طور پر محفوظ ہے اور اسے اس غنڈے سے ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تو وہ ہمارے ساتھ چلنے پر رضا مند ہوتی اور پھر مغویہ عورتوں کے کیمپ میں پہنچ کر وہ اپنے بچے کچھے کسی عزیز کے گلے لگ کر، ہچکیاں لے لے کر روتی"۔

جسٹس صاحب نے بتایا:

"میری آنکھوں نے وہ خوں آشام مناظر دیکھے ہیں کہ ایک وقت میں انسانیت سے میرا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران مری ملاقات ان بچیوں سے بھی ہوئی جو پورے پورے گاؤں کی ملکیت تھیں۔ میں نے کیمپوں میں اندر دھنسی ہوئی آنکھیں اور پھولے ہوئے پیٹ دیکھے ہیں۔ یہ اس وقت ہم جس علاقے سے گزر رہے ہیں۔ یہاں مسلمان عورتوں کے برہنہ جلوس گزرتے رہے ہیں"۔

"مگر میں تمہیں ایک واقعہ ضرور سناؤں گا"۔ جسٹس صاحب نے کہا: "مجھے اطلاع ملی کہ ایک سیّدزادی کو ایک بھنگی نے اپنے گھر میں ڈالا ہوا ہے۔ میں پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ اس گاؤں میں پہنچا اور دروازہ توڑ کر گھر داخل ہوا تو میں نے دیکھا صحن میں ایک بچی کھانا پکا رہی تھی اور ایک طرف جائے نماز بچھی تھی! اتنے میں ایک دوسرے کمرے سے ایک ادھیڑ عمر کا کالا بھجنگ شخص نکلا اور ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی بھنگی تھا جس کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ اس نے ایک سیّدزادی کو اغوا کر کے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک زوردار مُکا اس کے منہ پر رسید کیا جس سے وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد اٹھا اور اپنی قمیض کے دامن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے اس نے کھانا

پکاتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے نحیف سی آواز میں پوچھا:

''تم اسے لینے آئے ہو؟''

اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ سیدھا لڑکی کی طرف گیا اور کہا:

''بیٹی! میرے پاس تمہیں الوداع کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس پوٹلی میں بس ایک دوپٹہ ہے اور پھر دوپٹہ اس کے سر پر دیتے ہوئے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا''۔

بس تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ براس قصبہ ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں سے بے شمار بچے اچانک نکلے اور ہماری بس کے گرد جمع ہو گئے۔

اس گاؤں میں زیادہ تعداد سکھوں کی تھی چنانچہ ننھے ننھے بچوں نے سروں پر جُونڈے کیے ہوئے تھے اور وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ زائرین بسوں میں سے اترے اور قدرے بلندی پر واقع اس چار دیواری میں داخل ہو گئے جہاں ایک روایت کے مطابق بعض انبیائے کرام مدفون تھے۔ یہاں کئی کئی گز لمبی دو تین قبریں تھیں جو مبینہ طور پر ان انبیا کی تھیں۔ زائرین نے یہاں قرآن مجید کی تلاوت کی اور دعا مانگی۔

دعا سے فراغت کے بعد بسوں کی طرف واپس جانے کے لیے ڈھلان سے اترتے ہوئے اچانک ایک دبلا پتلا سا ہندو ہمارے وفد کے قائد جسٹس صدیق چودھری کے پاس آیا اور ان کے کان میں کچھ کہا اور پھر زائرین کے آگے آگے چلنے لگا۔

جسٹس صاحب نے ہمیں بتایا کہ یہ ہندو انہیں بتا کر گیا ہے کہ سکھوں نے اس گاؤں میں بہت وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔ انہوں نے سینکڑوں مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی تھی۔ بے شمار مسلمان عورتوں کو انہوں نے اپنے گھر میں قید کر لیا تھا جو آج بھی انہی گھروں میں بند ہیں اور ان کے بچوں کی مائیں ہیں۔ نیز یہ کہ سینکڑوں

مسلمان لڑکیوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں چھلانگیں لگا دی تھیں اور یہ کنوئیں ان کی لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ ان میں سے تین کنوئیں اس کے علم میں ہیں اور وہ ان کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے۔

یہ خبر آگ کی طرح زائرین میں پھیل گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس شخص کے پیچھے چلنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک ہموار جگہ پر رک گیا جہاں خودرو پھول لہلہا رہے تھے۔ ان پھولوں کے نیچے کنواں تھا جو بند ہو چکا تھا یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور کنواں تھا جو مسلمان لڑکیوں کی لاشوں سے بھرا ہوا تھا اور اب اسے بھی بند کیا جا چکا تھا۔ یہاں بھی فاتحہ خوانی کی گئی۔

تیسرا کنواں بہت سارے گھروں کے درمیان واقع تھا اور یہ اپنی شکل میں موجود تھا۔ اسے بند نہیں کیا گیا تھا لیکن لاشوں کے پٹ جانے کی وجہ سے چونکہ اس کا پانی پینے کے قابل نہیں رہا تھا، لہذا اب اس میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ غم کی شدت سے زائرین کے کلیجے شق تھے اور آنکھیں ساون کی طرح برس رہی تھیں۔

خود مجھے یوں لگا میں ۱۹۷۷ء کی بجائے ۱۹۴۷ء میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ جوان مردوں اور بوڑھی عورتوں کی لاشوں سے یہ میدان اٹا پڑا ہے اور وحشی درندے شراب کے نشے میں دُھت بھیانک قہقہے لگاتے ہوئے بچیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور وہ اپنے والدین اور عزیز واقربا کی لاشوں کو پھلانگتی ہوئی اس کنویں کے پاس آتی ہیں اور ایک ایک کر کے اس میں چھلانگ لگا دیتی ہیں۔ یہ کنواں لاشوں سے بھر گیا ہے اور اس کا پانی کناروں سے بہنے لگا ہے اور پھر یہ بہتا ہوا پانی فریاد کے لیے اس چاردیواری کے نیچے جمع ہو گیا ہے جہاں انبیا کے مزار ہیں۔

یہاں وفد میں شامل ایک باریش بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر

جوں جوں ان کی ہچکیوں بھری آواز بلند ہوتی گئی۔ زائرین کی آہ و بکا میں شدت آتی گئی اور پھر روتے روتے گلے رندھ گئے۔

بھائی تیس برس بعد اپنی بہنوں کی خبر لینے آئے تھے اور پل بھر کے بعد انھوں نے پھر سے جدا ہو جانا تھا۔

اردگرد کے مکانوں سے بہت سی ہندو اور سکھ عورتیں بھی ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر یہ دلخراش منظر دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے بہتے آنسو خشک کرنے کے لیے اپنے پلو آنکھوں پر رکھ لیے تھے اور ان میں سے ایک عورت کو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر شدید کرب تھا اور وہ ایک ایک زائر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بے اختیار ہو کر اس نے ایک چیخ ماری اور پھر بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مجھے لگا یہ عورت ان میں سے ایک ہے جن کے پیٹ پھولے ہوئے ہیں اور آنکھیں تارے لگی ہوئی ہیں۔

دعا سے فراغت کے بعد سندھ یونیورسٹی کے ایک نوجوان نے مجھ سے کہا:

"یہاں آنے سے پہلے میں اکھنڈ بھارت کا قائل تھا اور سمجھتا تھا کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ میری گزارش ہے کہ آپ واپس جائیں تو یہ تجویز پیش کریں کہ جو لوگ اپنے دلوں میں پاکستان کے حوالے سے کچھ شکوک و شبہات رکھتے ہیں انہیں یہاں لا کر یہ کنوئیں دکھائے جائیں۔ یہ خونچکاں منظر نئی نسل کے ان افراد کو خصوصاً دکھائے جائیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان تاریخی عوامل کے بغیر بنا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جنم لینے والی نسل کے افراد یہ کنویں دیکھ کر جان جائیں گے کہ برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنے دارالامان پاکستان کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں اور وہ یہ بھی جان جائیں گے کہ اگر اس ملک پر آنچ آتی ہے تو تلواریں ایک بار پھر ہوا میں لہرائیں گی اور بہنوں کی چیخ و پکار اندھے کنوؤں میں دم توڑ دے گی"۔

اس سندھی نوجوان نے کہا:

”یہ کنویں ان بدنیت دانشوروں کو بھی دکھائیں جو پاکستانی قوم کے لیے یہ کنویں دوبارہ کھودنا چاہتے ہیں؛“

واپسی پر ہندو اور سکھ بچے ایک بارپھر ہماری بسوں کے گرد جمع ہو گئے تھے اور معصوم نگاہوں سے ہمارے مغموم چہروں کو دیکھ رہے تھے۔

میں نے ان میں سے تین چار سال کے ایک پیارے سے بچے کو گود میں اٹھایا اور اس کے گالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بزبانِ حال کہا:

”بیٹے! تم تو معصوم ہو، یہ کنویں بھی معصوموں کی لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں۔ اگر تاریک طوفانی راتوں میں تم ان کنوؤں سے چیخیں سنو تو ان پر کان ضرور دھرنا___ ہم یہ امانتیں تمہارے بڑوں کی بجائے تمہارے سپرد کر رہے ہیں کہ بچے اس دنیا میں خدا کے سفیر ہوتے ہیں!“

———❖❖❖———

# بھیرویں سے مالکونس تک

گزشتہ سال کے پہلے ہفتے میں جب میں ، بیدار اور انعام سرگودھا پہنچے تو گورنمنٹ کالج کے وسیع وعریض کیمپس کو عبور کرتے ہوئے بیدار اساتذہ کی رہائش گاہ میں سے ایک رہائش گاہ کے سامنے جار کے۔دروازے پر لگی بَیل پر انگلی رکھی جس پر ڈرائنگ روم کے دروازوں میں سے پہلا دروازہ کھلا اور پھر کسی نے جالی والے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا اس کے ساتھ ہی آواز آئی:

''اخاہ! بیدار صاحب،آپ ذرا برآمدے میں تشریف رکھیں۔میں ابھی حاضر ہوا''۔ اس پر بیدار نے مجھے کہا:

''یہ حضرت خلیل بدایوانی ہیں۔اسی کالج میں پرنسپل تھے۔حال ہی میں ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔بڑے وضعدار بزرگ ہیں۔یہ مہمانوں کے سامنے باقاعدہ تیار ہوکر آئیں گے،تبھی ہمیں انتظار کے لیے کہہ گئے،ہیں''۔

اور واقعی،جب خلیل بدایوانی تھوڑی دیر بعد دروازے میں سے نمودار ہوئے تو وہ تھری پیس سوٹ ٹائی اور ٹوپی میں ملبوس تھے۔انہوں نے ہمارے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور ہمارے ساتھ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے کہا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اس پر میں نے ایک نظر انہیں دیکھا.... منحنی سا جسم ،بوٹا سا قد ،آنکھوں پر چشمہ اور

چہرے پر معصومیت کی ریل پیل۔

بیدار نے میرے کان میں کہا:

"خلیل صاحب کو ہزاروں شعر یاد ہیں اور ایک نشست میں سینکڑوں شعر سنا ڈالتے ہیں۔ابھی تو انھوں نے صرف سٹارٹ لیا ہے"۔

حضرت خلیل بدایوانی نے ہمیں یوں سرگوشی کرتے دیکھا تو مسکرا کر بولے۔

عجب کچھ لطف دیتا ہے شب خلوت میں دل برسوں
سوال آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

بیدار بھی جواباً مسکرائے اور کہا:

"حضرت! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

اس پر حضرت خلیل بدایوانی نے ایک آہ بھری اور کہا:

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مرا مزاج!
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا!

بیدار نے یہ شعر سُنا اَن سُنا کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ خلیل صاحب سے ان کے پرانے تعلقات ہیں جس پر خلیل صاحب نے بڑی محبت سے ان کے بیان کی تصدیق کی اور پھر یہ شعر سنایا۔

اے ذوق! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

اس دوران مجھے اس بزرگ سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ اس بار میں نے انہیں براہ راست مخاطب کیا اور کہا:

"حضرت! آپ کو صرف دوسروں کے ہی اشعار یاد ہیں یا آپ خود بھی شعر کہتے

ہیں"۔

یہ سن کر حضرت خلیل بدایوانی نے تبسّم کیا اور فرمایا۔ ع

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری

وگرنہ شعر میرا کیا ہے، شاعری کیا ہے!

"آپ اتنی دیر سے تشریف فرما ہیں، آپ کی تواضع ہی نہیں کر سکا۔ میاں نشاط! ذرا ٹیپ ریکارڈ لیتے آنا۔ صبح کا وقت ہے۔ آپ بھیرویں سے تو شوق فرمائیں گے نا؟"

اور پھر ان کے صاحبزادے ٹیپ ریکارڈ اٹھالائے اور خلیل بدایوانی نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ موصوف اپنی غزل بھیرویں میں سنا رہے تھے، اس کے بعد انہوں نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور کہا "فی البدیہہ عرض کرتا ہوں۔"

لیکن انہوں نے ابھی کان پر ہاتھ رکھ کر پہلی تان ہی لگائی تھی کہ انعام کو چائے پیتے پیتے اچھو آ گیا اور وہ کپ میز پر رکھ کر باہر کو بھاگے۔ بیدار ان کے پیچھے تھے اور کچھ دیر بعد میں بھی باہر آ گیا۔

یہ عجیب اتفاق کہ ہم تینوں کو بیک وقت اچھو ہوا، تاہم چند لمحوں کے بعد ہم ایک ایک کر کے واپس آ گئے۔ حضرت خلیل کے چہرے پر وہی معصومیت کی ریل پیل تھی۔ "خلیل صاحب صرف شاعر ہی نہیں، موسیقار ہی نہیں بلکہ باغبانی، فلکیات، دست شناسی، علم ہیئت اور دیگر بہت سے علوم وفنون میں بھی دسترس رکھتے ہیں"۔ بیدار نے ہمیں بتایا۔

"اجی نہیں صاحب! یہ تو ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ بس اتنا ہے کہ ان علوم کا شوق رکھتا ہوں۔ گزشتہ دنوں میں نے ایک مسئلے پر حکومت کو خط لکھا کہ آپ ہیئت دانی کے حوالے سے میری خدمات حاصل کیجیے۔ تھرڈ کلاس میں اسلام آباد جاؤں گا۔ دال روٹی کھاؤں گا مگر فیس ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہوگی۔ اگر مستقبل میں میری بات درست ثابت ہوئی تو ڈیڑھ لاکھ روپیہ وصول کر لوں گا۔ بصورت دیگر یہ رقم لوٹا دوں گا مگر صاحب، اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تاہم میں نے جو نتیجہ اخذ کر کے اپنے طور پر قلمبند کیا تھا

صاحب، وہ لفظ بہ لفظ درست نکلا''۔

''بہت اچھے!''

میں نے ان کی گفتگو کے اختتام پر کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیا:

''ذرا ایک نظر اس پر بھی ڈال لیے اور بتایئے کہ عمر عزیز کے کتنے سال باقی رہ گئے ہیں؟''

''نشاط میاں! ذرا محدّب شیشہ لایئے!''

خلیل صاحب نے صاحبزادے کو آواز دی اور پھر انہوں نے میرا ہاتھ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ تاریخ پیدائش پوچھی۔ ایک کاغذ پر میرے دستخط لیے اور محدّب شیشے سے لکیروں کا معائنہ فرمانے کے بعد عینک اتار کر ایک طرف رکھ دی:

''صاحب! آپ اس سوال کے علاوہ کوئی اور سوال پوچھیے''۔ خلیل صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کہا۔

''کیوں؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''دراصل ایک دفعہ میں نے اپنے ایک دوست جو سول جج تھے، کا ہاتھ دیکھ کر بتایا تھا کہ اس مہینے تمہاری موت واقع ہو جائے گی۔ صاحب! خدا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی کہ اسی مہینے ان کی وفات کا تار موصول ہو گیا۔ آپ بھی اس مہینے ذرا احتیاط رہیں ویسے اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ خضر عطا کرے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ سن کر میرے پسینے چھوٹ گئے اور پھر میں نے ان سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کیا۔

باہر برآمدے میں مختلف پھولوں اور پودوں کے سینکڑوں گملے دھرے تھے۔ خلیل صاحب نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے چند پودوں کی ماہیت اور خاصیت کے بارے میں بتایا اور پھر ایک گملے میں سے ایک پتہ توڑتے ہوئے بیدار کو پیش کیا اور کہا:

''برگِ سبز است تحفہ درویش!''

بیدار نے اسے کوٹ میں سجانا چاہا تو خلیل صاحب نے کہا:

''نہ نہ صاحب! یہ لیونڈر کا پتہ ہے۔ اسے صرف سونگھیے۔ جب خوشبو کم ہونے لگے تو اس پر پانی چھڑکیے۔ یہ پھر سے خوشبو دینے لگے گا''۔

بیدار نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر رخصتی سے قبل ہاتھ ملاتے ہوئے پیشتر اس کے کہ وہ کوئی شعر پڑھتے، میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اور اس کے ساتھ ہی ہم ایک ایک کر کے کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نکل آئے کہ شام ہونے کو تھی۔ یعنی بھیرویں کے بعد اب مالکونس کا وقت قریب تھا۔

❖❖❖

# اُوپر، نیچے، درمیان

مری میں ابھی سیزن کا آغاز نہیں ہوا تھا مگر آج اتوار کی وجہ سے خاصی چہل پہل تھی۔ کچھ ''زائرین'' راولپنڈی کے تھے جو بھیگے ہوئے موسم کا مزہ لینے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے اور ایک بڑی تعداد اسلام آباد میں ''غیرملکی ڈپلومیٹس کی تھی جو اپنے بال بچوں سمیت یہاں نظر آرہے تھے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اور منصور قیصر کے ساتھ کشمیر پوائنٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے منصور قیصر سے کہا:

''میرے کان بند ہو چکے ہیں۔ کوئی نسخہ بتاؤ؟

منصور قیصر نے کہا:

''جب انسان بلندی پر پہنچتا ہے تو اس کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا، سو حیرانی کی کوئی بات نہیں''۔

اتنے میں کشمیر پوائنٹ کی طرف مڑتے ہوئے دائیں ہاتھ پر واقع دکانوں کی بالائی منزل سے بلند آہنگ نعرے سنائی دیے:

''زندہ باد''...... ''مردہ باد''۔

غالباً اوپر کوئی اجلاس ہو رہا تھا اور کارکن نعرے لگا رہے تھے۔

منصور قیصر نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''تمہیں تو یہ نعرے بھی سنائی نہیں دے رہے ہوں گے''۔

''نعرے سنائی دے رہے ہیں''۔ میں نے جواب دیا۔ ''مگر میں چھ ہزار فٹ کی

بلندی پر یہ نعرے سننے کے لیے نہیں آیا۔ آگے بڑھو"۔

اتنے میں لوگوں نے دکانیں بند کرنا شروع کر دی تھیں اور کاروں والے اپنی کاروں کے بارے میں متفکر نظر آنے لگے تھے۔ شاید اجلاس ختم ہونے کو تھا اور اب اس کے شر کا جلوس کی صورت میں مال پر آنے والے تھے۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کی اور کشمیر پوائنٹ کی طرف مڑ گئے __ دائیں ہاتھ ریلنگ پر ایک آٹھ نو سال کا گول مٹول بچّہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بیٹھا تھا۔ سینکڑوں فٹ نیچے وادی میں مٹی کے گھروندے نقطوں کی مانند بکھرے نظر آرہے تھے۔ بچّے کے چہرے پر ایک خاموش مسکراہٹ تھی اور وہ کیمرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ یہ کیمرہ ایک زردرُو جاپانی کے ہاتھ میں تھا جو اس بچّے کی تصویر بنانے میں مشغول تھا۔ "ٹِک" کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی بچّے کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ان امیر وادیوں کے غریب مکینوں کی مسکراہٹیں کیمرے کی ٹِک کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور پھر اس کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہیں۔

"سلیم! ہم تمہیں ایک تصویر ضرور بھیجیں گے"۔ جاپانی نے بچّے کو مخاطب کر کے سلیس اردو میں کہا: "ایک مہینے کے اندر اندر ضرور بھیج دیں گے"۔

اور پھر وہ کیمرہ گلے میں لٹکائے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

ہم بھی کچھ دور تک گئے اور پھر واپس آنے کا ارادہ کیا کہ بھوک نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔

اُترائی اترتے ہوئے سڑک کے برابر میں ایک پتھر پر بیٹھا ہوا ایک سفید ریش بزرگ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے سامنے آگیا۔ وہ چیتھڑوں میں ملبوس تھا۔ اس نے میلا چکٹ کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے سائز سے بڑا تھا۔ اس بزرگ کی عمر کوئی نوے برس کے قریب تھی۔ اس کے چہرے پر گہری جھریاں تھیں اور آنکھوں کے پپوٹے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ پتھر سے اٹھ کر اچانک ہمارے سامنے آیا اور اس نے اشعار پڑھنا شروع کر دیے:

ان کی گلی میں جاؤں تو چالان کا ہے ڈر
نوٹس لگا ہوا ہے، ادھر راستہ نہیں
دیکھو جفا یہ میرے تغافل شعار کی
کھڑکی کھلی ہوئی ہے مگر جھانکتا نہیں
مجنوں کے تن بدن پہ کوئی چھیتڑا نہیں
فراٌ نہیں ہے، کوٹ نہیں، جانگیہ نہیں

اس نے یہ اشعار اسی ترتیب سے سنائے تھے اور اس کے بعد اس نے ہمیں متعدد اشعار سنائے جن کا مطلع وہ شروع کی بجائے آخر میں پڑھتا تھا۔ ہم نے میلے چکٹ چیتھڑوں میں ملبوس، شکل وصورت سے بالکل گنوار، اس عمر رسیدہ پہاڑیے سے اردو کے یہ اشعار انتہائی عمدہ ادائیگی کے ساتھ سنے تو ششدر رہ گئے۔ ایک شعر اس نے یہ بھی سنایا:

روز کہتا ہے کہ دکھلا کوچہ قاتل مجھے
جُوتیاں کھلوائے گا اُلّو کا پٹھا دل مجھے

اور پھر دو سخنے، جن میں ایک یہ تھا:

وزیر کیوں نہ رکھا، انار کیوں نہ چکھا؟

دانا نہ تھا!

میں نے اپنی بڑھتی ہوئے حیرت پر قابو پایا اور پوچھا:

''بابا! آپ کا نام کیا ہے؟''

''مولانا فضل الدین!'' بابا کے لہجے میں افتخار کا پہلو تھا۔

''آپ کا شغل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں قرآن مجید کی تعلیم دیا کرتا تھا''۔

دریں اثناء بھوک مزید چمکنا شروع ہوگئی تھی، سومیں نے ''مصافحہ'' کرنے کے بعد چلتے چلتے پوچھا:

''بابا! آپ کی شادی ہوئی ہے؟''

''نہیں''۔ مولانا فضل الدین نے جواب دیا۔ ''ہم ملکیت کے قائل نہیں ہیں''۔

''مرحبا'' ریستوران میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی جو چھری کانٹوں سے لیس، مختلف میزوں کے گرد جمع تھے۔ ہم نے ریستوران کے آخری سرے پر ایک میز تلاش کی اور ابھی وہاں بیٹھنے ہی کو تھے کہ برابر والی میز سے ایک ننھی منی بچی نے جو اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی تھی، غیر ملکی لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہوئے کہا:

''یہ میز ہمارے لیے ریزرو ہے''۔

اس بچی کے خدوخال پاکستانیوں جیسے تھے۔

میں نے منصور قیصر سے کہا:

''یار! یہ بچی بالکل پاکستانی لگتی ہے''۔

''کیا مطلب؟'' منصور قیصر نے کہا۔ ''سچ مچ پاکستانی ہے۔ اس کے ساتھ اس کے والدین ہیں اور یہ میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہیں''۔

ہم یہاں سے ہٹ کر برابر میں خالی ایک اور میز پر بیٹھ گئے۔ دونوں میاں بیوی ہماری خالی کردہ میز پر آکر بیٹھ گئے تھے اور بچی سے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ میری نظر سامنے کی جانب اٹھی تو وہاں کشمیر پوائنٹ والا زردرُو جاپانی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور پوری محویت سے ایک اردو اخبار پڑھنے میں مشغول تھا۔

میری نشست ریستوران کے مرکزی راستے کے بالمقابل واقع تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلتا تھا اور خوشبو کے جھونکے روح میں سرایت کر جاتے تھے ڈاکٹر صفدر محمود کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ جب انہوں نے دھنک رنگ بکھرتے دیکھے تو

کہا:

''آؤ'' سیٹ بدل'' بھائی بن جائیں''۔

''آئی ایم سوری''۔ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔''میں جس کرسی پر ایک دفعہ بیٹھ جاؤں، وہاں سے اٹھا نہیں کرتا''۔

منصور قیصر کی پشت بھی دروازے کی تھی اور اس کی گردن میں بل پڑ گئے تھے۔ وہ اب بھی گردن موڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چھ ہزار فٹ کی بلندی سے واپس نشیب کی طرف جاتے ہوئے میرے کان ایک بار پھر بند ہونا شروع ہو گئے تھے۔ صفدر محمود اور منصور قیصر باتیں کر رہے تھے اور میں پوری طرح ان کی بات سمجھے بغیر یوں ہی سر ہلا دیتا تھا۔

میں غالباً ان لوگوں میں سے ہوں جن کے کان بلندی پر پہنچ کر بھی بند ہو جاتے ہیں اور پستیوں کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کی سماعت جواب دے جاتی ہے۔ میں نے اس موقع پر اپنے ایک دوست کی بتائی ہوئی ترکیب آزمانے کے لیے حلق میں تھوک جمع کیا اور پھر اسے نگل لیا جس سے تھوڑی دیر کے لیے مجھے آوازیں سنائی دیں مگر کچھ ہی دیر بعد کان پھر بند ہو گئے۔ اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ یہی عمل دہراتا رہا لیکن اب اس کا نتیجہ تھوک نگلنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

# شہزادے اوئے!

لاہور سے پنڈی جانے والی ریل کار میں وہی میلی سفید وردی میں ملبوس کھچڑی بالوں والا زردرُو بیرا تھا اور وہی کلف لگے ہوئے مسافر تھے۔ گاڑی سٹیشن سے باہر نکلی تو کچھ ہی دیر بعد کھچڑی بالوں والے بیرے نے آرڈر لینے شروع کر دیے اور پھر اس نے نشستوں کے بازوؤں میں ٹرے کے لیے بنے ہوئے سوراخوں میں ماچس کی تیلی پھنسا کر ٹرے سجانے شروع کر دیے۔

میری پچھلی نشست پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا جو اپنی چار سالہ گڑیا سی بیٹی کے ساتھ مسلسل انگریزی بولنے میں مشغول تھا۔ یہ گڑیا بھی انگریزی بولتی تھی۔

میرے دائیں ہاتھ والی سیٹ پر دو ''جوان جہان'' لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کے بال کٹے ہوئے تھے او دوسری نے اپنے گھنے ریشمی بال شانوں پر پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی کی لمبی لمبی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ تھا جسے تھوڑی دیر بعد وہ ہونٹوں سے لگا لیتی تھی۔ یہ دونوں پاکستانی لڑکیاں بھی انگریزی ہی میں ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھیں۔

ان سے اگلی نشست پر ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے تھے۔ وہ سب سے بے نیاز پوری محویت کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ لگتا تھا نئی نئی شادی ہوئی ہے یا پھر یہ کہ نہیں ہوئی ہے۔

مجھ سے اگلی نشست پر ایک گھریلو قسم کی عورت نے ساتھ والی نشست پر اپنے چھ سات ماہ کے بچے کو کمبل میں لپیٹ کر لٹایا ہوا تھا اور خود بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھی۔ اس کے آگے

اس خاتون کا شوہر دو شریر قسم کے بچوں کو قابو کیے ہوئے تھا۔ یہ گٹھے ہوئے جسم والا شخص تھا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا مگر چہرہ کھر درا تھا۔ اس کے آگے دروازے تک پھیلی ہوئی نشستوں پر متعدد مسافر بیٹھے تھے جن میں سے بیشتر اپنی فیملی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

شیشے والے دروازے کے آگے دائیں بائیں واقع غسل خانوں کے بعد ایک کیبن تھا جس پر ڈیوٹی پر مامور ریلوے کا ایک ملازم ٹیوب لائٹوں سے منور اس کمپارٹمنٹ کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں مضبوطی سے بند دروازے کا شیشہ چیرتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھیں اور پھر اپنی مرضی کے کسی چہرے کے ساتھ چپک جاتی تھیں۔

کمپارٹمنٹ میں خاصی خاموشی طاری تھی۔ یہاں گاڑی کا شور بھی ''سنسر'' ہو کر پہنچتا تھا۔ لوگ ہونٹوں کو بھینچ کر چائے پینے میں مشغول تھے۔

''سموکر'' لڑکی اور اس کی ساتھی نے اپنے لیے کوک منگوایا تھا اور وہ ہولے ہولے ''سپ'' کر رہی تھیں۔

گٹھے ہوئے جسم اور کُھر درے چہرے والے شخص نے اپنے دونوں بیٹوں کو زبردستی اپنے دونوں طرف بٹھایا ہوا تھا۔ وہ خود چائے پی رہا تھا اور انہیں اپنے بیگ میں سے کیلے نکال نکال کر کھلا رہا تھا۔ ان میں سے بڑے بچے کی عمر کوئی چار پانچ سال تھی اور وہ ''دندبوڑا'' تھا اس کے چہرے پر وہ حُسن تھا جو قدرت نے تمام بچوں کو یکساں طور پر عطا کیا ہے چھوٹا بچہ کوئی تین سال کا تھا اور وہ بھی بہت پیارا تھا۔

دروازے کے پاس والی نشست سے پھُندنے والی ٹوپی پہنے ایک بچہ غالباً اپنے چاروں طرف ''کمپوز'' ہو کر بیٹھے ہوئے لوگوں سے اکتا کر اٹھا اور ان دو بچوں کے برابر میں آن کھڑا ہوا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ''خیر سگالی'' کے جذبات کے اظہار کے ساتھ غالباً انہیں کھیلنے کی دعوت بھی دے رہا تھا۔

یہ دیکھ کر دونوں بچے اپنی جگہ سے اٹھے مگر ان کے باپ نے انہیں مضبوطی سے بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ یاسر نے اپنے ننھے منے بازو میرے گلے میں ڈال دیے اور

کہا:

''ابو! میں کھیلوں''۔

میں نے اس کے گالوں پر بوسہ دیا اور اسے بچے کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ دیا۔ عمر نے خود ہی گلے میں پڑی چوسنی پکڑ کر منہ میں ڈال لی تھی اور اب وہ شہناز کی گود میں سر رکھ کر سو گیا تھا۔

کھچڑی بالوں والے بیرے نے ٹرے اور برتن واپس اپنی جگہ رکھ دیے تھے اور وہ کمپارٹمنٹ سے باہر چلا گیا تھا۔

لوگ اسی طرح ''کمپوز'' ہو کر بیٹھے تھے۔

یاسر اور پُھندنے والی ٹوپی والا بچہ معصوم معصوم سے کھیلوں میں مشغول تھے مگر اردگرد کے ماحول کے تناؤ کے باعث ان کی شوخیاں کچھ دبی دبی سی تھیں۔

گٹھے ہوئے جسم والے شخص پر کچھ غنودگی سی طاری تھی، چنانچہ اس نے آرام دِہ نشست کو پیچھے کی طرف سرکا لیا تھا اور اب وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا۔ چھوٹا بچہّ چپکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑ کر ان بچوں کے پاس پہنچ گیا۔ گھٹے ہوئے جسم والا شخص ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس نے تصنّع سے بوجھل فضا کا سکوت توڑتے ہوئے بھاری بھر کم آواز میں خالص لاہوری انداز میں اپنے بچے کو آواز دی:

''شہزادے اوئے!''

بچّے نے باپ کی طرف دیکھے بغیر اپنی پیشقدمی جاری رکھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ پھندنے والی ٹوپی والے بچّے کے پاس پہنچتا، گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے اسی انداز میں اس بچے کی ماں کو آواز دی:

''اپنے بچے کو اپنے پاس بُلا لیں، شہزادہ ''چک'' کاٹتا ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر پورے زور سے آواز لگائی:

""شہزادے اوئے!""

مگر شہزادے نے پھندنے دار ٹوپی والے بچے پر اپنے دانت گاڑ دیے تھے۔

بچے نے جواب میں چیخنے کی بجائے اسے پکڑ کر زور سے پرے دھکیل دیا اور پھر وہ دونوں ہنسنے لگے۔

انہیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا اور ہنستے دیکھ کر بہت سے بچوں نے اپنی نشتوں سے ان کی طرف جھانکا اور پھر اپنی ماؤں سے بازو چھڑا کر وہ بھی ان میں شامل ہو گئے۔

کمپارٹمنٹ کی غیر فطری فضا کو فطرت کے ان معصوم نمائندوں نے زندگی کی رونق سے مالا مال کر دیا تھا۔

شہزادہ، بچوں کو باری باری ""چک"" کاٹنے کی کوشش کرتا تھا۔ جواب میں وہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے تھے۔

گٹھے ہوئے جسم والے شخص نے یہ دیکھ کر آخری دفعہ زور سے آواز لگائی:

""شہزادے اوئے!""

اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے نشست کے ساتھ ٹیک لگا لی!

# آدھی رات کا سفر

تیز گام کراچی سے دوڈھائی سو میل دور نکل آئی تھی اور پوری رفتار سے لاہور کی جانب رواں تھی۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ گزشتہ پانچ گھنٹے کے دوران میں اور امجد دنیا جہان کے موضوعات پر گپ شپ لگانے کے بعد نڈھال ہو چکے تھے۔ تازہ لطیفوں کا سٹاک بھی ختم ہو چکا تھا اور رسائل وجرائد کی ورق گردانی کا ''دور'' بھی ہم نے مکمل کر لیا تھا۔ بحری قزاقوں جیسے حلیے والا ویٹر کھانے اور چائے کے برتن سمیٹ کر کب کا جا چکا تھا۔ ہم نے جب اسے بل ادا کرنا چاہا تو اس نے کہا کہ وہ اکٹھا ہی وصول کر لے گا۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ انہوں نے ابھی صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بھی اسی ٹرین میں کھانا ہے۔

اب میری آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی۔ امجد بھی سونا چاہتا تھا کیونکہ اس دوران وہ اپنی ''زلفوں'' کی طرف سے بے پرواہ ہو چکا تھا۔ شام کو ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے اس نے اپنے سر کے عقبی حصے پر موجود چند بالوں کو گھیر گھار کر پورے سر پر مساوی طور پر تقسیم کیا تھا مگر اب یہ بال اپنے ''بال بچوں سمیت'' واپس اپنی جگہ پر چلے گئے تھے۔

امجد نے عینک بھی اتار دی تھی اور اب وہ نیند کے غلبے کے باعث اپنی چندھیائی چندھیائی آنکھوں کو مل رہا تھا۔

''اچھا عزیزی خدا حافظ!'' اس نے ایک ضخیم رسالے کو سرہانے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کروٹ لی کہ علم ہی اس نوجوان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور پھر نچلی نشست کی بتی گل کر دی۔

''خدا حافظ''۔ میں نے ایک نظر اپنے ''کوپے'' کے دروازے پر لگی چٹخنی چیک کرنے کے لیے وہاں ڈالی اور پھر اپنی اوپر والی نشست کی بتی گُل کرنے کے لیے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر بٹن میں کوئی نقص تھا جس کی وجہ سے بتی بند ہونے سے انکاری تھی، چنانچہ میں نے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی اور ٹانگیں بتی والی سائیڈ کی طرف دراز کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں محوِ خواب تھا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہمارے ''کوپے'' کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ مجھے کسی انجانے خطرے کا احساس ہوا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا میں نے گھڑی دیکھی تو گیارہ بجے تھے۔ تیز گام رات کے سناٹوں کی چیرتی ہوئی کسی غیر آباد علاقہ سے گزر رہی تھی۔

دروازے پر دستک ایک بار پھر سنائی دی مگر اس دفعہ دستک برابر والے ''کوپے'' پر دی گئی تھی۔ میں نے امجد کو آواز دی مگر وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔

میں اپنی برتھ سے اتر کر نیچے آیا اور امجد کو بازو سے ہلا کر جگاتے ہوئے کہا:

''آنکھیں کھولو! باہر راہداری میں کوئی ہے''۔

امجد نے آنکھیں کھولے بغیر دوسری طرف کروٹ لی اور کہا:

''سو جا کشمیری پُتر! سو جا، کوئی نہیں ہے''۔

پیشتر اس کے میں کچھ کہتا ایک بار پھر کسی نے زور زور سے ہمارے ''کوپے'' کا دروازہ کھٹکھٹایا جس پر امجد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا:

''کون ہے؟''

مگر آگے سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''میں پوچھتا ہوں کون ہے؟'' اس بار امجد نے اپنی آواز میں گھن گرج پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زور سے کہا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

مجھے اپنے جسم میں سوئیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے امجد سے کہا:

''زنجیر کھینچ دو''۔

میں نے یہ بات اتنی بلند آواز میں کہی کہ باہر کھڑے شخص کے کانوں تک بھی پہنچ سکے۔

''نہیں! کوئی ضروری نہیں!! جو کوئی بھی ہے خود ہی چلا جائے گا''۔ امجد نے کہا۔

اس کے بعد جب کافی دیر تک کوئی کھڑاک سنائی نہ دیا تو میں اور امجد دوبارہ اپنی اپنی برتھوں پر لیٹ گئے مگر اب نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔

''یار یہ کون بے ہودہ آدمی ہے؟'' امجد نے مجھ سے کہا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ ''چلو دفع کرو، سو جاؤ'' اور ایک بار پھر کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ میں نے بھی بتی کی طرف ٹانگیں پھلائیں اور چت لیٹے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

ہم دونوں نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں مگر جاگ رہے تھے۔ اچانک امجد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی نشست پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پھرتی سے اپنے سرہانے کی بتی جلائی اور کہا:

''عطا! اب وہ کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ تم یہ ہاتھ دیکھ رہے ہو؟''

میں نے جلدی سے اپنی برتھ سے چھلانگ لگائی اور نیچے کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنے شیشے کے ساتھ ناک چپکا کر دیکھا تو ایک مضبوط ہاتھ چلتی ٹرین سے باہر لہرا رہا تھا۔ باہر جو کوئی تھا اس کی شکل نظر نہیں آرہی تھی؛ البتہ وہ ہاتھ کی انگلیوں سے ''کوپے'' کی چٹخنی کھولنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بار پھر یہ ہاتھ شیشے کی طرف بڑھا اور اس نے زور زور سے شیشہ تھپتھپانا شروع کر دیا۔

''یار یہ کون ہے؟'' امجد نے جھنجھلا کر ایک بار پھر کہا۔

''مجھے تو یہ وہی بیرا لگتا ہے''۔ میں نے جواب دیا۔ ''اس کی گول آستین دیکھو۔

سفید یونیفارم کا حصہ ہے‘‘۔

میں نے اور امجد نے اپنے ناک شیشے کے ساتھ چپکائے ہوئے تھے اور ایک انچ کے فاصلے پر کھلی آستین والا ہاتھ اندھیروں میں لہراتا دیکھ رہے تھے۔ میرے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بُوندیں ابھر آئیں۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور انہیں اس میں جذب کر لیا۔

’’مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ شخص جو باہر دروازے سے لٹکا ہوا ہے اس کا ہاتھ کھڑکی تک کیسے پہنچ گیا کیونکہ یہ تو خاصے فاصلے پر واقع ہے‘‘۔ میں نے کہا۔

’’ایسی کوئی بات نہیں، پہنچ سکتا ہے۔ ویسے بھی چوروں کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں‘‘۔ امجد نے سخت کھنچاؤ کی کیفیت کو کم کرنے کے لیے شگفتہ انداز میں جواب دیا مگر میری طرح وہ بھی یقیناً اس صورت حال سے سخت پریشان تھا۔

وہ ہاتھ ایک بار پھر شیشہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

’’دفعہ ہو جاؤ سؤر کے بچے!‘‘ امجد نے جھنجلاہٹ کے عالم میں چیخ کر کہا۔ مگر اس کی آواز میں چلتی ٹرین کے شور اور دبیز شیشے کی وجہ سے اس چھوٹے سے کمرے میں گھُٹ کر رہ گئی۔

’’اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ زنجیر کھینچ دی جائے‘‘ میں نے امجد سے کہا اور پھر خود ہی برابر میں لگی زنجیر کو زور سے اپنی طرف کھینچ دیا۔

ٹرین میں بریکیں لگنا شروع ہو گئیں۔ پھر ٹرین کی رفتار کم ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ٹرین ایک جنگل میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے شیشے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سفید آستین والا ہاتھ غائب ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد اس ایئر کنڈیشنڈ بوگی کے بیرونی دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ بعد ازاں کچھ لوگ اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے راہداری میں داخل ہوئے۔ ہمارے ’’کمرے‘‘ کے باہر پہنچ کر کچھ دیر کے لیے رُکے اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے

وہ واپس جارہے ہیں۔ چند ثانیوں بعد بوگی کے دروازے کھڑاک سے بند ہو گئے اور گاڑی ایک بار پھر فراٹے بھرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن ہوگئی۔

''یہ کیا بات ہے؟'' امجد نے حیرت سے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''یہ لوگ ہمارے دروازے کے قریب پہنچ کر فوراً لوٹ گئے۔ انہوں نے ہم سے زنجیر کھینچنے کی وجہ ہی نہیں پوچھی''۔

''یار مجھے تو یہ سارا معمہ ہی سمجھ نہیں آرہا''۔ میں نے روہانسا ہو کر کہا۔

''چلو چھوڑو۔ لعنت بھیجو''۔ امجد نے جواب دیا۔

''اب ذرا ریلیکس ہو جاؤ۔ وہ اگر کوئی ڈاکو بھی تھا تو یقیناً یہاں اتر گیا ہوگا''۔

''وہ یہاں اترا نہیں بلکہ پھر سے ٹرین میں سوار ہو گیا ہوگا''۔ میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ اسی ٹرین کا بیرا تھا۔ تم نے اس کی سفید گول آستین نہیں دیکھی؟''

ہاں یار یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو''۔ امجد نے یہ فقرہ یوں ادا کیا کہ لگتا تھا وہ صوتحال کے کھینچاؤ سے نکل آیا ہے۔ ''تبھی وہ شام کو کہہ رہا تھا کہ وہ بل اکٹھا ہی وصول کر لے گا''۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''باقی باتیں چھوڑو'' میں نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ ''آج اسی بہانے میری زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش پوی ہوگئی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''چلتی گاڑی میں زنجیر کھینچنے کی خواہش، بچپن میں کئی دفعہ اپنی یہ خواہش پوری کرنے کی کوشش کی مگر ادرگرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیا''۔

''کہیں یہ سارا ڈرامہ تمہی نے زنجیر کھینچنے کے لیے تو نہیں رچایا تھا''۔ امجد نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہیں ابھی تھوڑی دیر کو پتہ چل جائے گا"۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی کسی سٹیشن پر رُکی تو میں نے کوپے کا دروازہ کھولا اور باہر راہداری میں آ گیا۔ راہداری میں کنٹین کا عملہ سویا ہوا تھا۔ میں ان سے بچ کر گزرتا ہوا بوگی کے منیجر کے پاس گیا اور اس سے سارے واقعے کی تفصیل بیان کی۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ دراصل ایک دوسری بوگی کے بیرے کو کسی مسافر کے لیے دودھ کی تلاش تھی، لہٰذا وہ ایک بوگی میں سے دوسری بوگی کو ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا۔ چنانچہ وہ آپ سے دودھ کا پتہ کرنے کے لیے دروازہ اور پھر باہر کی جانب سے کھٹکھٹا تا رہا ہے۔

لیکن مینیجر کی اس وضاحت سے میری تسلی نہ ہوئی، چنانچہ میں نے اسے ساتھ لیا، اور اس کی مدد سے اس بیرے کو تلاش کیا۔ میری نظر سفید یونیفارم میں ملبوس اس بیرے کے گول آستین والے ہاتھ پر ٹھہر گئی مگر یہ بحری قزاق ایسے حلیے والا بیرا نہیں تھا جس نے ہمیں رات کا کھانا اور چائے "سرو" کی تھی بلکہ کوئی اور تھا۔ میں نے اس سے ذرا پوچھ گچھ کی تو وہ گھبرا گیا وہ گڑگڑایا:

"جناب مجھے معاف کریں"۔

"تو کیا تم نے اسے معاف کر دیا؟" اپنے "کوپے" میں واپسی پر امجد نے یہ رُوداد مجھ سے سنی تو پوچھا۔

"ہاں"۔

"وہ کیوں؟" امجد نے کہا۔

"وہ اس لیے کہ ابھی آدھی رات اور آدھا سفر باقی ہے اور میں دریا میں رہتے ہوئے اس مگر مچھ سے بَیر نہیں چاہتا۔ باہر گھپ اندھیرا ہے اور سب سوئے ہوئے ہیں۔ میں تو اپنے اس ائیر کنڈیشنڈ آرام دہ سفر کو بدمزہ نہیں کروں گا۔ میری مانو تو تم بھی اچھے بچوں کی طرح سب کچھ ذہن سے جھٹک کر صرف اپنا سفر خوشگوار بناؤ، لٹیروں کے منہ نہ لگو۔

شاباش!"

اور پھر میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کردیں!

اور پھر اس کے بعد خود پہ سو بار لعنت بھیجی!

# محمد حسین کی دُوسری ہجرت

جہاز نے دوبئ کے لیے ٹیک آف کیا تو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے دیہاتی نوجوان کی آنکھیں تارے لگ گئیں۔ جہاز جوں جوں اوپر کی طرف جارہا تھا اس کی آنکھیں باہر کو ابلتی جارہی تھیں۔

وہ تازہ سِلے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تھا جس کی دُھلائی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی، چنانچہ اس کی قمیض اور شلوار پر دھاگوں کے ٹوٹے ابھی تک چمٹے ہوئے تھے۔ وہ تلاش روزگار میں بیرون ملک جارہا تھا او وضع قطع سے سو فیصد ''دوبئ چلو'' ڈرامے کا کردار لگتا تھا۔ اس کے پاؤں میں دیسی گھی کا ڈبہ پڑا تھا اور جب جہاز نے بندے دے پُتروں کی طرح پرواز شروع کی تو اس کے ہوش کچھ کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے ایک پوٹلی میں سے پنجیری نکال کر مجھے پیش کی۔

اس کا نام محمد حسین تھا!

اس کے برابر میں بھی ایک سفید پوش بوڑھا دیہاتی بیٹھا تھا جسے غالباً بیرونِ ملک موجود اس کے کسی بیٹے نے ملنے کے لیے بلایا ہوگا۔

محمد حسین آنکھوں کی پتلیاں تو واپس اپنی جگہ پر آگئی تھیں مگر وہ خاصا بے چین اور مضطرب نظر آتا تھا اور اپنا ایک ہاتھ بار بار اپنی جھولی کی طرف لے کر جاتا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کروٹ بھی بدلتا اور اپنی حرکات و سکنات کے دوران کنکھیوں سے مجھے یوں

دیکھتا جیسے مجھ سے کچھ چھپانے یا کچھ بتانے کی کش مکش میں ہو مگر تا حال کسی فیصلے پر نہ پہنچ پایا ہو کہ آیا اپنی پریشانی کا اظہار کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے! دریں اثنا اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اپنی جھولی میں ڈالا اور بالآخر وہ ایک فیصلے تک پہنچ گیا۔

''صاحب جی!'' اس نے جھینپتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ پٹہ تو کھول دیں۔ مجھ سے کُھل نہیں رہا''۔

میں نے اس کی کمر کی طرف دیکھا تو سیفٹی بیلٹ اپنی پوری سختی کے ساتھ اس کی کمر میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس نے میری پیروی میں یہ ''پٹہ'' باندھ تو لیا تھا مگر اب کھولنے میں اسے اس طرح دشواری پیش آ رہی تھی جس طرح اکثر شریف آدمیوں کو اس ضمن میں پہلی بار پیش آتی ہے۔

میں نے جب ہاتھ کی ایک ذراسی جنبش سے اس کی یہ مشکل رفع کر دی تو وہ خاصا حیران ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے ایک عظیم ''سائنسدان'' سمجھا ہوگا۔

فضائی میزبانوں نے اپنے مہمانوں کے لیے کھانا چننا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے اس رفیق سفر کو ''ایمبریسمنٹ'' سے بچانے کے لیے اگلی نشست سے لگی ٹرے کا بٹن کھولا تو یہ ایک چھوٹی سی ٹرے کی صورت میں اس کے سامنے بچھ گئی۔ وہ میری اس ''سائنسدانی'' پر یقیناً ایک بار پھر حیران ہوا ہوگا۔

کھانے میں جو کچھ تھا، وہ محمد حسین خاصی بے دلی سے چبا رہا تھا۔ اس دوران اس نے اپنے پاؤں میں دھرے ٹفن کیریئر کی طرف دو ایک دفعہ ہاتھ بھی بڑھایا جس میں یقیناً گندلوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی ہوگی مگر وہ ہر دفعہ رک گیا۔ شاید وہ ایک اور ''ندامت'' کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے باریش دیہاتی بزرگ بھی کچھ اسی کی طرح یہ کھانا زہر مار کر رہے تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد بھی جب کچھ دیر تک فضائی میزبانوں نے ادھر کا رُخ نہ کیا تو اس بزرگ نے کچھ فاصلے پر سے گزرتی ہوئی ایک ائیر ہوسٹس کو ہاتھ کے

اشارے سے بلایایا اور پھر بآوازِ بلند کہا:

''کُڑیے! اے بھانڈے تے چک کے لے جا!'' (لڑکی! یہ برتن تو اٹھا کر لے جاؤ)۔

اس دوران میں نے اکتاہٹ کے عالم میں ایک جمائی لی اور کافی کا انتظار کرنے لگا میں اگر چہ محمد حسین سے پہلی بار متعارف ہوا تھا مگر میرے لیے یہ شخص نیا نہیں تھا۔ میں نے کئی برس قبل میونخ کی ''بابے دی ہائم'' میں محمد حسین جیسے اپنے بے شمار ہم وطنوں سے ملاقات کی تھی۔

جرمنی میں ''ہائم'' ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں بے شمار لوگ ایک چھت تلے رہتے ہوں اپنے اپنے گھروں سے روزگار کی تلاش میں نکلے ہوئے ہزاروں پاکستانی میونخ کی اس نوع کی ہائموں میں اپنے اپنے گھروں سے بھی بدتر حالات میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی سہولت کے لیے ان ہائم کے نام تجویز کر رکھے تھے۔ کسی کو وہ ''چاچے دی ہائم'' اور کسی کو ''مامے دی ہائم'' کہتے تھے، جو ہائم میں نے دیکھی تھی اس کا نام ''بابے دی ہائم'' تھا۔ وہ شہر میں دن بھر محنت مزدوری کرتے اور رات کو ''بابے دی ہائم'' میں قطار اندر قطار بچھی چارپائیوں پر باری باری آ کر سو جاتے اور سکھ کے سپنے دیکھتے۔

میں نے ان سب کی کہانیاں سنی تھیں۔ ان کے سروں پر کتنی ذمہ داریاں تھیں اور وہ کن حالات میں ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ میں نے ان کی زبان سے سنا تھا۔ یہ بہت دلخراش کہانیاں تھیں اور ایک دلخراش کہانی محمد حسین کی صورت میں اس وقت بھی میرے ہمرکاب تھی، چنانچہ اس سے گفتگو کے نتیجے میں مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی۔ اگر معلوم ہوا تو یہی کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔ سات بن بیاہی جوان بہنوں کا وہ اکلوتا بھائی ہے جن کی عمریں ڈھلنا شروع ہو گئی ہیں۔ ماں محنت مزدوری کرتی ہے اور اب اس نے پیسہ پیسہ جوڑ کر ادھر اُدھر سے جمع کر کے اپنے بیٹے کو باہر بھجوانے کا انتظام کیا ہے۔ وہ اپنے جگر سے اپنے ٹکڑے کو علیحدہ کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

دوبئ اب دور نہیں تھا، چنانچہ جہاز اب آہستہ آہستہ بلندی سے پستی کی طرف آ رہا تھا محمد حسین نے ایک ہجرت ۱۹۴۷ء میں کی تھی اور اُس کی دوسری ہجرت کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک جاری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس کی ہجرت اپنی روحانی ضرورتوں کے لیے تھی جبکہ اس کی دوسری ہجرت کا تعلق اس کی معاشی ضرورتوں کے تحت ہے۔ اس کے نبی ﷺ نے مکہؔ سے مدینہ کی طرف صرف ایک ہجرت کی تھی اور دین اور دنیا کے مقاصد کی تکمیل ہوگئی تھی۔

جوں جوں جہاز پستی کی طرف جاتا محمد حسین کا دل ڈوبنے لگتا۔ اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ ہولے ہولے وِرد کر رہا تھا:

"لاالٰہ الاّ انت سبحانك انیّ کنت من الظّٰلمین۹"

# شیر اور مکھیاں

آج ہم نے پندرہ بیس مکھیوں کو اچھرے سے لبرٹی مارکیٹ تک اپنے موٹر سائیکل پر ''لفٹ'' دی ہے۔

گزشتہ روز پٹرول کی ٹینکی پر آئس کریم کا 'شیرا'' گر گیا تھا جو سوکھ جانے پر ٹینکی کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا؛ چنانچہ آج جب ہم نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی تو ٹینکی پر پندرہ بیس مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے ایک دفعہ انہیں ہاتھ سے اڑانے کی کوشش کی مگر وہ صرف ایک لمحے کے لیے فضا میں بلند ہوئیں اور اس کے بعد دوبارہ ٹینکی پر بیٹھ گئیں ہم نے جانا کہ یہ سیر و تفریح کے موڈ میں ہیں اور ایک چکر لبرٹی کا لگانا چاہتی ہیں، سو چپ رہے اور موٹر سائیکل کا رُخ فیروز پور روڈ کی طرف موڑ دیا۔

فیروز پور روڈ سے نہر کی طرف جاتے ہوئے ہم نے ایک نظر ٹینکی پر ڈالی۔ مکھیاں ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے فرحاں و شاداں بیٹھی غالباً گپ شپ میں مشغول تھیں ہمارا خیال تھا کہ چلتے موٹر سائیکل پر ہوا کے تھپیڑوں کی وجہ سے یہ اڑ جائیں گی مگر انہوں نے اپنے پاؤں مضبوطی سے ٹینکی پر جمائے ہوئے تھے اور ان پر ہوا کے تھپڑوں کا کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا بلکہ ہمیں تو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے خوشگوار ہوا نے ان کے موڈ خوشگوار کر دیے ہیں اور اب وہ یہاں سے ''نقل مکانی'' کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔

نہر کے قریب ٹریفک سگنل کے سرخ ہونے کی وجہ سے ہم رُکے تو مکھیاں اسی طرح ٹینکی کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں۔ ہمیں کچھ گھِن سی محسوس ہوئی اور ہم نے انہیں ہاتھ سے اڑانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں صرف چار پانچ مکھیاں اُڑیں مگر دریں اثنا ان کی جگہ چار پانچ مکھیاں اور آ کر بیٹھ گئیں۔ اتنے میں سگنل بند ہو گیا تھا ہم نے ایکسی لیٹر دیا اور

چکیاں موڑ کی طرف گامزن ہو گئے۔

چکیاں سے لبرٹی مارکیٹ والی سڑک کی طرف مڑتے ہوئے ہم نے موٹر سائیکل آہستہ کیا اور ایک دفعہ پھر مکھیاں اڑانے کی کوشش کی کیونکہ جس ''خدا ترسی'' کے جذبے کے تحت ہم نے انہیں لفٹ دی تھی، وہ مدھم پڑ گیا تھا اور اس کی جگہ اب گھن نے لے لی تھی لیکن اس بار بھی یہی ہوا کہ چار پانچ مکھیاں اڑ گئیں اور ان کی جگہ چار پانچ دوسری مکھیوں نے لے لی۔ وجہ ظاہر ہے کہ ٹینکی کے ساتھ شیرا بدستور لگا ہوا تھا لہٰذا ہم نے صبر شکر کیا اور بڑے ''راؤنڈ اباؤٹ'' سے موٹر سائیکل کا رخ لبرٹی مارکیٹ کی طرف موڑ دیا۔

یہاں ہماری طرح اور بھی بہت سے لوگ اپنی کاروں اور موٹر سائیکلوں سمیت ایک سنیک بار کے گرد جمع تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ہماری طرح ان میں سے بھی بیشتر کے ساتھ مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ کچھ وقت ہم نے یہاں گزارا اور پھر اپنی مکھیوں کو لے کر واپس گھر کی طرف چل پڑے رستے میں جب بھی ہم نے انہیں اڑانے کی کوشش کی، ہر بار یہی ہوا کہ کچھ مکھیاں اڑ گئیں مگر ان کی جگہ فوراً دوسری مکھیوں نے لے لی۔ سو گھر پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پانی کی بالٹی لیکر موٹر سائیکل دھونے بیٹھ گئے اور ٹینکی پر لگے شیرے کو اچھی طرح صاف کر دیا تا کہ نہ کہیں شیرا لگا ہوا ہو نہ اس پر مکھیاں بیٹھیں۔

اور اس وقت سے ہم یاروں دوستوں کے لیے دردسر بنے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے کوئی دکھڑا روئیں، ہم اس کے جواب میں انہیں ایک ہی نسخہ بتاتے ہیں کہ شیرا صاف کر دو۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ دفتروں میں کام نہیں ہوتا۔ شکایت کرو تو اہل کار کھانے کو دوڑتے ہیں۔ ہم بتاتے ہیں کہ شیرا صاف کر دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جان و مال محفوظ نہیں۔ جرائم پیشہ عناصر دیدہ دلیر ہو گئے ہیں ہم کہتے ہیں یہ شیرے کی وجہ سے ہے۔ اسے صاف کر دو۔ دوست کہتے ہیں کہ کرپشن نے ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ فساد بھی شیرے ہی کی وجہ سے ہے۔ اس کی موجودگی میں تم پرانی مکھیاں اڑاتے رہو گے اور نئی مکھیاں ان کی جگہ لیتی رہیں گی۔ بس یہ شیرا دھو ڈالو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا!

# بجلی بند

رات کے گیارہ بجے تھے۔فلیمنگ روڈ پر گھپ اندھیرا تھا۔میں نے اپنے ایک دوست کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو مکان کی چھت پر سے ایک بچّے نے جھانکا۔اس نے قمیض اتاری ہوئی تھی:

''ماموں گھر پر نہیں ہیں۔وہ کہہ گئے تھے کہ جب بجلی آئے گی میں آؤں گا۔''

یہ سن کر میں نے موٹر سائیکل سامنے واقع پان سگریٹ کی دکان پر کھڑا کیا اور سیٹ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

عام حالات میں ٹیوب لائٹوں سے جگمگ کرتی یہ دکان اِس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔یہاں صرف ایک موم بتی روشن تھی جس کی روشنی میں دکاندار کھرے اور کھوٹے سکے میں پہچان کرنے کی کوشش کرتا تھا۔دکان کے چاروں کونوں میں لگے آئینوں میں اس کا عکس ایک ڈراؤنی تصویر کی طرح تھا۔گاہک تو اس وقت ایک آدھ ہی تھا،البتہ بجلی بند ہونے کی وجہ سے شدید گرمی نے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا اور اس وقت وہ دکان کے قریب کھڑے ''جلاوطنی'' کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ان میں ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا جس نے لیٹسٹ ڈیزائن کی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور کڑھائی والا کُرتا پہن رکھا تھا۔اس کے برابر میں ایک سفید ریش بزرگ تھے جنھوں نے قمیض اتار کر کاندھوں پر رکھی تھی۔ہاتھ میں کھجور کا پنکھا تھا جسے وہ اس انداز سے جَھل رہے تھے کہ ہوا دوسروں تک بھی پہنچے۔

ایک ملنگ بھی یہاں موجود تھا جس نے ''میکسی'' پہنی ہوئی تھی۔ ایک چالیس پچتالیس سالہ پہلوان نما شخص دھوتی کو ''منی'' بنائے یہاں کھڑا تھا۔ سفید ریش بزرگ سمیت سبھی واپڈا والوں کے عزیز واقارب کے بارے میں شدید قسم کی گستاخیاں کر رہے تھے۔ ایک میکسی والا ملنگ تھا جو منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ بس واپڈا کا ذکر آنے پر میکسی کے آخری سرے پر پنکھا جھلنے لگتا تھا۔

میں ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اور اپنے ''ہمسایوں'' کی زبان سے دو چار مخصوص گالیوں کو ''ریپیٹ'' ہوتے دیکھ کر بور ہو گیا اور موٹر سائیکل سے اتر کر سڑک پر چہل قدمی کرنے لگا۔ اندھیروں سے آلودہ سڑک پر گھروں سے بے گھر ہوئے لوگ سخت اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔

ایک کُتا آسمان کی طرف منہ کر کے فریاد کر رہا تھا اور انسان بے زبانوں کی طرح اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ذرا آگے سڑک کے کنارے قطار اندر قطار چار پائیاں بچھی تھیں جن پر ان گھروں کے مکین سو رہے تھے جن کے پاس کمرہ ایک اور ''مردماں بسیار'' ہیں۔ عورتیں اُس ایک کمرے میں جل بھن رہی تھیں اور مرد باہر گرمی کی شدت سے قمیض اتارے ننگی چار پائی پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہے تھے۔ ان میں سے بعض ایک اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور سرہانے پڑے پنکھے سے ہوا کے مصنوعی جھونکوں کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ برابر کے گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ان کی ماں کی بددعاؤں کی آواز بھی شامل تھی جو بچوں کو چُپ کرانے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں، دل سے نہیں!

میں ایک بار پھر واپس موٹر سائیکل کی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

دکاندار شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں دکان بند کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔ یہ بڑبڑاہٹ میں نے سن لی تھی اور واضح طور پر واپڈا والوں کے حسب نسب کے بارے میں تھی۔ سفید ریش بزرگ، لیٹسٹ ڈیزائن کی داڑھی والا نوجوان اور منی دھوتی والا

پہلوان یہاں سے رخصت تھے۔بس وہی ملنگ کھڑا تھا جو پورے خشوع وخضوع کے ساتھ میکسی سے پنکھا جھلنے میں مشغول تھا۔

اتنے میں سڑک پر روشنی کی ایک لہرا ابھری اوراس کے ساتھ ہی سکوٹر کی آواز سنائی دی۔ یہ روشنی کسی سکوٹر کی تھی اور یہ سکوٹر میرے اسی دوست کا تھا جس کے انتظار میں مَیں بیٹھا تھا۔اس نے سکوٹر میرے قریب کھڑا کیا اور واپڈا کے بارے میں کچھ اسی قسم کی گفتگو کرنے لگا جسے سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔

''میں مقررہ پروگرام سے کچھ جلد ہی واپس آگیا ہوں'' دوست نے کہا___ ''کیونکہ میں جس دوست کے پاس گیا تھا اس کے ہاں بھی بتی گئی ہوئی تھی اور وہ دوست بھی گھر پر نہیں تھا۔ ادھر اُدھر کے دو چار پھیرے لگانے کے بعد میں نے سوچا گھر چلا جائے''۔

''یہ تو اچھا ہوا'' میں نے کہا۔''ورنہ تم سے ملاقات نہ ہوتی، کیونکہ میں بھی اب جانے ہی کو تھا''۔

''لیکن تم آئے کیسے تھے؟'' دوست نے رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔''

''ایک تو تم سے ملاقات کو جی چاہتا تھا''۔ میں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔''اور دوسرے گزشتہ کئی گھنٹوں سے میرے علاقے کی بجلی بھی بند ہے!''

———❖❖❖———

# چھوٹا سفر

میں نے ڈیڑھ دو برس سے بیرون ملک اور مہینہ پندرہ دنوں سے اندرونِ ملک کوئی سفر نہیں کیا؛ چنانچہ اس دوران سفر کی کوئی روداد بھی نہیں لکھی، سو آپ ایک منٹ کے لیے یہ فرض کریں کہ میں ابھی ابھی لاہور سے وزیر آباد روانہ ہونے لگا ہوں، روانہ کیا ہونے لگا ہوں، بس یوں سمجھیں کہ روانہ ہو چکا ہوں؛ چنانچہ میرے گلے میں بیگ ہے اور میں اس وقت لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔

میں لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف انسانوں کا سمندر ہے۔ یہ سب لوگ کراچی سے آنے والی گاڑی کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ یہ گاڑی وزیر آباد، جہلم اور راولپنڈی وغیرہ سے ہوتی ہوئی پشاور جائے گی۔ اس گاڑی میں کچھ مسافر کوئٹہ کے بھی ہوں گے جو روہڑی سے سوار ہوئے ہوں گے۔

سٹیشن پر جو لوگ موجود ہیں ان میں سے بیشتر تو مسافر ہیں، باقی یا تو اپنے عزیزوں کو الوداع کہنے کے لیے آئے ہیں یا اپنے کسی مہمان کو ریسیو کرنے کے لیے یہاں موجود ہیں۔

ان لوگوں کے علاوہ پلیٹ فارم پر کتابوں، گھریلو مصنوعات اور چائے وغیرہ کے سٹال ہیں۔ نیز یہاں پھل اور روٹی کباب بیچنے والوں کی ریڑھیاں ہیں۔ سرخ قمیضوں میں ملبوس قلی بھی اپنے کاندھوں یا ٹھیلوں پر سامان لاد کر پلیٹ فارم کے خالی کونے پُر کرنے میں مشغول ہیں۔ گاڑی لیٹ ہے۔ نہ ابھی سگنل ڈاؤن ہوا ہے اور نہ اناؤنسمنٹ کے ذریعے یہ بتایا گیا کہ گاڑی کتنی لیٹ ہے۔

مسافروں، ان کو الوداع کہنے والوں اور اپنے عزیزوں کے استقبال کے لیے پلیٹ فارم پر موجو لوگوں کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہیں اور پھر اپنا شک دور کرنے کے لیے پلیٹ فارم کے درمیان میں نصب سرکاری گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں۔ کچھ کی گھڑیاں اس گھڑی کے عین مطابق ہیں اور کچھ کی آگے پیچھے ہیں لیکن بے چینی سب کی یکساں ہے جنہوں نے اپنے عزیزوں کا استقبال کرنا ہے وہ چاہتے ہیں کہ جلد ہی اس کام سے فارغ ہوں تا کہ جو کام وہ چھوڑ کر آئے ہیں، واپس جا کر جلدی سے نمٹائیں، اسی طرح اپنے مہمانوں کو الوداع کہنے کے لیے یہاں آئے ہوئے لوگ بھی اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے بے چین ہیں اور جو لوگوں کی بے چینی سب سے زیادہ ہے جو کراچی سے آنے والی اس گاڑی میں کل صبح سے سوار ہیں۔ انہوں نے سارا دن سفر کیا ہے، ساری رات سفر کیا ہے اور اب وہ رت جگے سے بے حال اور تھکن سے نڈھال اس منزل تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہیں جس کے لیے انہوں نے اس قدر صعوبتیں اٹھائی ہیں۔

بے چین صرف یہ اصلی مسافر یا نقلی مسافر ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان موجود خوانچہ فروش، قلی اور سٹالوں والے بھی ہیں۔ ان سب کو گاڑی کا انتظار ہے، گاڑی آئے گی تو یہ رزق حلال کمائیں گے مگر گاڑی نہیں آ رہی۔ اناؤنسمنٹ ہو رہی ہے مگر یہ اناؤنسمنٹ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پلیٹ فارم پر انسانوں کا ہجوم ہے اور وہ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس سمت دیکھ رہے ہیں جدھر سے گاڑی آنی ہے۔ کچھ دیر پہلے لوگوں میں ہلچل سی ہوئی تھی اور وہ اپنا اپنا سامان اٹھا کر ذرا آگے کو سرک آئے تھے کیونکہ انہیں انجن کی وسل سنائی دی تھی مگر اب ان کے چہرے پھر لٹک گئے ہیں، کیونکہ وہ گاڑی نہیں تھی، کالے دیو جیسا انجن تھا جو دھواں اگلتا اور آگ برساتا ان کے قریب سے گزر گیا۔ ایک بار گاڑی بھی دکھائی دی تھی مگر وہ پٹڑی بدل کر دوسرے پلیٹ فارم پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ گاڑی بھی اپنی منزل کو روانہ ہو چکی ہے۔ اس کے بعد بھی کئی گاڑیاں آئی ہیں مگر وہ سب دوسرے پلیٹ فارموں پر جا کر رکی ہیں اور پھر اپنی منزل کے لیے روانہ ہو گئی ہیں۔ کالے دیو جیسا انجن بھی اس دوران کئی دفعہ چیختا چلاتا

اِدھر سے گزرا ہے مگر اِس پلیٹ فارم کے مسافروں کو انجن کا نہیں، گاڑی کا انتظار ہے، اپنی اس گاڑی کا جس کے لیے وہ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔

گاڑی ابھی تک نہیں آئی۔

مَیں پلیٹ فارم پر گلے میں بیگ لٹکائے کھڑا ہوں۔ میرے سامنے دھواں چھوڑتے ہوئے انجن ہیں یا اس پلیٹ فارم کے ''اطراف'' میں واقع دوسرے ''پلیٹ فارم'' ہیں، جہاں گاڑیاں آکر رُکتی ہیں اور پھر اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں لیکن جہاں میں ہوں وہاں لوگ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس گاڑی کی راہ تک رہے ہیں جو انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچائے گی۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں اور مجھے یقین ہے یہ گاڑی ضرور آئے گی۔

گاڑی ضرور آئے گی مگر اس گاڑی کے آنے سے پہلے میں نے سفر کی روداد لکھ دی ہے، اس سفر کی جو میں نے نہیں کیا۔ اگر اس روداد میں کوئی خامی ہے، کسی جگہ کوئی تضاد نظر آتا ہے، واقعات میں ہم آہنگی نہیں ہے، کردار گڈمڈ ہو گئے ہیں یا کہیں صورت حال پوری طرح واضح نہیں ہوئی تو اس پر کسی کو رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو سفر نہ کیا ہو اس کی روداد ایسی ہی ہوتی ہے!

❖❖❖

# کیا پیو گے؟

لاہور ریلوے سٹیشن پر جب تمام رکشہ ڈرائیوروں نے مجھ نالائق کا ''بارِامانت'' اٹھانے سے انکار کردیا تو میں اور حسنین جاوید ذرا پرے کھڑی ویگن میں جا کر بیٹھ گئے جس میں ہمارے علاوہ تین مسافر اور تھے۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور منی بس میں مسافروں کے بے پناہ ہجوم سے متعلق بے بنیاد افواہوں پر غور کرنے لگا۔ اتنے میں چند مسافر اور آ گئے اور یوں منی بس قریباً بھر گئی ڈرائیور کے برابر والی نشستیں خالی تھیں لیکن کچھ ہی دیر بعد دو خواتین وہاں آ کر بیٹھ گئیں اور یوں ویگن کی بارہ نشستیں مسافروں سے پُر ہو گئیں۔ کنڈیکٹر ابھی تک دروازے کے ساتھ کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ میں نے بھری ہوئی ویگن کی طرف اشارہ کیا اور اسے چلنے کو کہا۔ اس پر کنڈیکٹر کے چہرے پر جو مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس کا مفہوم کچھ اس طرح کا تھا کہ حضرت: آپ خاصے چغد واقع ہوئے ہیں۔ اتنے میں چند مسافر اور آ گئے۔ کنڈیکٹر نے ویگن میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو حکم دیا کہ وہ سکڑ جائیں سو وہ سکڑ گئے۔ اب ویگن میں بارہ کے بجائے سولہ مسافر تھے لیکن کچھ اس طرح کہ انھوں نے اپنے کندھے سکیڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ کھُلے ہونے کے باوجود بندھے ہوئے تھے؛ چنانچہ ان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ٹکٹ کے لیے پیسے نکالنے کی خاطر اپنی یا کسی دوسرے کی جیب میں ہاتھ ڈال سکیں۔

میرا دم گھٹنے لگا تھا؛ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کنڈیکٹر سے چلنے کی درخواست کی۔ اس بار اس نے مسکراہٹ کی دولت مجھ پر نچھاور کرنے کے بجائے الفاظ کے موتی

بکھیرے اور کہا:

"صاحب جی! ویگن بھرے گی تو چلیں گے، خالی ویگن کیسے لے جائیں؟"

اتنے میں پانچ مسافر مزید آگئے۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی:

"سکڑ جائیں!"

سو لوگ سکڑ گئے اور اب بارہ نشستوں کی ویگن میں اکیس بے زبان سوار تھے۔ دریں اثنا دو مسافر اور آگئے۔ اس بار کنڈیکٹر نے ازراہِ کرم کسی کو سکڑنے کا حکم نہیں دیا۔ ایک مسافر پہلے سے بکری بنا کھڑا تھا۔ یہ دو بکریاں بھی اس کے ساتھ متوازی کھڑی ہو گئیں۔ اب دروازہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ کنڈیکٹر اس ادھ کھلے دروازے میں کھڑا ہو گیا اور ۲۳ بھیڑ بکریوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالنے کے بعد اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا:

"صاحب جی! آپ ناراض نہ ہوں ہم چل پڑتے ہیں۔"

ظاہر ہے کنڈیکٹر کی اس خوش اخلاقی کے بعد ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نیز اس نے جس خوش اسلوبی سے مسافروں کی پیکنگ کی تھی اس نے ناراض ہونے کی گنجائش ویسے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ سو صورت حال کچھ یوں تھی کہ میرے سامنے والی نشست پر پانچ مسافر بیٹھے تھے۔ یہ نشست ایک پھٹے پر مشتمل تھی اور یہ پھٹا وہاں بنایا گیا تھا جہاں ہماری نشست کے مسافروں کے لیے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ تھی؛ چنانچہ اب اس پھٹے کے مسافروں کی ٹانگیں شرمناک انداز میں "من تو شدم تو من شدی" ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف بائیں جانب بکریوں کی طرح جھکے ہوئے انسانوں کی 'سریاں' ہمارے سروں پر سایہ فگن تھیں اور گاہے گاہے ان کے "پائے" ہمارے پاؤں پر آجاتے تھے۔

ہماری نشست پر انتہائی بائیں جانب بیٹھا ہوا شخص ہم سے زیادہ عذاب میں تھا۔ اس کا سر قدرت کی طرف سے منڈا ہوا تھا اور چندیا لشکارے مار رہی تھی۔ چلتے چلتے جب ویگن ڈرائیور اچانک بریک مارتا تو اس کے برابر میں بکری بنے مسافروں میں سے کسی ایک کا ہاتھ سہارا لینے کے لیے ٹھاپ کی صورت میں اس کے سر پر پڑتا اور وہ دانت پیس کر رہ

جاتا کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

میرا دم گھٹتے گھٹتے ''گھٹنے'' کے قریب پہنچ گیا تھا، سو میں نے مزنگ چونگی کے قریب ڈرائیور کو بریک لگانے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے اچانک بریک لگائی جس کے ساتھ ہی ٹھاپ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ میں پانچ منٹ کی جدوجہد کے بعد اس شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہوا اور پھر ویگن سے باہر کھڑے ہو کر میں نے کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا اپنے ایک انقلابی دوست کے پاس گیا اور کہا:

''آج سے میں بھی انقلابی ہوں۔ آؤ مل کر مسلّح جدوجہد کا آغاز کریں اور نعرہ لگائیں کہ دنیا بھر کے ویگن مسافرو! ایک ہو جاؤ''۔

میرے انقلابی دوست نے یہ سن کر ۵۵۵ کا سگریٹ سلگایا۔ ڈرائیور کو کار سروس کے لیے لے جانے کا حکم دیا اور پھر سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا:

''میرا اور تمہارا طبقہ الگ الگ ہے۔ میں مزدوروں اور کسانوں کا ساتھی ہوں تم سرمایہ داروں کے رفیق ہو۔ ہمارا تمہارا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ خیر چھوڑو۔ دن ڈھلنے کو ہے کیا پیو گے؟''

❖❖❖

# جہاں مَیں ہُوں

میں جس کرائے کے مکان میں رہتا ہوں اس کے دو حصے ہیں۔ میری رہائش اوپر کے حصے میں ہے۔ نیچے مالک مکان رہتا ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے یونین کمیٹی کا دفتر ہے۔ اس کے ساتھ ایک پلاٹ ہے اور اس پلاٹ کے برابر مسجد ہے اس یونین کمیٹی، خالی پلاٹ اور مسجد کی دوسری طرف قبرستان ہے۔ قبرستان کے ساتھ دو تین مکان چھوڑ کر تھانہ ہے جس کا دروازہ مین روڈ کی طرف ہے۔

میرے گھر کے سامنے واقع یونین کمیٹی کا دفتر خاصی کثیر المقاصد قسم کی چیز ہے۔ یہاں پیدائش اور موت کا اندراج بھی ہوتا ہے، انسدادی ٹیکے بھی لگائے جاتے ہیں۔ صفائی کا شعبہ بھی یہیں ہے۔ کچھ دنوں سے یہاں شناختی کارڈ بھی بنائے جا رہے ہیں.......اور پھر یونین کمیٹی کے برابر والے پلاٹ میں، پلاٹ کے مالک نے مکان کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں۔ میں جب سے یہاں ہوں، ان بنیادوں کو اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔

اس پلاٹ کے ساتھ واقع مسجد، ظاہر ہے عبادت کے لیے تعمیر کی گئی ہے۔ یہاں سے پنج وقتہ اذان بھی بلند ہوتی ہے لیکن نمازیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مؤذن اذان دینے کے علاوہ لوگوں کے گھریلوں کام کاج بھی کرتا ہے اور اس کا معاوضہ صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں وصول کرتا ہے۔ امام صاحب نے مسجد سے ملحقہ دکانوں میں سے ایک دکان کرایہ پر لی ہوئی ہے۔ یہ جنرل سٹور ہے جہاں امام صاحب خود یا ان کا چھوٹا بیٹا بیٹھتا ہے۔ خطیب صاحب ان کے علاوہ ہیں جو صرف جمعے کا خطبہ دیتے ہیں۔ یہ نابینا ہیں۔ انہیں

پنجابی، اردو فارسی کے بے شمار شعر اور حکایتیں یاد ہیں جو وہ لہک لہک کر سناتے ہیں۔

یونین کمیٹی، پلاٹ اور مسجد کی دوسری طرف واقع قبرستان خاصا طویل و عریض ہے اس کے چاروں طرف دیوار کھینچی ہوئی ہے اور اندر سنگِ مرمر اور مٹی کی قبریں ہیں۔ قبرستان سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھانہ ظالموں اور مظلوموں سے بھرا رہتا ہے اور ادھر سے گزرتے وقت کبھی کبھار، کانوں میں سیسے کی طرح اترنے والی چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

میں چھٹی کے روز اپنے گھر کی بالکونی میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا ہوں اور ہولے ہولے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے نیچے سڑک پر برپا ہونے والے ہنگاموں کو دیکھتا ہوں یونین کمیٹی کی دہلیز پر بہت سے خاکروب بیٹھے یا کھڑے داروغہ صفائی کی ڈانٹ ڈپٹ سن رہے ہوتے ہیں۔ یہ روٹین کا معاملہ ہے، لہٰذا وہ اس کا برا نہیں مناتے اور نہ اس کا کوئی اثر لیتے ہیں؛ چنانچہ وہ اس ڈانٹ ڈپٹ کے دوران ماچس کی تیلی سے کانوں سے میل نکالنے میں مشغول رہتے ہیں اور یہ ڈانٹ ڈپٹ اگر طول پکڑ جائے تو اسی تیلی سے سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے سُوٹے لینے لگتے ہیں۔

یہاں لوگ شناختی کارڈ بنوانے کے لیے بھی آ جا رہے ہوتے ہیں اور کچھ ٹیکہ لگوانے یا موت یا پیدائش کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

برابر والے پلاٹ میں بچے کھیل کود میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکان کے لیے بھری ہوئی بنیادوں پر، توازن برقرار رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اگر اس کھیل کے دوران کوئی گر جائے تو اس پر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں

لوگوں کا سودا سلف لانے والا مؤذن جب اذان دیتا ہے تو کچھ لوگ اس کی آواز پر گھروں سے نکلتے ہیں اور امام صاحب دکان پر اپنے ننھے منے بچے کو بٹھا کر امامت کے لیے دکان سے مسجد کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

سو! جہاں میں رہتا ہوں وہاں ایک یونین کمیٹی کا دفتر ہے، جہاں سے شناختی کارڈ

بھی جاری ہوتے ہیں کہ اب ہماری شناخت، شناختی کارڈ سے ہے۔ یہاں موت اور پیدائش کے سرٹیفیکٹ بھی جاری کیے جاتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت کی تصدیق سرکاری کاغذوں ہی سے ہوتی ہے۔ جہاں میں ہوں وہاں ایک قبرستان ہے جس میں سنگ مرمر اور مٹی کی قبریں ہیں۔ اس کے برابر میں تھانہ ہے جس کے قریب سے گزرتے ہوئے انسانی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور جہاں میں ہوں، وہاں ایک پلاٹ ہے جس میں کب سے ایک خوبصورت مکان کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں لیکن اس پر ابھی تک کوئی عمارت تعمیر نہیں ہوئی!

# دو کوڑی کا نجومی

بادشاہ نے وزیر باتدبیر کو بلایا اور کہا کہ تدبیر ساتھ لے کر آؤ۔ بادشاہ نے مشیر باشمشیر کو بھی بلایا اور کہا کہ شمشیر ساتھ لے کر آؤ۔

وزیر نے تدبیر کی گٹھڑی باندھی اور بادشاہ سلامت کے حضور پہنچ گیا۔

مشیر نے شمشیر ساتھ لی اور بادشاہ کے آستانے پر حاضری دی۔

بادشاہ نے وزیر سے کہا:

''تمہارے پاس کیا تدبیر ہے؟''

وزیر نے گٹھڑی کھولی اور جواب دیا:

''حضور! ایک نہیں کئی تدبیریں ہیں۔ پہلی تدبیر یہ ہے کہ آپ مکمل طور پر شاہانہ زندگی بسر کریں۔ اپنے کرّوفر کے لیے شاہی خزانے کو بے دریغ استعمال کریں۔ اپنے لاقانونیت کو جی بھر کر فروغ دیں کہ شاہانِ سلف کا یہی دستور رہا ہے''۔

بادشاہ سلامت نے یہ سنا تو وہ خوش ہوئے اور بولے:

''ہمیں تم سے اسی وفاداری کی امید تھی لیکن تمہارے ان مشوروں پر عمل کرنے سے رعایا میں بے چینی پھیلے گی اور وہ ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، کیا خیال ہے؟''

وزیر باتدبیر نے یہ سنا تو کورنش بجالایا اور بولا:

''حضور! وہ طبقے جو آپ کے ساتھ لوٹ کھسوٹ میں شریک ہوں گے۔ آپ کے اقتدار کو مضبوط کرنے میں مدد دیں گے؛ البتہ رعایا کو مطمئن کرنے کے لیے آپ صرف

یہ کریں کہ گاہے بگاہے ان کے بارے میں ہمدردی اور محبت کے کلمات استعمال کرتے رہیں وہ اس سے خوش ہو جائیں گے، کیونکہ آپ سے پہلے کسی نے زبانی کلامی بھی ان سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ یوں آپ ظالم اور مظلوم دونوں کو خوش رکھ سکیں گے“

بادشاہ سلامت کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے فرمایا: ”وزیر باتدبیر! تم ٹھیک کہتے ہو، کوئی اور تدبیر؟“

وزیر نے گٹھری میں سے ایک اور تدبیر نکالی اور کہا:

”حضور! ایک تدبیر یہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے مطابق آپ کو چاہیے کہ انصاف کے تمام راستے مسدود کر دیں تاکہ فریادیوں کی فریادیں بھی کانوں تک نہ پہنچنے پائیں اور آوازیں سینوں ہی میں گھٹ کر رہ جائیں۔“

بادشاہ سلامت نے وزیر باتدبیر کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے زر و جواہر اور خلعت دے کر رخصت کر دیا۔

پھر وہ اپنے مشیر کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:

”مشیر! تم ہمیں کیا مشورہ دیتے ہو؟“

مشیر نے اپنی شمشیر نکالی اور کورنش بجالا کر کہا:

”حضور کا اقبال بلند ہو۔ میرا صرف ایک مشورہ ہے کہ جو لوگ وزیر باتدبیر کی ان تدبیروں کے باوجود سرکشی پر مائل ہوں انہیں بے دریغ تہ تیغ کر دیا جائے۔ اس کے بعد کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی“۔

بادشاہ سلامت نے مشیر کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے بھی زر و جواہرات اور خلعت سے سرفراز کیا۔

پھر بادشاہ سلامت نے ایک روز وزیر کو بلایا اور کہا:

”مشیر نے تمہیں قتل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ تم مجھے کتنے

عزیز ہو"۔

اور بعد میں بادشاہ سلامت نے مشیر کو طلب کیا اور کہا:

"وزیر تمہیں راستے سے ہٹانے کی تدبیر کر رہا ہے۔ اس کی سازشوں سے محتاط رہو، ویسے مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے"۔

اس کے نتیجے میں درباری دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے خود کو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ثابت کرنے لگے اور یوں بادشاہ سلامت نے زیادہ یکسوئی کے ساتھ امور سلطنت انجام دینا شروع کر دیے۔ انہوں نے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے تدبیر اور شمشیر دونوں کو استعمال کیا جس کے نتیجے میں انہوں نے ایک عرصے تک شاہانہ زندگی بسر کی۔ شاہی خزانے کو بے دریغ استعمال کیا۔ اپنے درباریوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کی مکمل آزادی دی اور ملک میں لاقانونیت اور بدعنوانی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

پھر ایک روز بادشاہ سلامت کے مخبروں نے انہیں آکر خبر دی کہ غریب عوام جن کی آزادیاں اور زندگیاں اجیرن ہو گئی ہیں، سرکشی پر آمادہ ہیں۔

بادشاہ نے یہ سُنا تو مخبروں کی غلط خبری پر انہیں سرزنش کی پھر شاہی نجومی کو بلایا اور پوچھا کہ تمہارے ستارے کیا کہتے ہیں؟

نجومی نے یہ سن کر کھڑکی میں سے سر باہر نکالا اور پھر باشاہ سلامت کو مخاطب کر کے کہا:

"حضور: اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ آپ کا اقتدار چند گھڑیوں کا مہمان ہے"۔

بادشاہ سلامت یہ سن کر جلال میں آ گئے۔ انہوں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا:

"اے دوکوڑی کے انسان! کیا تیرے ستارے نے تجھے یہی بات بتائی ہے"۔

نجومی نے ایک بار پھر جان کی امان طلب کی اور کہا:

''حضور! یہ بات مجھے میرے ستاروں نے نہیں بتائی۔ میں نے ابھی کھڑکی کے باہر حضور کے محل کی دیواروں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے لاکھوں عوام کا ہجوم دیکھا ہے۔ ان کے چہرے نفرت سے کھنچے ہوئے ہیں''۔

یہ سن کر بادشاہ سلامت کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔ انہوں نے فوراً وزیر اور مشیر کو طلب کیا۔

وزیر نے تدبیر کی گٹھڑی کھولی اور کہا:

''حضور! فکر کی کوئی بات نہیں''۔

اور دو کوڑی کے نجومی نے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر سر نکال کر لاکھوں عوام کے اس غضب ناک ہجوم کو دیکھنے لگا جو نفرت سے بھرے ہوئے چہروں کے ساتھ محل کے دروازے کے باہر جمع ہو رہے تھے!

# مجمع باز

ٹی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے ایک ادیب نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر پیالی واپس پلیٹ میں رکھی اور میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا:

''تمہیں پتہ ہے کہ میں بننا مجمع باز چاہتا تھا مگر بن ادیب گیا ہوں''۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کی ہنسی میں شامل ہوتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے سے تا حال اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہے یا وہ اس وقت مذاق کے موڈ میں ہے۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں''۔ اس نے داہنے ہاتھ سے اپنے بال ماتھے پر سے سمیٹتے ہوئے اسی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''جب میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا تو فٹ پاتھ پر مجمع لگانے والے ''مقرروں'' کی تقریریں بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ تقریر کے اختتام پر ان میں سے کوئی سرمہ بیچتا، کوئی دانتوں کا منجن فروخت کرتا اور کسی کی تان بوڑھوں کو جوان بنانے والی دوا پر ٹوٹتی۔ بعد میں ان میں سے ایک مجمع باز سے میری دوستی ہوگئی جس کی اپنی ذاتی کھوٹھی تھی اور جب دوسرے شہروں میں مجمع لگانے کے لیے دورے پر نکلتا تو کسی صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کرتا۔ اس کا ''سٹاف'' دو افراد پر مشتمل تھا جو ''مجمع گاہ'' میں آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جاتا اور ان میں سے ایک لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے ابتدائی نوعیت کی تقریر کرتا' اتنی دیر میں کچھ لوگ جمع ہو جاتے تو ان کا ''باس'' جس کا چہرہ سرخ و سفید تھا اور جو بارعب شخصیت کا مالک تھا، پستول کمر کے ساتھ باندھے وہاں پہنچ جاتا اور ''جوہرِ حیات'' نام کی بوتلیں اپنی صحت کو بطورِ مثال پیش کرتے ہوئے بیچتا۔ اس کی تقریر اتنی دلپذیر ہوتی کہ کم از کم

پچاس بوتلیں وہیں فروخت ہو جاتیں؛ چنانچہ دو روپے فی بوتل کے حساب سے وہ سو روپے جیب میں ڈال کر اپنے ''سٹاف'' کو کسی اور جگہ کا پتہ دیتا اور پھر آدھ گھنٹے بعد خود ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں مجمع لگانے کے لیے پہنچ جاتا۔ یہ آج سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے اور وہ اس زمانے میں بھی کم از کم تین چار سو روپے روز کے کماتا تھا''۔

''مگر تم تو اپنے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟''

''ہاں یہی تو بتانے لگا ہوں''۔ وہ ایک بار پھر ہنسا: ''دراصل ایک دن میں نے اسے یہ جوہرِ حیات تیار کرتے دیکھا جو بوڑھوں کو جوان اور جوانوں کو نوجوان بناتا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں اس نے میری موجودگی کے دوران اپنے ملازم کو یہ جوہرِ حیات تیار کرنے کی ہدایت کی جس پر یہ ملازم جو ٹُنڈا تھا' فوراً اٹھا' ایک بڑی بالٹی پانی سے بھری۔ اس میں کچھ سکرین اور تھوڑا سا رنگ ملایا اور ایک مُٹھ چھان بُورے سے ملتی جلتی کوئی چیز اس میں مِکس کی۔ اس کے بعد اس نے اپنا واحد ہاتھ بالٹی میں ڈال کر پانی زور زور سے ہلایا اور اب یہ ''جوہرِ حیات'' ٹانک پانی میں ڈالتا۔ غٹ غٹ کی آواز آتی اور بوتل بھر جاتی۔ بعد ازاں اس نے ان بوتلوں پر ''جوہرِ حیات'' کا خوبصورت لیبل چسپاں کیا جس کے نیچے ''غلط ثابت کرنے والے کو ایک سو روپے انعام'' لکھا تھا اور انہیں ایک اٹیچی میں پیک کر دیا۔ رنگ، سکرین، چھان بورے اور پانی سے بھری بالٹی آدھی سے زیادہ بچ گئی تھی جو اس نے وہیں الٹا دی تھی اور یوں باقی ماندہ جوہرِ حیات نالی میں بہ گیا''۔

''سبحان اللہ!'' اس سارے قصے کے دوران پہلی بار میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھری اور اب اس کہانی کے اصل حصے میں میری دلچسپی بھی مزید بڑھ گئی؛ چنانچہ میں نے کہا: ''مگر تم تو اپنے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟''

''اب میں وہی بتانے لگا ہوں''۔ اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''بس وہیں میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں نے اپنا کیریئر بنانا ہے تو ایک مجمع باز کے طور پر ہی بنانا ہے۔ میں نے اس دوران گریجویشن کر لی تھی اور نوکری مل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اگلے

روز میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا جو پی کیو آر میں اے ایس آئی تھا اور بے روزگار تھا''۔

''یہ کیا بات ہوئی''۔ میں نے اپنے اس ادیب دوست کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا''۔اگر وہ پی کیو آر میں اے ایس آئی تھا تو بے روزگار کیسے تھا؟''

''وہ اس طرح کہ پی کیو آر کے نام سے ''پولیس قومی رضا کار'' دراصل ایک فورس تھی جو اس زمانے میں قائم تھی اور اس کے اے ایس آئی کی وردی پولیس کے اے ایس آئی کی وردی کی طرح ہی ہوتی تھی مگر ان اے ایس آئی صاحبان کی تنخواہ صرف ۲۰ روپے ماہوار تھی۔ میرا یہ دوست اپنے باقی اخراجات پولیس کی وردی کی دھاک بٹھا کر بذریعہ فراڈ پورے کرتا تھا''۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے محسوس کیا کہ اس دخل درمعقولات سے کہانی کا ٹیمپو (TEMPO) کچھ سلو ہو گیا ہے۔

''پھر یوں ہوا کہ ہم نے دانتوں کی دَوا بیچنے کا پروگرام بنایا''۔

''ارے تم دانتوں کا منجن بیچتے رہے ہو'' میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔

''یار سنو تو سہی''۔ خود اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''اس پروجیکٹ کے لیے میں نے بازار سے چھوٹے سائز کی دو شیشیاں خریدیں۔ ایک بالٹی میں پانی بھرا، اس میں تھوڑی سی کھٹائی جو گول گپوں کے پانی میں ڈالتے ہیں ملائی، تھوڑا سا زردے کا رنگ اس میں مِکس کیا اور پھر دانتوں کو موتیوں کی طرح چمکانے والی دوا تیار تھی''۔

''اس دوائی پر تمہاری لاگت کتنی آئی؟''

''یہی کوئی آٹھ آنے''۔اور یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر ہنسا۔

''پھر؟''

''پھر میں نے کوئی ڈیڑھ صفحے کی تقریر لکھی جس میں پانچ شعر بھی شامل تھے جن

میں سے چار میرے اپنے اور ایک علامہ اقبال کا تھا اور بعد ازاں اسے زبانی یاد کرنے کے بعد کوئی ایک ہفتے تک اس کی ریہرسل کرتا رہا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا، کیونکہ اس کے لیے لہجہ بھی خالص مجمع بازوں ایسا بنانا تھا، چنانچہ صرف ایک لفظ ''دند'' (دانت) کو مجمع بازوں کے انداز میں ادا کرنے کے لیے میرے کئی دن صرف ہو گئے، کیونکہ ''دند'' کا لفظ دانت پیچ کر ادا کرنا تھا۔ یعنی دنّ دْ''ا

اس گفتگو کے دوران شام ہونے کو تھی اور ٹی ہاؤس کی میزیں ایک ایک کر کے ادیبوں سے پُر ہونا شروع ہو گئیں۔ ان میں رنگا رنگ ادیب تھے۔ ہر لیبل کے، ہر مارکہ کے۔ مگر اس وقت میرا دھیان ان کی طرف نہ تھا بلکہ میں دعا کر رہا تھا کہ ان میں سے کوئی ہماری میز کی طرف رخ نہ کرے۔ چنانچہ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر احتیاطاً ستون کے پیچھے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس داستان میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

''اچھا۔ پھر کیا ہوا؟''

''ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ ان دنوں میں پنڈی میں ہوتا تھا۔ چنانچہ پنڈی کے کسی بازار میں مجمع لگانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس کے لیے کیمبل پُور جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ہم نے پونے دو دو روپے کا ٹکٹ خریدا اور کیمبل پور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جس ڈبے میں ہم سوار ہوئے وہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ میرے اے ایس آئی دوست نے مجھے کہنی ماری اور آہستہ سے کہا:

''بسم اللہ اس ڈبے ہی سے کرو۔ تجربے کے لیے یہ بہترین جگہ ہے''۔

لیکن اتنے سارے لوگ دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی، چنانچہ اس کے اصرار پر جب میں نے اپنی جگہ سے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو مجھے یوں لگا میرے پاؤں من من کے ہو گئے ہیں لہٰذا میں پھر واپس بیٹھ گیا اور میں نے اپنے دوست سے کہا کہ کسی دوسرے ڈبے میں چلتے ہیں مگر دوسرے ڈبے میں بھی میری کیفیت جوں کی توں رہی مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہاں بیٹھے ہوئے تمام لوگ میرے واقف ہیں۔ اس دوران مسافر ایک ایک کر کے

مختلف سٹیشنوں پر اترتے جا رہے تھے حتیٰ کہ اس ڈبے میں صرف تین مسافر رہ گئے جس میں سے دو بوڑھے اور ایک جوان تھا۔ میرے دوست نے مجھے ٹھوکا دیا اور کہا:

''یار خدا کے لیے ہمت کرو۔ اب سنہری موقع ہے''۔

چنانچہ اس کے حوصلہ دلانے پر میں نے اپنی تمام قوتیں مجتمع کیں حتیٰ کہ ایک ہاتھ میں بیگ پکڑ کر میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا''۔

اب مختلف میزوں سے ادیبوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں اور وہ اپنے دل پسند موضوعات پر باآوازِ بلند اظہار خیال کر رہے تھے۔ دو تین میزوں پر بحث میں تو غالباً تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ ایک ادیب کی ہسٹریائی چیخیں ہماری میز کی حدود میں داخل ہو گئی تھیں۔ شریف بنجارہ، الٰہی بخش اور ہیرو چائے کے برتن اٹھائے تیزی سے ایک میز سے دوسری میز کی طرف آ جا رہے تھے۔

''پھر کیا ہوا؟'' اس دفعہ میں نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا، کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ میری آواز اس شور میں گم ہو جائے گی۔

''پھر یوں ہوا کہ میں نے اپنی تقریر دلپذیر کا آغاز کیا مگر صورت حال یہ تھی کہ میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے، ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ماتھے پر پسینہ تھا۔ چنانچہ اپنی رٹی ہوئی تقریر کے پہلے تین جملے اور ایک شعر کے بعد باقی تقریر مجھے بھول گئی جس پر میں نے یہ کہہ کر تقریر فوراً ختم کر دی کہ حضرات! دراصل میں دانتوں کی دوا بنانے والی ایک مشہور کمپنی کا ایجنٹ ہوں اور کمپنی کی مشہوری کے لیے یہاں یہ دوا صرف آٹھ آنے میں آپ کو ملے گی۔ اس کا اثر دیکھنا ہو تو ابھی دیکھیے میں آپ کو دکھاتا ہوں ___ اور یہ کہہ کر میں نے کھٹیائی والے اس رنگین پانی میں روئی ڈبو کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے کہا:

''بابا جی ذرا منہ کھولو''۔

اس نے فوراً منہ کھول کر دکھایا جس میں سرے سے کوئی دانت نہ تھا۔ اس پر میں نے کھسیانا ہو کر کہا:

''بہر حال جن صاحب کو ضرورت ہو وہ آواز دے کر طلب کریں۔ صرف آٹھ آنے میں یہ رعایت صرف کمپنی کی مشہوری کے لیے ہے۔''

اس پر میرے ساتھی نے پروگرام کے مطابق جیب سے اٹھنی نکالی اور کہا:

''بھائی صاحب! ایک شیشی مجھے دینا''۔

میں نے ایک شیشی اس کے ہاتھ فروخت کی اور بس یہی ایک شیشی فروخت ہوئی''۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا ہونا تھا کیمبل پور آیا تو ہم اتر گئے لیکن میں اس تجربے سے اس قدر ڈیمورالائز Demoralize ہوا کہ اپنے ساتھی کے شدید اصرار کے باوجود میں نے وہاں مجمع لگانے سے انکار کر دیا لیکن وہاں ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا''۔

''وہ کیا؟''

''پنڈی سے کیمبل پور کی ٹکٹ لینے کے بعد میری جیب میں صرف دس روپے بچے تھے اور میرے خیال میں یہ رقم کافی تھی کیونکہ دانتوں کو موتیوں کی طرح چمکانے والی دوا کی دو سو شیشیاں بھی تو میرے بیگ میں تھیں جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ میں آرام سے سو روپیہ اس میں سے کما لوں گا لیکن شیشی ایک نہ بکی۔ اور جب کیمبل پور پہنچ کر کھانا کھانے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ ڈبے میں الٹا کسی نے میری جیب کاٹ لی تھی''۔

میرا قہقہہ ایک دفعہ پھر بہت زوردار تھا لیکن وہ دو تین میزوں پر بیٹھے علیحدہ علیحدہ لیبلوں اور علیحدہ علیحدہ ٹریڈ مارک رکھنے والے ادیبوں کے جوشِ خطابت کی نذر ہو گیا۔ یہ ادیب اب گفتگو نہیں باقاعدہ تقریر کر رہے تھے بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی میز پر مکّہ بجنے کی آواز بھی سنائی دیتی اور اس کے ساتھ ہی اس میز پر پڑی پیالیاں چھنچھنا اٹھیں''۔

''پھر تم لوگ واپس کیسے آئے؟''

''وہ تو ہم کسی نہ کسی طور پر آ گئے''۔ میرے اس ادیب دوست نے مجھ سے ماچس لے کر سگریٹ سلگایا۔ پھر ہنستے ہوئے کہا۔ ''مگر یار افسوس یہ ہے کہ میں محض تربیت نہ ہونے کی وجہ سے اس میدان میں مار کھا گیا۔ اگر کوئی اچھا استاد مل جاتا تو مجھے اپنے مقصد میں بھی کامیابی ہو جاتی اور آج مجھے بطور ادیب جو عزت حاصل ہے اس میں بھی کوئی کمی نہ آتی''۔

''وہ کیسے؟'' اپنے اس مسخرے دوست کی اس بات پر میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''وہ یوں کہ اب جو میں عرصہء دراز سے روز شام کو ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرتا ہوں اور ہفتے میں منعقد ہونے والے دو تین ادبی حلقوں کے اجلاس میں ادیبوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کرتے ہوئے سنتا ہوں۔ اگر اس وقت مجھے ان لوگوں کی صحبت اور تربیت میسّر ہوتی تو مجھے اپنے مشن میں ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اب یہ کہ صرف ادیب ہوں۔ اس صورت میں مجمع باز بھی ہوتا اور چار پیسے اس فن سے بھی کما لیتا۔ جن کی آوازیں تم تک آ رہی ہیں۔ یہ بھی تو چند رٹی رٹی اصطلاحوں پر ''جوہرِ حیات'' کا لیبل لگا کر انہیں بیچنے کے لیے ٹی ہاؤس، ادبی حلقوں، ریڈیو اور ٹیلی وژن میں مجمع لگاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ادیب بھی کہلاتے ہیں۔ میں تو یار اس وقت بس نادانی ہی میں مارا گیا''۔

# بندے دا پتّر

گزشتہ روز میں نے یاسر اور عمر کی انگلی پکڑی، گلزار وفا چودھری کو ساتھ لیا اور چڑیا گھر کے مرکزی دروازے سے گزر کر ہم جانوروں کے پنجروں کے قریب پہنچ گئے۔

اس روز جمعہ کی وجہ سے چڑیا گھر میں خاصی رونق تھی۔ بے شمار لوگ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مختلف پنجروں کے ساتھ لگے کھڑے تھے اور جانوروں کو دیکھ کر محفوظ ہوتے تھے، کچھ کو جانور دیکھ کر محفوظ ہو رہے تھے۔ بَبّر شیر کے پنجرے کے گرد لوگوں کا خاصا ہجوم تھا مگر ''بادشاہ سلامت'' سو رہے تھے۔ ان کے تین خوبصورت بچے برابر میں لیٹے تھے۔ ان میں سے دو تو محوِ خواب تھے، ایک جاگ رہا تھا۔ شیرنی ذرا فاصلے پر لیٹی تھی اور بار بار غصیلی آنکھوں سے ناظرین کو دیکھتی تھی۔ اسے ''نامحروں'' کی تاک جھانک غالباً ناگوار گزر رہی تھی۔ میں نے ایک نظر اس ''فیملی'' پر ڈالی اور پھر گلزار سے کہا:

''یہ خاندان کتنی پُرسکون زندگی گزار رہا ہے بس یہاں ایک ٹیلی وژن سیٹ ہو تو اسی فیملی کی شام بھی ذرا اچھی گزر جائے''۔

''یہ تم ٹھیک کہتے ہو'' گلزار نے ہنس کر کہا۔'' چنانچہ چڑیا گھر والے اگر ان کے لیے ٹی وی سیٹ ''افورڈ'' نہ کر سکتے ہوں تو ان ''میاں بیوی'' کو ''نیلام گھر'' بھیج دیں وہاں یہ طارق عزیز سے منیر نیازی کے شعر بھی سنیں گے اور ٹیلیوژن سیٹ بھی انہیں مل جائے گا''۔

عمر میرے گھٹنے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اسے پنجرے کے مکین صاف نظر نہیں آ رہے تھے چنانچہ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس نے گود میں آتے ہی بَبّر شیر کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے حلق سے شیر جیسی آواز نکالی جس پر شیرنی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا

مگراس کی آنکھوں میں مامتا نہیں تھی۔شاید اس لیے کہ درندوں میں مامتا زیادہ سے زیادہ اپنے بچوں کے لیے ہوتی ہے،دوسرے بچوں کے لیے نہیں۔

''تمہیں پتہ ہے کہ یہ جوڑا اتنی مطمئن زندگی کیوں بسر کر رہا ہے؟'' گلزار نے مجھے استفہامیہ انداز میں مخاطب کیا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہا:''اس لیے کہ اس پنجرے میں بیوی کو اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ وہ شیر ہے جو رات کو لیٹ گھر نہیں آتا اور یہ وہ شیر ہے جس کی جیب سے کبھی کوئی رقعہ برآمد نہیں ہُوا''۔

اس دوران مختلف جانوروں سے ''ہیلو ہیلو'' کرتے ہوئے ہم ایک انتہائی خوبصورت سفید بلّی کے پنجرے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

''یار! یہ بلّی دیکھو کس قدر خوبصورت ہے۔ بھلا اسے پنجرے میں بند رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔اسے تو یوں بھی لوگ گھروں میں دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے گلزار سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے'' گلزار نے مسکراتے ہوئے کہا'' مگر اسے یہاں بلّی ہونے کی وجہ سے نہیں، شیر کی خالہ ہونے کی وجہ سے بند کیا گیا ہے۔اسے صرف شیر کی رشتہ داری لے بیٹھی۔ بزرگوں نے اسی لیے تو کہا ہے کہ زورآوروں کے ساتھ خواہ مخواہ کی رشتہ داری قائم نہیں کرنی چاہیے''۔

''اور چڑیا گھر کے شیروں کے ضمن میں تو خصوصاً احتیاط برتنا چاہیے''۔ برابر میں کھڑے کوٹ پتلون میں ملبوس ایک سمارٹ سے نوجوان نے متبسّم چہرے کے ساتھ گلزار کے فقرے کو آگے بڑھایا۔

اس عرصہ میں ہم چلتے چلتے'' ہاتھی سٹینڈ'' کے قریب پہنچ گئے، جہاں بہت سے بچے ایک سیڑھی کے ذریعے ہاتھی پر سوار ہو رہے تھے۔

ہمارے سامنے گوشت کا ایک پہاڑ کھڑا تھا میں نے یاسر اور عمر کو بھی اس مخلوق پر سواری کی دعوت دی مگر انہیں یہ مخلوق غالباً زیادہ پسند نہیں آئی، کیونکہ یہ سن کر وہ فوراً میری ٹانگوں کے ساتھ چپک گئے۔

''اگر قدرت بھی حصّہ بقدرِ جثہ ، کے اصول کی قائل ہوتی تو جانتے ہو کیا ہوتا؟''
ذرا فاصلے پر کھڑے ایک شخص نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''کیا ہوتا؟'' اس کے ساتھی نے کہا۔

''ہوتا یہ کہ اس وقت دنیا کی حکمرانی ہاتھیوں کے سپرد ہوتی ، کیونکہ اس کا جثہ تمام حیوانوں اور انسانوں سے زیادہ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہر شخص کو اس کی ذہنی صلاحیت کے مطابق اس کا حق ملنا چاہیے۔''

اس کے ساتھی نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ لگتا تھا وہ اپنے دوست کی ان باتوں کا عادی ہے مگر پھر اس نے ہولے سے کہا:

''تو کیا دنیا کی حکمرانی آج بھی ہاتھیوں کے سپرد نہیں ہے؟''

اور پھر بندروں کے ساتھ خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے کے بعد اب ہم بن مانس کے پنجرے کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پنجرے کی سلاخیں پکڑی ہوئی تھیں اور ناظرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ لگتا تھا وہ ہم میں سے کسی ایک کو ''جیلر'' فرض کر کے ابھی سلطان راہی کے انداز میں ''اوئے جیلر'' والے ڈائیلاگ بولنا شروع ہو جائے گا مگر اس نے یہ موقع غالباً مناسب نہ جانا۔ اس کے بجائے وہ دونوں ٹانگوں پر چلتا پنجرے کے دوسرے کنارے تک گیا اور وہاں زمین پر پڑے بیک وقت چھ سات کیلے ہاتھوں اور بغل میں دبا کر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

''یہ کیلے کھانے کے لیے لایا ہے یا تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے!'' گلزار نے للچائی ہوئی نظروں سے کیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں بن مانس نے نہایت مہذب انداز میں کیلے کا چھلکا اتارا اور پھر اوپر کے حصے کا گودا کھانا شروع کر دیا۔

جب یہ گودا ختم ہو گیا تو اس نے باقی چھلکا اتار کر پرے پھینک دیا اور گودا منہ میں ڈال کر ناظرین کی طرف منہ کر کے باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔

''یار کمال ہے''۔ میں نے گلزار کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بن مانس کو دیکھ کر ڈارون کی تھیوری کچھ کچھ ٹھیک لگنے لگتی ہے۔ خصوصاً اس بن مانس کو دیکھ کر تو مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ آئندہ چند برسوں میں اپنے تمام ارتقائی مراحل طے کر کے یہ بن مانس سے ''بندے دا پُتّر بن جائے گا''۔

''میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو!'' گلزار نے کہا۔ ''بلکہ میرا تو خیال ہے کہ آئندہ دو چار سال میں یہ نہ صرف انسان بن جائے گا بلکہ باقاعدہ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوا کرے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جتنا یہ ذہین لگتا ہے ممکن ہے کچھ عرصے بعد تم اسے ریڈیو، ٹی وی کے مبصروں میں دیکھو کہ اللہ بہت انصاف کرنے والا ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کی صلاحیتوں کی مطابق رزق دیتا ہے!''

❖❖❖

# آوازیں!

ناصر ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہوگیا اور پھر اس نے کہا ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں تھوڑی دیر پہلے کیوں ہنس رہا تھا؟'' میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور کہا۔ ''تم اس لیے ہنس رہے تھے کہ ہنسنا بہت آسان ہے جب کہ رونے کے لیے خاصی ریاضت کی ضرورت ہے!''

''ہاں! میرے خیال میں تم صحیح کہتے ہو۔'' ناصر نے ایک بار پھر ہنستے ہوئے کہا ہم لوگ خاصے آرام طلب ہوگئے ہیں۔ میں نے چند برس قبل ایک موقع پر رونے کی کوشش کی تھی مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ چنانچہ میں نے پھر ہنسنا شروع کردیا۔ میری دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ میں تو تھوڑی دیر بعد تھک ہار کر خاموش ہوگیا۔ مگر وہ ہنستے چلے گئے۔ ان میں سے کئی تو ابھی تک ہنس رہے ہیں۔ کیا تم یہ دبی دبی ہنسی نہیں سن رہے!''

''ہاں سن تو رہا ہوں۔ مگر میں سمجھا کہ یہ شاید میری اپنی آواز ہے۔ دراصل آوازیں بھی گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہیں۔ کبھی کبھی تو دوسروں کی آوازیں اپنی آوازوں ایسی لگنے لگتی ہیں اور کبھی اپنی آواز پر دوسروں کی آواز کا گماں گزرتا ہے۔ لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ جو ہنسنے کی آواز آرہی ہے۔ یہ میری آواز نہیں ہے؟''

''تم نے تو مجھے بھی شک میں ڈال دیا ہے۔ اب تو یہ آواز مجھے اپنی لگنے لگی ہے۔ ذرا کان لگا کر سنو۔ اگر یہ میری آواز ہے تو اس کو منع کرو۔ میں ہنسنا نہیں چاہتا؟''

''لیکن تم کیوں رونا نہیں چاہتے۔'' میں نے پوچھا۔ ''آخر رونے میں حرج ہی کیا ہے؟''

''ہاں یار تم ٹھیک کہتے ہو۔ دراصل ہم لوگ ہنسنا اور رونا بھول چکے ہیں۔ یہ آوازیں ذرا غور سے سنو، نہ ہنسنے والوں کو ہنسنا آتا ہے اور نہ رونے والوں کو رونا آتا ہے!''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر تم یہ کیسے ٹھیک کہتے ہو؟''

''مجھے ان کی شکلیں نظر آ رہی ہیں۔ وہ دیکھو ان میں سے کچھ لوگوں کے منہ اور کچھ کے بال کھلے ہیں۔ کیا تم انہیں نہیں دیکھ سکتے؟''

''نہیں میں نہیں دیکھ سکتا۔ ہم میں سے ہر شخص کچھ عرصہ کے لیے بینا رہتا ہے۔ پھر نابینا ہو جاتا ہے۔ میری بینائی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ کیا تم انہیں واقعی دیکھ سکتے ہو؟''

''ہاں میں انہیں واقعی دیکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہے ہیں۔ انہیں کہو میری طرف نہ دیکھیں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں ان دونوں میں سے نہیں ہوں۔''

''میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میری بینائی کا عرصہ گزر چکا ہے مجھے صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ شکلیں دکھائی نہیں دیتیں۔ مجھے تو تم بھی دکھائی نہیں دیتے۔ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو۔ بولو، میرے لیے تمہاری موجودگی تمہاری آواز سے ہے!''

''ہم اتنے عرصے سے جو گفتگو کر رہے ہیں۔ کیا اس سے ہماری موجودگی کا احساس ہوتا ہے؟''

''تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی، مجھے لگتا ہے۔ یہ باتیں ہم نہیں کر رہے۔ کوئی اور کر رہا ہے۔ اگر تم اپنی بینائی واپس لا سکتے ہو تو میری طرف دیکھو۔ اگر میں تم سے باتیں کر رہا ہوں تو میرے ہونٹ کیوں نہیں ہلتے؟''

''ہاں یار، ہونٹ تو میرے بھی نہیں ہل رہے تو پھر یہ باتیں کون کر رہا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے، کمرے میں ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے!''

''ان ہنسنے اور رونے والوں کے علاوہ؟''

کون سے ہنسنے اور کون سے رونے والے تم کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو؟''

''ہاں یار! یہ میں کن لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہ شاید ہم اپنے بارے میں کہہ رہے تھے۔ کیا یہ ہم اپنے بارے میں کہہ رہے تھے؟''

''نہیں ہم دونوں تو ایک عرصے سے نہ ہنسے ہیں اور نہ روئے ہیں۔ یا شاید یہ کہ دل کھول کر ہنسے ہیں۔ جی بھر کر روئے ہیں۔ اب تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ خیر چھوڑ دوان باتوں کو آؤ اپنے اپنے چہرے کھونٹی پر ٹانگ کر ذرا آرام کریں۔ بہت تھک گئے ہیں!۔''

# سی آئی اے کا ایجنٹ!

پاکستان میں متعین امریکی سفیر میرا بچپن کا دوست ہے' ہم دونوں ماسی برکتے کے تندور سے کھانا کھاتے رہے ہیں' ایک دوسرے کی پتنگ کو کنی دیتے رہے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں اس کے ساتھ سائیکل پر بیٹھا ہوا ہوں اور اس کی شلوار کا پائنچا چین میں پھنس گیا یا سائیکل کے کتے فیل ہو گئے ...... اسی طرح عید کے روز فلم کا پہلا شو دیکھنے کے لیے ہم ایک دوسرے کے کاندھے پر سوار ہو کر ٹکٹ خریدنے کے لیے کھڑکی میں اپنا ہاتھ پھنسا دیتے تھے۔ فلم میں اپنی پسند کا گانا آنے پر ہم پیسوں کا چھٹا دیوار پر لگے ہوئے پنکھوں پر مارتے۔ پچھلے ہفتے ہم مجھے کے پائے کھانے گئے تھے' واپسی پر ہم نے بھاٹی سے نو نمبر ویگن لی جس میں ہم ستارویں اٹھارویں مسافر تھے' سکیم موڑ پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو بڑی مشکل سے ویگن میں سے نکالا' مجھے کلینر نے نکالا تھا!

امریکی سفیر سے میری دوستی کی ایک وجہ تو بچپن کی دوستی ہے اور دوسرے اس کی بے پناہ حب الوطنی ہے۔ اسے پاکستان سے عشق ہے چنانچہ پاکستان پر کوئی ابتلا آئے' وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد جب سیاستدانوں نے سیاست کے نام پر مارکٹائی سے بھرپور فلم کا آغاز کیا تو میرا یہ دوست اس صورت حال پر بہت کڑھتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ملک تباہی کی طرف جا رہا ہے تو اس نے ایوب خان کے ذریعے سیاست کی بساط ہی الٹ دی۔ اس کے دس سال بعد جب میرے دوست نے محسوس کیا کہ ایوب خان نے ملک میں صنعتوں کا جال

بچھانے اور اپنے محسنوں کو آنکھیں دکھانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تو اس کے خلاف چلائی گئی زبردست تحریک کو سپورٹ کیا جس کے نتیجے میں اسے تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا اور پھر اس کی جگہ یحییٰ خاں کو لایا گیا۔ یحییٰ خاں نے اندرا گاندھی' مجیب اور بھٹو کے تعاون سے ملک توڑ دیا۔ میرا دوست اس صورت حال پر بہت رنجیدہ تھا' وہ پاکستان کی مدد کے لیے اپنا ساتواں بحری بیڑہ لانا چاہتا تھا مگر اس روز بحری بیڑے کے کپتان کی والدہ کی داڑھ میں سخت درد شروع ہو گیا اور اسے اپنی والدہ کے لیے دوا لینے کی خاطر متعدد بار ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا اور یوں ساتواں بحری بیڑہ بروقت مدد کو نہ پہنچ سکا۔ بچے کھچے پاکستان یعنی نئے پاکستان کی تعمیر کے لیے بھٹو نے اپنی خدمات پیش کیں چنانچہ ملک کی سربراہی اسے سونپ دی گئی' چند برسوں کے بعد میرے دوست نے محسوس کیا کہ بھٹو ایٹمی پلانٹ اور اسلامی سربراہی کانفرنس کے ذریعے تیل کو مغرب کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنے کے ضمن میں جو کچھ کر رہا ہے' وہ پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے چنانچہ میرے دوست نے اس کا بھی صفایا کر دیا اور عنان اقتدار جنرل ضیاء الحق کو سونپ دی میرا دوست دوسرے حکمرانوں کی طرح شروع میں ضیاء الحق سے بھی بہت خوش تھا مگر اس کے اقتدار کے آخری دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ ضیاء الحق بھی بعض امور میں ایوب خان اور بھٹو کی راہ پر چل رہا ہے چنانچہ اس نے پاکستان کے وسیع تر مفاد میں ضیاء الحق کا کنڈا بھی کھینچ دیا اور اس کی جگہ مرکز میں پیپلز پارٹی اور پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کو برسر اقتدار لے آیا تاکہ یہ دونوں من مانی نہ کر سکیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ میرا دوست پیپلز پارٹی اور اسلامی جمہوری اتحاد دونوں کی کارکردگی سے خوش ہے۔ وہ کبھی کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک سے ناراض بھی ہو جاتا ہے جس پر دوسرا بہت خوش ہوتا ہے کہ شاید خدا نے اس کی سن لی مگر میرے دوست نے مجھے بتایا ہے کہ آئندہ کچھ عرصے تک موجودہ صورت حال برقرار رہے گی!

میں اپنے دوست کی اس پاکستان دوستی کے طفیل اسے اپنے بہت قریب پاتا ہوں

بعض اوقات تو وہ مجھے اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب لگتا ہے وہ اگر چہ میرا بے حد بے تکلف دوست ہے۔ ہر جمعے کو ہم نہاری کھانے لوہاری جاتے ہیں۔ لکشمی چوک میں مالشیے سے سر کی چمپی کراتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی سینما میں ٹوٹے دیکھنے بھی جاتے ہیں۔ اسے جب وقت ملتا ہے' وہ رکشے میں بیٹھ کر میری طرف آ جاتا ہے' جب میں فارغ ہوتا ہوں' کسی موٹر سائیکل والے دوست سے لفٹ لے کر اس کی طرف چلا جاتا ہوں مگر اس کے باوجود نہ میں نے زندگی میں کبھی اس سے فائدہ اٹھایا اور نہ کبھی اس نے مجھ سے کبھی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن میں اور وہ ہال روڈ کی نکر پر شربت تخم لنگاں پی رہے تھے' اس روز وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا اور مجھے اپنی محبوبہ کے قصے سنا رہا تھا کہ کس طرح ان کی پہلی ملاقات سیڑھیوں میں ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد شکر دوپہر میں اپنے مکان کی چھت سے کسی روڑے میں رقعہ لپیٹ کر وہ اس کے مکان کی چھت پر پھینکا کرتا تھا اور کئی دفعہ یوں ہوتا کہ رقعہ کہیں ہوا میں اڑ جاتا اور روڑا گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی بزرگ کی کھوپڑی میں جا لگتا۔ ہم دونوں اس روز بہت خوش تھے' یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے اس دوست سے کوئی فرمائش کی۔ میں نے کہا ''تم جانتے ہو' میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟'' اس نے کہا ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' میں نے کہا ''تمہیں یہ بھی علم ہے کہ سی آئی اے کی پاکستان دوستی کی وجہ سے سی آئی اے کے ساتھ جذباتی وابستگی کس قدر ہے؟''

''ہاں''

''میں آج اس سلسلے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟''

''کہو!''

''میں اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں اور مجھے اس سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے' وعدہ کرو کہ انکار نہیں کرو گے؟''

''وعدہ!'' میرے دوست نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم پاکستان میں مجھے سی آئی اے کا ایجنٹ بنادو۔''

یہ سن کر میرا دوست ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ میرا یہ دوست سنجیدہ بات پر اکثر اسی طرح غیر سنجیدہ ہو جاتا ہے اور وہ اس دن اسی موڈ میں تھا چنانچہ وہ اسی طرح ہنستے ہنستے کہنے لگا ''مجھے افسوس ہے میرے دوست تم نے مجھے بہت مشکل کام کہا ہے چنانچہ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ سی آئی اے کا ایجنٹ صرف ملک کا سربراہ ہوتا ہے۔''

# لعنت ہے مجھ پر

مجھے اشفاق گوجر نے اطلاع دی کہ غلام حسین بہت بیمار ہے اور اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ غلام حسین کے ساتھ میری کوئی دوستی نہیں تھی' میں جب سکول میں پڑھتا تھا تو وہ سکول کے باہر چنوں کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ مجھے یہ شخص اس وقت سے اچھا لگتا تھا' کیونکہ جن بچوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے' وہ انہیں پیار سے اپنے پاس بلاتا اور پلیٹ میں چنے ڈال کر انہیں دیتا' جو بچہ انکار کرتا' یہ اس سے ناراض ہو جاتا اور پیار سے اس کے کان اینٹھتا۔ میں سکول سے کالج' کالج سے یونیورسٹی اور پھر یونیورسٹی سے فارغ ہو کر بطور لیکچرار اپنے پرانے کالج سے وابستہ ہو گیا' مگر میرا گزر جب بھی سکول کے پاس سے ہوتا' میں غلام حسین کے پاس رکتا اور اس کی مزے مزے کی باتیں سنتا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا انسان تھا اور بہت خوش طبع تھا۔ وہ نہ شاعر تھا نہ ادیب' نہ دانشور' مگر ان سب سے اچھا تھا کہ اس کے عمل میں وہ خوشبو تھی جو شاعروں ادیبوں کی تحریروں میں ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اشفاق نے مجھے بتایا کہ غلام حسین بہت بیمار ہے اور وہ جنرل ہسپتال کے ایک وارڈ میں داخل ہے' تو مجھے بہت تشویش ہوئی اور میں نے سوچا کہ میں آج ہی اس کی عیادت کے لیے جاؤں گا!

صبح گھر سے روانہ ہوتے وقت میں نے کاموں کی فہرست والا کاغذ کار کی برابر والی نشست پر رکھا تاکہ میری نظر مسلسل اس پر پڑتی رہے۔ کالج سے فارغ ہو کر نوائے وقت کالم دینے جانا ہے۔ نیاز صاحب سے ملنا ہے' سکھیرا کو فون کرنا ہے' غلام حسین کی عیادت کو جانا ہے۔ اور اس نوعیت کے دس دوسرے کام تھے جو میں نے ترتیب وار اس کاغذ

پر لکھے ہوئے تھے۔ میں دوپہر کے تین بجے تک فہرست کے مطابق اپنے کام نمٹاتا رہا۔ اب صرف غلام حسین کی عیادت باقی رہ گئی تھی' اس وقت مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا پہلے گھر جا کر کھانا کھاتا ہوں' اس کے بعد ہسپتال کا چکر لگالوں گا' سو میں نے گاڑی کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔ کھانا کھانے کے بعد غنودگی سی محسوس ہوئی۔ میں آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا تاکہ چند منٹوں بعد تازہ دم ہو کر گھر سے نکلوں' مگر جب آنکھ کھلی اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے' میں جلدی سے نہا دھو کر فارغ ہوا اور گھر سے نکلنے ہی کو تھا کہ کچھ دوست آ گئے' جب وہ گئے اس وقت شام گہری ہو گئی تھی' میں نے سوچا اب کل غلام حسین کی طرف جاؤں گا' چنانچہ میں کپڑے تبدیل کر کے اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھ گیا اور قراۃ العین حیدر کے نئے ناول کی ورق گردانی کرنے لگا۔

اگلے روز میرا ارادہ کالج سے فارغ ہوتے ہی ہسپتال جانے کا تھا' مگر سٹاف میٹنگ کی وجہ سے نہ جا سکا۔ شام کو ایک تقریب میں پیپر پڑھنا تھا' چنانچہ ایک ریستوران کے گوشے میں بیٹھ کر میں نے پیپر لکھا اور وہاں سے سیدھا تقریب میں چلا گیا' ایک دفعہ پھر شام پڑ گئی تھی' چنانچہ میں تھکا ماندہ گھر پہنچا اور نہا دھو کر اپنی لکھنے پڑھنے کی میز پر آ گیا۔

تیسرے چوتھے اور پانچویں دن بھی کچھ اسی قسم کے اتفاقات ہوئے کہ میں چاہنے کے باوجود غلام حسین کی عیادت کو نہ جا سکا۔ چھٹے روز میں نے مصمم ارادہ کیا کہ آج بہر صورت ہسپتال جاؤں گا' خواہ میرے کتنے ہی ضروری کام کیوں نہ رہ جائیں' چنانچہ میں ابھی گاڑی گیٹ سے نکال ہی رہا تھا کہ اشفاق گوجر اپنی سائیکل پر ہانپتا کانپتا میرے قریب آ کر رُکا اور اس نے مجھے بتایا کہ غلام حسین کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ سن کر مجھے شدید صدمہ ہوا اور میرے ضمیر نے بہت ملامت کی کہ میں نے دنیا کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے ایک بڑے کام کو نظر انداز کیا۔ اشفاق گوجر کے بارے میں' میں نے تو یہ بتایا ہی نہیں کہ وہ پانچویں سے دسویں جماعت تک میرا کلاس فیلو تھا' اس کے سکول کے اخراجات غلام حسین ادا کیا کرتا تھا۔ غلام حسین نے تو اسے کالج میں داخل ہونے کے لیے بھی کہا تھا مگر اشفاق کی بیوہ ماں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ گھر کا خرچ چلانے کے لیے ضروری تھا کہ اب اشفاق اپنے

مرحوم باپ کی طرح سائیکل کی دونوں جانب دودھ کی ولٹوئیاں لٹکائے گھر گھر دودھ پہنچانے کا کام کرے' سو اشفاق اب گزشتہ برس ہا برس سے یہ کام کر رہا تھا' چونکہ اپنے مرحوم باپ کی طرح وہ بھی دودھ میں پانی نہیں ملاتا' لہٰذا مجھے یقین ہے کہ اس کی آئندہ نسل بھی یہی کام کرے گی۔ بہر حال اشفاق نے مجھے بتایا کہ آج شام کو چھ بجے غلام حسین کا جنازہ ہے۔ پانچ بجے کے قریب جب میں گھر سے نکلنے کو تھا' مجھے فون آیا کہ ایک ممتاز شخصیت چھ بجے فون پر آپ سے بات کرے گی' آپ براہِ کرم اس وقت گھر پر رہیں چھ بجے فون آیا کہ اس وقت وہ ایک ایمرجنسی میٹنگ میں ہیں' چنانچہ وہ آپ کو سات بجے فون کریں گے' اس دوران آپ کہیں نہ جائیں' تاہم ان کا فون آٹھ بجے کے قریب آیا اور اب غلام حسین کے جنازے میں شرکت ممکن نہیں تھی' کیونکہ اس وقت تک تو لوگ اسے دفنا کر اپنے گھروں کو بھی لوٹ چکے ہوں گے' میں اپنی دنیا داری پر دل میں بہت نادم ہوا تاہم میں نے تہیہ کیا کہ پرسوں غلام حسین کے قلوں میں ضرور شرکت کروں گا۔

جس دن غلام حسین کے قل تھے' اس دن مجھے ایک دوسرے شہر میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جانا پڑا' کمشنر صاحب نے مجھے خود فون کیا اور معذرت کی کہ اتنے شارٹ نوٹس پر آپ کو بلایا جا رہا ہے' میں نے انہیں بتایا کہ میں نے قلوں میں شرکت کرنی ہے بلکہ میں نے انہیں مرحوم کی انسان دوستی کی صفات سے بھی آگاہ کیا اور اس کے لواحقین کی کسمپرسی کے بارے میں بھی بتایا' جس پر کمشنر صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ لاہور کی انتظامیہ سے بات کر کے مرحوم کے لواحقین کی مالی مدد کا انتظام کر دیں گے۔ اس پر میں نے سوچا کہ مرحوم کے قل میں شرکت سے بہتر اس کے لواحقین کی مالی امداد ہے چنانچہ میں مشاعرے میں چلا گیا' ویسے بھی دل کو یہ اطمینان تھا کہ ابھی مرحوم کا چہلم ہونا ہے' میں اس میں شریک ہو کر ضمیر کی خلش رفع کر لوں گا۔

مگر ہوا یوں کہ اس دوران مجھے امریکہ میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے یو ایس آئی ایس کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا اور یوں مجھے چھ ہفتے کے لیے ملک سے باہر جانا پڑ گیا' میں نے سوچا تھا کہ کانفرنس کی بجائے غلام حسین کے

چہلم میں شرکت کروں، مگر پھر ملکی وقار کا مسئلہ سامنے آ گیا' اس کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی بہت ضروری تھی' چنانچہ بادل نخواستہ امریکہ کے لیے روانہ ہو گیا!

دو دن پہلے اشفاق گوجر سے میری سرراہے ملاقات ہوگئ' مجھے دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ مجھ سے بے حد ناراض تھا کہ میں غلام حسین کی عیادت کے لیے نہیں گیا بلکہ اس کے جنازے قلوں اور چہلم میں بھی شرکت نہیں کی۔ میں نے اسے بتایا کہ حالات نے مجھے بڑا آدمی بنا دیا ہے بے حد شرمندہ ہوں مگر ایسا سخت مجبوریوں کی وجہ سے ہوا' تاہم اب میں اپنی اس کوتاہی کی تلافی کروں گا۔ اشفاق نے پوچھا وہ کیسے؟ میں نے کہا وہ ایسے کہ میں غلام حسین پر ایک کالم لکھوں گا جو اخبار کے سارے ایڈیشنوں میں شائع ہوگا اور یوں مرحوم کی شہرت دور دور تک پھیل جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ اشفاق میری اس بات سے خوش ہوگا مگر اس کی موٹی عقل میں کالم کی بات نہیں آئی۔ کہ اسے اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں۔ چنانچہ اس نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو روپے کے کچھ نوٹ نکالے اور انہیں میری جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا "تمہیں اس کالم کے جتنے پیسے ملنے ہیں' وہ میں تمہیں دے رہا ہوں' میری درخواست ہے کہ غلام حسین پر کالم نہ لکھنا وہ بہت غیور شخص تھا!" اور پھر وہ دھوتی کو سنبھالتے ہوئے پیڈل پر پاؤں رکھ کر سائیکل کی گدی پر بیٹھا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا! اور میں اس وقت سے "لعنت ہے مجھ پر" کا ورد کر رہا ہوں۔

❖❖❖

# صاحب کا دوست!

میرا وی آئی پی دوست ایئر پورٹ پر نہیں' جہاز کی سیڑھیوں کے پاس میرے استقبال کے لیے موجود تھا'' "عام" مسافر ایک ایک کر کے پی آئی اے کی بس میں سوار ہونے لگے' میرے دوست نے ذرا فاصلے پر کھڑی اپنی "لیموزین" کی طرف اشارہ کیا' کار کے قریب پہنچ کر میں نے ہاتھ دروازے کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ باوردی ڈرائیور دوڑا دوڑا میرے پاس آیا' خاصا خوش اخلاق آدمی تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا مگر میرے ہاتھ بڑھانے پر اس نے جس طرح کھسیانا سا ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر مصافحہ کرتے ہی کار کا دروازہ جس برق رفتاری سے کھولا' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ صاحب کے دوست سے ہاتھ ملانے کی گستاخی وہ نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ بچارا تو صرف دروازہ کھولنے کے لیے میری طرف اندھادھند بڑھا تھا!

"دفتر چلو" میرے دوست نے شوفر کو حکم دیا۔

شوفر نے کچھ کہے بغیر روبوٹ کی طرح سر ہلایا اور گاڑی دفتر کے راستے پر ڈال دی۔ راستے میں ٹریفک پولیس گاڑیاں روک کر کاغذات چیک کر رہی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی روکی تو سارجنٹ نے کھڑکی کے پاس جھک کر ڈرائیور سے کاغذات طلب کیے' اس کے جواب میں ڈرائیور نے کاغذات دکھانے کی بجائے پچھلی سیٹ پر بیٹھے اپنے صاحب کی طرف اشارہ کر کے ان کا تعارف کرایا۔ سارجنٹ نے ایک نظر پچھلی سیٹ پر ڈالی اور ہڑ بڑا کر "سوری سر" کہنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا!

دفتر سے ملحقہ کمرے میں سائلوں کا ایک ہجوم تھا' ان میں خواتین بھی تھیں اور مرد

بھی تھے۔ میرے دوست نے چٹوں پر لکھے ہوئے نام اور وزیٹرز کارڈ کی ڈھیری میں سے ایک چٹ اُٹھائی اور چپراسی سے کہا: ''انہیں بلاؤ'' تھوڑی دیر بعد دو خواتین اپنی موجودگی کا پوری طرح احساس دلاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں' یہ ایک ممتاز گھرانے کی صاحب زادیاں تھیں' جب وہ کمرے سے چلی گئیں تو میں نے حیرت سے اسے اپنے دوست سے کہا: ''میں انہیں جانتا ہوں مگر یقین نہیں آتا یہ وہی ہیں!'' دوست کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری اور اس نے کہا: ''میں انہیں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں اور یقین کرو یہ وہی ہیں!۔''

دوپہر کو کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے دفتر سے نکلے تو دس بارہ چپراسی اپنی جگہ پر مودب کھڑے ہو گئے' صاحب کا بریف کیس ایک چپراسی نے پہلے سے قابو کیا ہوا تھا' باقیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ صاحب کا بوجھ کیسے ہلکا کریں۔ صاحب سے مایوس ہو کر چپراسیوں نے مجھے اُمید بھری نظروں سے دیکھا' میرے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی' ان میں سے دو چپراسی میری طرف دیوانہ وار لپکے اور ان میں سے ایک نے میرے ''نہ نہ'' کہنے کے باوجود کتاب میرے ہاتھ سے لے لی' ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ رکھی ہوئی تھی' ہمیں آتا دیکھ کر وہ پھرتی سے کار میں سے باہر نکلا اور پوری کار کے گرد گھوم کر بایاں دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا' بریف کیس والے چپراسی نے اپنی رفتار تیز کر دی اور آگے بڑھ کر دوسرا دروازہ اس نے کھول دیا۔

''سنو'' میرے دوست نے منمناتے ہوئے کہا:

اس پر تینوں اس تیزی سے اپنے صاحب کی طرف بڑھے کہ آپس میں ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

''میں واپس دفتر نہیں آؤں گا!'' میرے دوست کی منمناہٹ سنائی دی۔

''ٹھیک ہے سر!''

کار میں بیٹھنے کے بعد میں نے دروازہ بند کرنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ

بڑھایا مگر مجھے یہ زحمت نہ اٹھانا پڑی' دروازہ اس سے پہلے ہی بند کر دیا گیا تھا۔

صاحب کی کار کا ہارن سن کر ملازمین کوٹھی کا دروازہ کھولنے کے لیے اس طرح دوڑے جیسے یہ ساتواں در تھا جس کے کھلتے ہی ان کے نصیب جاگ اُٹھیں گے۔ ایک لمبی ڈرائیو کے بعد کار پورچ میں آ کر رُکی تو ڈرائیور ایک دفعہ پھر برق رفتاری سے باہر نکلا اور کار کے گرد گھوم کر بائیں دروازے تک پہنچا' ایک ملازم نے دایاں دروازہ کھولا اور یوں ہم دونوں باہر آ گئے۔ دروازہ کھلنے کے انتظار میں اپنی سیٹ پر بیٹھے رہنے کا تجربہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا بلکہ سچی بات ہے کہ مجھے ابھی تک کوئی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان عزت کرنے والوں کی بہتات سے میرے اندر کوئی کمی واقع ہو رہی ہے۔

ملازموں کی خدمت طلب نظروں سے لگتا تھا کہ انہیں ہمارا کمرے تک پیدل جانا اچھا نہیں لگ رہا چنانچہ ان کا بس چلے تو ہمیں کاندھوں پر اُٹھا کر اندر کرسیوں تک چھوڑ آئیں' تاہم اس کی نوبت نہیں آئی۔

کھانے کے دوران میرے دوست نے پوچھا "تمہاری کتنے سال کی سروس ہو گئی ہے؟"

"اٹھارہ سال"! میں نے جواب دیا۔

"اور ابھی تک تم لیکچرار کے لیکچرار ہی ہو؟"

اس پر لقمہ میرے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے آہستہ سے اپنے دوست سے کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو یار' ان منکر نکیروں کو تو پہلے یہاں سے غائب کرو جو خواہ مخواہ سر پر کھڑے ہیں۔" میرے دوست کے ایک اشارے پر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

"وہ کون سی ایسی بات تھی جو تم ان کے سامنے نہیں کر سکتے تھے؟ دوست نے پوچھا۔

"یہی لیکچرر شپ والی بات جو تم نے ان کے سامنے کر دی ہے؟"

"تو اس میں کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کوئی نہیں' میں نے کہا "مگر اس سے ان خدمت گزاروں کے جذبات یہ سوچ کر مجروح ہوئے ہوں گے کہ اتنی دیر سے جس شخص کی وہ ناز برداریاں کر رہے تھے' وہ بچارا "ماسٹر ہے!"

یہ سن کر دوست نے قہقہہ لگایا اور بولا "میں تو تمہیں بیسیوں دفعہ ڈھنگ کی نوکری کی پیش کش کر چکا ہوں' مگر تمہارے دماغ ہی سے خوئے سلطانی نہیں جاتی!"

کھانے کے بعد دوست مجھے گیسٹ روم میں لے آیا "گھر میں آج کوئی بھی نہیں ہے لہٰذا تم ایزی ہو جاؤ۔ تم کچھ دیر آرام کرو' میں اتنی دیر میں کچھ کام کر لیتا ہوں۔"

صاحب کا ایک ملازم میرا اٹیچی کیس کار کی ڈکی میں سے نکال کر کمرے میں لے آیا' میں نے اس میں سے سلیپنگ سوٹ نکالا اور ڈریسنگ روم میں لباس تبدیل کر کے کمرے میں لوٹا تو وہی ملازم جیسے میرا منتظر تھا کیونکہ میرے چارپائی پر بیٹھتے ہی وہ قالین پر بیٹھ گیا اور اس نے میری ٹانگیں دبانا شروع کر دیں' مجھے مالش کا بہت چسکا ہے اور یہ ان خواہشوں میں سے ایک ہے جن پر قابو پانا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے مگر پتہ نہیں اس وقت مجھے یہ اچھا کیوں نہیں لگا' چنانچہ میں نے اپنی ٹانگیں اوپر کھینچ لیں اور کہا۔ "اب تم جاؤ' مجھے آرام کرنا ہے!" اس نے "بہت اچھا صاحب" کہا اور روبوٹ کی طرح سر جھکائے کمرے سے نکل گیا۔

چار بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا میرے جوتے آئینے کی طرح چمک رہے تھے اور جو سوٹ میں نے اتارا تھا' وہ استری شدہ پڑا تھا' ملازم نے ہولے سے دروازہ کھولا اور جھانک کر اندر دیکھا' میری نیند کے دوران وہ شاید کتنی ہی دفعہ اس طرح جھانک کر گیا تھا کہ ممکن ہے کہ صاحب جاگ گئے ہوں اور انہیں بلانے کے لیے آواز نہ دینا پڑے۔ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ اُلٹے پاؤں واپس مڑا اور تھوڑی دیر بعد ٹرے میں چائے لے آیا۔

شام کو میرے دوست نے اپنے اور میرے چند مشترکہ دوستوں کو ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنے سیکرٹری کو بلایا اور اسے اپنی انکم ٹیکس سٹیٹ منٹ تیار کرنے' پاسپورٹ پر امریکہ کا ویزہ لگوانے' جہاز کا ٹکٹ خرید نے اور ایسے کتنے ہی چھوٹے بڑے کاموں کے بارے میں ہدایات دیں اور پھر ہم کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ کار تک پہنچتے پہنچتے ان تمام آسائشوں اور عزت افزائیوں کا ایک دفعہ پھر نظارہ کیا جو میں صبح سے اب تک متعدد بار کر چکا تھا!

تین دن اپنے دوست کے ساتھ گزارنے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سوئی گیس' ٹیلی فون اور پانی کا بل جمع کرانے' خطوں کا جواب دینے' صبح آٹھ بجے کالج پہنچنے' گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے قرضوں کے حصول اور ان کی واپسی کے بارے میں سوچنے' دفتروں میں پھنسے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے پریشان ہونے اور اس نوع کے کتنے ہی دوسرے بوجھ میرے ذہن سے اُتر چکے ہیں۔ میں ابھی کچھ دن مزید اسی فضا میں رہنا چاہتا تھا کیونکہ اب مجھے اس کا لطف آنے لگا تھا۔ مگر مجھے یاد آیا کہ گھر کے کتنے ہی کام میری وجہ سے رکے ہوئے ہیں' چنانچہ مجھے مجبوراً واپس لاہور۔ آنا پڑا!

ائیرپورٹ پر اُتر کر میں لاؤنج میں داخل ہوا تو اپنا اٹیچی کیس اُٹھاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے منوں بوجھ اُٹھایا ہو۔ یہ اٹیچی کیس ٹرالی میں رکھ کر جب میں عام مسافروں کے ساتھ باہر نکلا تو کچھ عجیب طرح کی ندامت محسوس ہوئی۔ میں اپنی گاڑی ائیرپورٹ پر کھڑی کر کے گیا تھا۔ کار کا دروازہ خود کھولتے ہوئے مجھے خاصی تکلیف ہوئی: میں اپنا پیریڈ مس نہیں کرنا چاہتا تھا' چنانچہ میں سیدھا کالج پہنچا جب میں کالج گیٹ میں داخل ہو رہا تھا' گیٹ پر کھڑے میر زمان نے بونٹ کو زور سے کھٹکھٹا کر مجھے رکنے کو کہا' پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کی طرف آیا اور بولا " صاحب! جاتی دفعہ بتا کر جایا کرو کہ کب واپس آ رہے ہو۔ لوگ میرا دماغ خراب کرتے ہیں۔" پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ چھ چٹیں میرے ہاتھ میں تھما دیں!

جب میں اپنے کمرے کے پاس پہنچا تو نائب قاصد خالد مجھے دیکھ کر تیزی سے میری طرف آیا' میرے ہاتھ میں کتاب تھی' وہ میں نے اس کی طرف بڑھادی' مگراس نے کتاب تھامنے کی بجائے مجھ سے مصافحہ کیا اوراس کے بعد پورے تین پھیروں والا معانقہ مکمل کیا۔ میں نے ایک بازو والی کرسی پر بیٹھنے کے بعد جیب میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر خالد کو دیا اور کہا ''صدیقی صاحب سے چینک مانگ کر خان سے ہاف سیٹ چائے اور ایک بند مکھن لے آؤ۔ ایک روپیہ فی الحال تم اپنی جیب سے ڈال لینا!''

# اک گھر بناؤں گا

میرے ایک صحافی دوست نے جو ''صحافت کی سیج'' پر زندگی بسر کرنے کے باوجود ہنوز صرف تنخواہ پر گزارا کرتا ہے' گزشتہ روز سولہ سوا یکڑ سکیم میں دس مرلے زمین کے لیے رقم کی پہلی قسط ایل ڈی اے میں جمع کرائی ہے اوراب تک ''تصورِ جاناں'' میں آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔ ''یہ تصورِ جاناں'' ذاتی گھر کا تصور ہے چنانچہ وہ اس وقت سے مکان کا نقشہ تیار کرنے میں مشغول ہے اوراس کی تعمیر کے ضمن میں دیگر امور پر غور وفکر کر رہا ہے جہاں تک مکان کے نقشے کا تعلق ہے' اس کے لیے وہ کاغذ پر کھنچی اُلٹی سیدھی لکیروں سے زیادہ بنے بنائے مکانات کے ''معائنے'' کو ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ کل سے وہ اپنے سکوٹر پر گلبرگ وغیرہ کے علاقے میں مارا مارا پھر رہا ہے۔' اس دوران وہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بھی بچا ہے کیونکہ بقول میر درد ''دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے'' وہ سکوٹر چلاتے وقت دیکھتو سامنے رہا ہوتا ہے مگر اس کا دھیان دائیں بائیں جانب واقع خوبصورت کوٹھیوں کے نقشے ذہن میں محفوظ کرنے میں مشغول رہتا ہے۔

آج صبح میرا یہ دوست ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور کہا:

''مکان کا مسئلہ حل ہو گیا!''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک ڈیزائن پسند کرلیا ہے۔ بہت کمال کی کوٹھی ہے' اس کے آگے چھ کنال کا لان ہے!''

''وہ تو ٹھیک ہے'' میں نے کہا ''مگر دس مرلے زمین میں چھ کنال کے لان کی گنجائش نکالنا قدرے مشکل ہوگا۔''

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے روہانسا ہو کر کہا ''پھر کیا کیا جائے''؟

''فی الحال تم ''آدم جی کی لان'' پر گزارا کرو' بعد میں دیکھا جائے گا!''

دس مرلے زمین میں چھ کنال لان والے منصوبے میں کمی بیشی کرتے ہوئے اس نے بالآخر دس فٹ لان پر رضا مندی کا اظہار کیا اور کہا ''میرا ارادہ ڈبل سٹوری تعمیر کرنے کا ہے۔ نیچے دو بیڈ روم' ایک ڈرائینگ ڈائننگ' گیراج کے اوپر ایک خوبصورت سا کمرہ' جس میں باہر کی طرف دبیز شیشوں والی کھڑکیاں ہوں۔!''

گیراج بنا کر کیا کرو گے اکیلا سکوٹر وہاں پریشان ہوگا!''

''نہیں یار' گیراج ضرور ہونا چاہیے' اس کا دروازہ بند رکھا کروں گا۔ باہر سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ کار اندر کھڑی ہے!''

''تم اگر گیراج کا دروازہ کھلا رکھو' تو بھی کوئی حرج نہیں' کیونکہ لوگ سمجھیں گے کہ کار کہیں باہر گئی ہوئی ہے''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہاں یاد آیا میں باتھ رومز کے معاملے میں بہت حساس ہوں' میں نے سوچا ہے کہ اپنی کوٹھی میں بہت وسیع و عریض باتھ رومز بناؤں گا اور اس میں تمام جدید ترین آسائشیں ہوں گی۔ یہ میری بہت شدید خواہش ہے!''

''یہ آئیڈیا بھی بُرا نہیں'' میں نے کہا ''باتھ روم واقعی ایسا ہونا چاہیے کہ اگر کبھی مہمان زیادہ آجائیں تو ان میں سے کچھ کو باتھ روم میں ٹھہرایا جاسکے!''

وسیع و عریض اور جدید ترین آسائشوں سے آراستہ باتھ رومز کے سلسلہ میں جب میں نے متذکرہ نوع کی ''آراء'' سے اپنے دوست کو اس پر رضا مند کرلیا کہ فی الحال اسے باتھ روم اور ڈرائینگ روم میں ایک ہلکا سا امتیاز قائم رہنے دینا چاہئے نیز اس امر کا قائل بھی

کرلیا کہ عالی شان کوٹھی کی بجائے رہنے کے لیے ایک اوسط درجے کا گھر کافی ہے تو اس نے کہا "چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، مگر مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے، کچھ مشورہ اس کے بارے میں بھی دو"؟

"کیا رکاوٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پیسہ نہیں ہے!"

"تم نے اس سلسلے میں تخمینہ لگوایا ہے؟"

"ہاں۔ اوسط درجے کا مکان بھی تعمیر کیا جائے تو کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپے لگتے ہیں!"

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"ساٹھ ہزار روپے ہاؤس فنانس کارپوریشن والوں سے قرض لے لوں گا!"

"اور باقی؟"

"قریباً 5 ہزار روپے کی مالیت کے زیورات ہیں، کچھ قرض یہ زیور رہن رکھنے کی صورت میں مل جائے گا!"

"دس ہزار یہ ہو گئے، باقی؟"

"سکوٹر بیچ دوں گا!"

"میں نے سکوٹر کی ہیئت کذائی مدنظر رکھی اور کہا "دو ہزار روپے۔ باقی؟"

اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں اور پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا "کچھ رقم تم سے قرض لوں گا!"

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا "سو روپیہ یہ ہو گیا۔ باقی؟"

"تم ٹوٹل لگاؤ" اس نے بے زار ہو کر کہا "پہلے دیکھیں یہ رقم کتنی بنتی ہے؟"

''بہتر ہزار ایک سو!''

''مزید کتنی رقم درکار ہے؟'' ''قریباً اتنی ہی رقم اور درکار ہے؟''

''ٹھیک ہے' انتظام ہو جائے گا!'' اس نے اچانک پر اُمید ہو کر کہا۔

''وہ کیسے'' میں نے پوچھا۔

''میں لائف انشورنش کرالوں گا!''

''مگر اس سے مکان کیسے بنے گا!''

''بن جائے گا'' اس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''انشورنش کرانے کے بعد میں خودکشی کرلوں گا۔ اگر میں نہیں تو میرے بچے اپنے مکان میں ضرور رہیں گے!''

❖❖❖

# کوڑھ کرلی!

پشاور کے ایک ہوٹل میں رات کو نرم نرم بستر پر دراز ہوتے ہوئے میری نظریں چھت کی طرف اٹھیں تو اپنے سر کے عین اوپر ذات کی ایک کوڑھ کرلی (چھپکلی) کو شہتیروں سے جھپے ڈالتے دیکھا' میں ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھ بیٹھا اور سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گیا میرا دوست سونے کی تیاریاں کر رہا تھا' اس نے میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں تو آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''چھپکلی!'' میں نے گھٹی گھٹی آواز میں چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو تم گویا چھپکلی سے ڈرتے ہو۔'' اس نے چھت کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے ہنس کر کہا ''آرام سے سو جاؤ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی' اس نے ''فوڈ پوائزننگ'' نہیں کرانی!''

''میں کوڑھ کرلی سے ڈرتا نہیں ہوں'' میں نے ڈرتے ڈرتے صورتحال کی وضاحت کی۔ ''مجھے اس سے شدید کراہت محسوس ہوتی ہے اور جب تک یہ کمرے میں موجود ہے میری آنکھوں میں نیند نہیں اتر سکتی۔''

''تم ادھر میری چارپائی پر آ جاؤ! میں تمہاری جگہ سو جاتا ہوں!''

''ایک دوسرے کی جگہ بدل کر سونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مسئلہ جاگنے سے حل ہوگا۔ پتہ نہیں یہ کس وقت چھت سے سیدھی منہ میں آ گرے اور پھر تم نہ اسے نگل سکو اور نہ اگل سکو!''

''آخ تھو!'' دوست نے اپنے بستر سے چھلانگ لگائی اور ملحقہ غسل خانے میں

تھوکنے کے لیے لپکا ''تم بہت غلط آدمی ہو خواہ مخواہ مجھے بھی کانشس (Conscious) کر دیا ہے!''

میں نے دزدیدہ نگاہوں سے ایک بار پھر چھت کی طرف دیکھا کوڑھ کرلی بلب کے گرد جمع پروانوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی وہ انہیں غافل پا کر اچانک ان کی طرف لپکی اور ایک پروانے کو نگل لیا اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ کافی دیر سے اس مشغلے میں مصروف ہے!

''پھر اب کیا کیا جائے!'' مجھ سے زیادہ اب میرے دوست کو تشویش لاحق ہو گئی تھی وہ غسل خانے میں جا کر تھوکنے کے بعد سے اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھا تھا!

''اسے کمرے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے نظریں اِدھر اُدھر دوڑا کر کوئی چیز تلاش کرتے ہوئے کہا لیکن کمرے میں بجز ہمارے اٹیچی کیسوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

''ہش ہش'' دوست نے مایوسی کے عالم میں منہ سے آوازیں نکال کر چھپکلی کو بھگانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے کریہہ ہاتھ اور ٹانگیں چھت پر مضبوطی سے جمائے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پروانوں پر جمائے ہوئے تھے۔

''غڑاپ'' اس نے ایک اور پروانہ نگل لیا تھا اور اب وہ اپنی سرخ سرخ زبان باہر نکال رہی تھی۔

میں نے کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑی تھوری دیر بعد دزدیدہ نظرں سے کوڑھ کرلی کو دیکھ لیتا تھا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی موجودگی میں نرم نرم بستر پر دراز ہو جاؤں!

''ہش۔ ہش'' اب کے دوست نے ہوائی چپل اٹھالی تھی اور اسے دیوار کے ساتھ بجا بجا کر کوڑھ کرلی کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن چھپکلی اس صورت حال سے بے نیاز اپنے شکار میں مشغول تھی!

دوست نے کمرے میں بڑی تپائی کو بستر پر رکھا اور اس پر چڑھ کر زیادہ قریب سے اسے بھگانے کی کوشش کی اس کی یہ کوشش قدرے کامیاب ہوئی کیونکہ چھپکلی نے ایک جست لگائی اور تیزی سے کمرے کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔

اب وہ اپنے گول گول دیدے اِدھر اُدھر گھما کر صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی تاہم اس دوران اس نے ایک اور پروانہ شکار کرلیا تھا'

''اب کیا کیا جائے؟'' دوست نے چپل کو زمین پر رکھتے ہوئے ایک طویل جماہی لی اور کہا ''یہ تو ابھی تک کمرے ہی میں ہے!''

''ایک دفعہ پھر کوشش کی جائے۔'' میں نے جواب دیا ''میں جانتا ہوں ہوں تم سارے دن کے طویل سفر سے تھکے ہوئے ہو اور تمہاری آنکھوں میں نیند تیر رہی ہے' لیکن اگر تم سو گئے تو یہ چھت سے سیدھی تمہارے منہ میں..........''

''آخ تھو'' اس نے برا سا منہ بنایا اور ایک بار پھر تھوکنے کے لیے غسل خانے کی طرف دوڑا اب کے میں نے چپل اٹھائی اور اسے دیوار کے ساتھ بجاتے ہوئے کرلی پر یلغار کردی' وہ خوفزدہ ہوگئی تھی اور اس نے تیزی سے اِدھر سے اُدھر بھاگنا شروع کردیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ روشن دان کے رستے باہر نکل جائے لیکن اسے اپنے اردگرد پروانے نظر آرہے تھے جنہیں اس نے ابھی شکار کرنا تھا چنانچہ وہ گھوم پھر کر ایک جگہ آن کھڑی ہوتی تھی اور اپنے مکروہ پاؤں اس خوبصورت کمرے کی چھت اور دیواروں میں گاڑ دیتی تھی اس کی مکار آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا اور وہ بار بار اپنی زبان باہر نکالتی تھی!

''رک جاؤ!'' میرے دوست نے میری سانس پھولتے دیکھی تو کہا۔ہم کمرے کی بتی بند کردیتے ہیں۔!یہ خود بخود باہر نکل جائے گی۔!''

''وہ اندھیرے میں اپنا شکار زیادہ مہارت سے کرے گی اور دوسری طرف ہم اس سے غافل ہوجائیں گے۔ یہ بتی جلتی رہنی چاہیے اندھیروں میں آسیب پلتے ہیں!'' میں نے کہا۔

"تو پھر یوں کرتے ہیں۔ روشن دان اور کھڑکیاں بند کر کے چپل سے اس کا نشانہ لیتے ہیں بعد میں اسے دم سے پکڑ کر باہر پھینک دیں گے!"

"یہ تم کیسی باتیں سوچ رہے ہو۔" مجھے متلی سی محسوس ہوئی۔ "ہم نہ اسے نشانہ بنائیں گے اور نہ روشن دان اور دریچے بند کریں گے روشن دان کھلے رہنے چاہئیں' تازہ ہوا آتی رہنا چاہیے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" اس نے روہانسا ہو کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں' سوائے اس کے کہ اسے کمرے سے نکالا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اسے گھیر گھار کر روشن دان کی طرف لاؤ اور میں اسے روشن دان سے باہر کی طرف دھکیل دوں گا۔ ہم دونوں کی مشترکہ کوشش سے یہ کمرہ کوڑھ کرلی سے چھٹکارا حاصل کرلے گا۔!"

"ٹھیک ہے!" دوست نے چپل ہاتھ میں لی۔ "تم دوسری طرف کھڑے ہو جاؤ۔ اس بار یہ کمرے سے باہر نظر آنی چاہیے۔"

کچھ دیر بعد چھپکلی واقعی کمرے سے باہر تھی۔ ہم اطمینان سے اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

"یار! ایک بات تو بتاؤ۔" میرے دوست نے خالی چھت کی طرف سکون بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پروانے اتنے نادان کیوں ہیں۔؟ چھپکلی کتنی دیر تک ایک ایک کر کے انہیں نگلتی چلی گئی ہے لیکن وہ اس کے باوجود غافل رہے اور اس کا شکار ہوتے چلے گئے!"

"یہ کمال چھپکلی کا نہیں بلب کا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پروانے اس کی چکاچوند کے اسیر رہے اور کوڑھ کرلی اپنے کام میں مشغول رہی۔ شکار کی آنکھیں مصنوعی روشنی سے خیرہ کر دی جائیں تو وہ باآسانی شکار ہو جاتا ہے۔"

"خیر چھوڑو۔" دوست نے بستر پر ٹانگیں پسارتے ہوئے مسکرا کر کہا "آج بہر

حال یہ پتہ ضرور چل گیا کہ کوڑھ کرلی دیکھ کر تمہاری گھگی بندھ جاتی ہے۔''

''میں کوڑھ کرلی سے نہیں ڈرتا۔'' میں نے ایک بار پھر سہمی سہمی دزدیدہ نگاہوں سے درودیوار کا جائزہ لیا ''میں کوڑھ سے ڈرتا ہوں۔ میں نے کوڑھیوں کو دیکھا ہے وہ اپنے ہاتھوں پر زخم سجا کر بازاروں میں بھیک مانگتے ہیں۔ ہم اپنے ماتھوں پر زخم سجا کر بازاروں میں بھیک نہیں مانگیں گے۔ ہم یہ کوڑھ کرلیاں نہیں پلنے دیں گے۔! جن کی خوراک ورکروں کی زندگیاں ہیں۔''

# سورج کے مقابل

فضل مکینک نے سکوٹر کے سوئچ کو ''ٹو'' کر دیکھا اور کہا ''صاحب جی! آپ کو نیا سوئچ لگوانا پڑے گا' جو پچانوے روپے میں ملے گا۔ میں آپ کو کنکشن جوڑ دیتا ہوں' بس اتنا ہے کہ لائٹ دن کو بھی آن رہے گی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی۔ کام ہی تو چلانا ہے!''

اور پھر اس نے تاریں جوڑ جوڑ کرنٹ بولٹ کسے اور ایک دوسرے لمبریٹا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے سکوٹر کو کک لگائی اور میکلوڈ روڈ سے میو ہسپتال کی طرف ہو لیا' جہاں مجھے ایک مریض کی عیادت کرنا تھی ابھی میں دس قدم ہی گیا تھا کہ سامنے سے آنے والے ایک سکوٹر سوار نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے مجھے سکوٹر کی لائٹ آن ہونے کا اشارہ دیا میں نے ہاتھ لہرا کر اس سکوٹر سوار کا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا تھوڑی ہی دیر بعد سامنے والی ایک کار نے اپنی رفتار آہستہ کی اور پھر ڈرائیور نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر مجھے جلتی بتی کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے گردن کے اشارے سے اطلاع دی کہ میں اس مذموم حرکت سے آگاہ ہو گیا ہوں اور اس کے سدباب کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاؤں گا۔ ہال روڈ سے دائیں جانب مڑنے کے لیے مجھے ٹریفک سگنل کے بند ہونے کے انتظار میں کچھ دیر کے لیے رکنا پڑا۔ میں نے سگنل کے دوسری طرف کھڑے سکوٹروں' رکشوں' اور کاروں پر یونہی ایک نظر ڈالی تو دیکھا ان سب نے اپنے اپنے ہاتھ باہر نکالے ہوئے تھے اور انگلیوں کو کھولتے بند کرتے ہوئے مجھے سکوٹر کی لائٹ آن ہونے کے بارے میں مطلع کر رہے تھے میں نے گھبرا کر سکوٹر کو گیئر میں ڈالا اور سگنل

کے سبز ہونے کا انتظار کیے بغیر تیزی سے دائیں جانب کو مڑ گیا۔

اپنے عزیز کی عیادت سے فارغ ہو کر میں واپس سکوٹر سٹینڈ پر آیا اور ٹھیکیدار کو ٹوکن اور پیسے دے کر میں نے سکوٹر سٹارٹ کیا' جس کے ساتھ ہی لائٹ بھی آن ہوگئی۔ ٹھیکیدار نے کہا ''بابو جی! بتی جل رہی ہے۔'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور فل تھروٹل دے کر سکوٹر کو اپنے گھر کی جانب ڈال دیا میو ہسپتال کے دروازے سے بائیں جانب کو مڑتے ہی ایک سائیکل سوار اپنا ایک ہاتھ منہ کے گرد رکھ کر زور سے چلایا۔ ''بتی!'' میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ہال روڈ سے ہو کر شاہراہِ قائداعظم پر آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں دنیا کا احمق ترین آدمی ہوں اور ہر شخص مجھے دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ چنانچہ میں نے سامنے سے آنے والے ٹریفک کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور کانوں پر مہر لگادی۔ تیزی سے قریب سے گزرنے والے لوگ مسلسل اپنا ''فریضہ'' انجام دینے میں مشغول تھے مگر اب مجھے ان کی پرواہ نہیں تھی چیئرنگ کراس کے قریب ٹریفک سگنل ایک بار پھر لالو لال نظر آیا۔ غالباً اسے بھی میری لائٹوں کا آن ہونا کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ اتنی دیر میں ایک سکوٹر سوار تیزی سے آیا اور اس نے اپنا سکوٹر میرے برابر میں کھڑا کر دیا۔ ''آپ بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہیں اگر بتی سرخ نہ ہوتی تو آپ نکل گئے تھے۔'' اس نے اپنی عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا ''میں نے پیچھے سے مسلسل ہارن دیئے مگر آپ نے توجہ ہی نہیں کی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ آپ کی لائٹ آن ہے۔''

مزنگ چونگی تک پہنچتے پہنچتے میرے اعصاب جواب دے گئے کیونکہ اب پیدل چلنے والوں نے بھی میرے ساتھ اشارے بازی شروع کردی تھی۔ ایک سکول میں چھٹی ہوئی تھی اور بچے بستے بغل میں دبائے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے' میں نے سکوٹر کی رفتار تیز کردی' میرے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ بچے میرے پیچھے ''پھکوی'' لگائے ہوئے ''پاگل ای اوئے پاگل ای اوئے'' کا کورس شروع نہ کردیں۔ ایل۔او۔ایس کے قریب سامنے سے آتے ہوئے میرے ایک دوست نے اشارے سے مجھے روکا اور کہا ''میں اس وقت جلدی میں ہوں' تم سے پھر ملاقات ہوگی' لیکن دن کے وقت بتی جلانے

کا کیا تک ہے۔؟''

اب میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ میں نے شدید جھنجھلاہٹ کے عالم میں سکوٹر واپس موڑا اور پوری رفتار سے میکلوڈ روڈ واپس پہنچ گیا فضل ایک سکوٹر کی اوور ہالنگ میں مشغول تھا۔ میں نے مضمحل انداز میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا ''میں سکوٹر یہیں چھوڑے جا رہا ہوں اس کی لائٹ کی تاریں ڈس کنکٹ کر کے نیا سوئچ ڈال دو۔ میں کل لے جاؤں گا۔''

''کیوں کیا بات ہے۔؟'' فضل نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا'' کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے؟''

''نہیں!'' میں نے اپنی جبیں سے عرق ندامت پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ''لوگ بہت حساس ہوگئے ہیں جھوٹی روشنیوں نے انہیں بہت دیر تک اندھیرے میں رکھا ہے اب وہ سورج کے سامنے بے نور چراغ نہیں جلنے دیتے!''

❖❖❖

# برگد کے نیچے

میں اور میرا ساتھی شہر کی ایک ماڈرن بستی میں چہل قدمی کرتے ہوئے دور نکل گئے یہ امیر ترین لوگوں کی بستی تھی اور یہاں رہنے والے تمام آسائشوں سے بہرہ ور تھے ہمارے قریب سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی چمکیلی کار گزر جاتی، جس میں خوشنما چہرے خوشنما لبادوں میں ملبوس بیٹھے نظر آتے۔ سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے بنگلے ایستادہ تھے جن کے وسیع و عریض لان میں اودے اودے، نیلے نیلے اور پیلے پیرہنوں والے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے، یہ باہر کے خیرہ کن مناظر تھے۔ جنہیں ہماری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ ان بنگلوں کے اندر کی دنیا ہم سے اوجھل تھی۔

چلتے چلتے غیر ارادی طور پر میں اور میرا ساتھی سڑک کے دائیں ہاتھ ایک ڈھلوان میں اتر گئے اور ہمیں یوں لگا جیسے الف لیلیٰ کے ابوالحسن کو عالیشان محل اور حسین کنیزوں کے جھرمٹ سے اٹھا کر واپس اسی ماحول میں بھیج دیا گیا ہے، جہاں سے اسے لایا گیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک کچی سی گلی تھی، جس کی نکڑ پر چائے کی دکان تھی جسے ''پردیسی ہوٹل'' کا نام دیا گیا تھا۔ بائیں جانب ایک ٹیلے پر کسی بزرگ کا مزار تھا اور یہاں سبز علم لہرا رہے تھے دائیں جانب ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور یہاں میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بچے مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ یہ گلی ذرا آگے چل کر چوڑی ہو گئی تھی اور اس کے درمیان کنواں تھا۔ ایک عورت کنویں میں سے بوکے کے ذریعے پانی نکال رہی تھی اور دوسری عورت اپنی باری کے انتظار میں بالٹی پاؤں میں رکھے منڈیر پر بیٹھی تھی۔ سامنے والے مزار کے صحن میں ایک سفید ریش بزرگ کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے اور سینکڑوں

کبوتر ان کے گرد جمع تھے مزار سے ذرا ادھر برگد کا ایک پرانا درخت اپنی جڑیں زمین کے اندر اور باہر پھیلائے کھڑا تھا میں اور میرا ساتھی چلتے چلتے تھک گئے تھے' ہم نے برگد کے نیچے رومال بچھایا اور ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔

''تم چائے پیو گے''؟ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا' جس کے چہرے پر تھکن کے آثار کچھ زیادہ نمایاں تھے۔ وہ میرے لیے ان رستوں پر چل نکلا تھا ورنہ وہ ایسی مسافتوں کا عادی نہ تھا۔

''ہاں'' اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا۔

میں اٹھ کر پردیسی ہوٹل کی طرف گیا اور چائے کے دو کپ بنوا کر لے آیا۔ دکان کے مالک نے اپنے دوسرے گاہکوں کے برعکس ہمارے صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر نہ صرف یہ کہ الماری سے دو ایسے کپ نکلوائے تھے جن کے کنارے ٹوٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ انہیں دھویا بھی بڑے اہتمام سے تھا۔ میں نے برگد کے نیچے پہنچ کر پلیٹ میں گری ہوئی چائے زمین پر انڈیلی اور پھر ایک کپ اپنے ساتھی کو تھما دیا۔

''یہاں کتنا سکون ہے'' میرے ساتھی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا'' تم دیکھ رہے ہو کہ پاس سے گزرنے والے لوگوں کی نظروں میں کتنی پاکیزگی ہے اور وہ اس طرح سلام کر کے گزر رہے ہیں جیسے برسوں سے ہمارے آشنا ہوں۔!''

''ہاں میں دیکھ رہا ہوں لیکن اپنے بائیں جانب اس بوڑھی عورت کو دیکھو!'' میں نے اس طرف اشارہ کیا جہاں ایک ضعیف عورت پاؤں کے بل بیٹھی پانی ایسے شوربے میں روٹی بھگو کر کھا رہی تھی اس کے کپڑے تار تار تھے۔

''چچ چچ چچ'' میرے ساتھی نے اپنے دکھ کا اظہار کیا'' میری جیب میں اس وقت پیسے نہیں ہیں تم فی الحال پانچ روپے اسے دے دو۔''

میں نے آگے بڑھ کر بوڑھی عورت کو پانچ کا نوٹ دیا اس نے خوشی سے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ یہ نوٹ ہاتھوں میں لے لیا اور پھر غور سے اسے دیکھنے لگ گئی اس کے دو

منت دعاؤں میں صرف ہوگئے اور پھر اس نے یہ نوٹ قمیض کے دامن میں باندھتے ہوئے پوچھا "بیٹے! یہ کتنے کا نوٹ ہے!"

مجھے یوں لگا کسی نے میرا کلیجہ مسل دیا ہو اور میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر واپس برگد کی چھاؤں میں آ کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ چند گز پر واقع جدید طرز کی بستی میں ہوں گے۔ جہاں سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے بنگلے ایستادہ تھے جن کے وسیع وعریض لان میں رنگ برنگ پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دائیں جانب واقع ایک سینک بار کے باہر نئے ماڈل کی کاریں کھڑی تھیں جن میں بیٹھے ہوئے خوش لباس اور خوشنما چہرے آئس کریم کھا رہے تھے وہ بستی ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی جہاں ایک مسجد میں بچے لہک لہک کر قرآن مجید پڑھ رہے تھے جہاں مزار پر سبز علم لہرا رہے تھے اور جس کے صحن میں ایک بزرگ کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے جہاں کنویں میں سے عورتیں پانی نکال رہی تھیں' جہاں پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک ضعیف عورت پانی ایسے شوربے میں باسی روٹی کے لقمے بھگو کر کھا رہی تھی۔

اور جہاں برگد کا ایک درخت تھا جس کے سائے تلے "عجوبہ" بستیاں دیکھنے کے لیے آنے والے ہم لوگ بیٹھتے ہیں اور کچھ دیر ستانے کے بعد واپس اپنی روشن بستیوں کو لوٹ جاتے ہیں۔

# بے شرم

وزیر آباد سے چند میل ادھر موضع دھونکل کے ریلوے سٹیشن پر تیز گام کو کراسنگ کی وجہ سے رکنا پڑا۔ شکر دوپہر میں پلیٹ فارم کا بے سایہ پتھریلا فرش شعلے اگل رہا تھا پلیٹ فارم کے مین گیٹ سے دھونکل کا قصبہ دکھائی دے رہا تھا ایک ٹوٹے ٹبوں والی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک کے دائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد کے مینار دکھائی دے رہے تھے مسجد کی دیوار کے ساتھ ایک بھینس بندھی تھی کچھ پختہ اور کچھ مٹی کے مکان بھی نظروں کے سامنے تھے جن کی دیواروں پر سگھڑ گرہستنوں نے پاتھیاں (اوپلے) تھوپی ہوئی تھیں۔ پلیٹ فارم پر ہو کا عالم تھا ایک گھنے درخت کے نیچے پانی کا نلکا تھا اور ریلوے کا ایک ملازم لنگوٹ باندھے وہاں نہانے میں مصروف تھا۔ گاڑی سٹیشن پر رکی تو گرمی سے بے حال مسافروں کا ہجوم پپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا پانی کی تلاش میں پلیٹ فارم پر بکھر گیا۔

پلیٹ فارم کے ایک کونے میں لکڑی کے بنے ہوئے ایک ڈھانچے میں پانی کا گھڑا دھرا تھا۔ کچھ مسافر اس طرف لپکے لیکن وہاں گلاس نہ پا کر مایوسی کے عالم میں کسی ''صاحب گلاس'' کا انتظار کرنے لگے اتنے میں ایک منچلے نے گھڑے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور پھر منہ کے ساتھ لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ باقی لوگ نلکے کی طرف چلے گئے تھے اور اب وہاں ایک اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ریلوے کے ملازم نے اپنے منہ اور جسم پر صابن ملا ہوا تھا اور ابھی وہ اسے دھونے کی فکر میں تھا کہ ایک پیاسے نے نلکے کے ساتھ منہ لگایا اور اپنی پیاس بجھانے میں مشغول ہو گیا۔ نہانے والے نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں

آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں صابن اس کی آنکھوں میں چلا گیا اور اس نے آنکھیں دھونے کے لیے دونوں ہتھیلیاں یکجا کر کے نلکے کے آگے پھیلا دیں لیکن اتنی دیر میں کوئی دوسرا شخص نلکے کے ساتھ منہ لگا چکا تھا نہانے والے نے سخت اضطراب کے عالم میں کچھ دیر انتظار کیا اور پھر فرش پر پانی کے قطروں کی ''ٹاپ'' سن کر ایک بار پھر ہاتھ نلکے کی طرف پھیلا دیئے لیکن اتنی دیر میں ایک اور پیاسا نلکے کے ساتھ ''بوس و کنار'' میں مشغول ہو چکا تھا صابن ریلوے کے ملازم کی آنکھوں میں اترتا چلا جا رہا تھا اور اب اس کی بے چینی نکتہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔

''ذرا ایک منٹ کے لیے رک جاؤ' میں جسم پر سے صابن اتار لوں۔''

اس نے پیاسوں سے اپیل کی۔ صابن اس کے جسم پر جمنا شروع ہو گیا تھا اور آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے کے ساتھ ساتھ جسم پر خارش بھی شروع ہو گئی تھی۔

''بادشاہو! جی بھر کے صابن اتارو' ہم تو ریلوے والوں کے خادم ہیں۔'' ایک مسافر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اظہار نیازمندی کیا۔ لیکن جتنی دیر میں نہانے والے نے نلکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ نیازمند ٹونٹی کو فیڈر کی طرح منہ میں لے چکا تھا۔

''تہاڈا بیڑہ غرق'' نہانے والے نے اپنے دلی جذبات کا اظہار مہذب ترین لفظوں میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''خدا کے لیے ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ مجھے آنکھوں میں سے صابن نکالنے دو۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں۔''

''تمہاری آنکھیں جل رہی ہیں تو ہماری زبانیں جل رہی ہیں تم تو تھوڑی دیر بعد جی بھر کے نہا لو گے۔ ہمیں ہونٹ تر کرنے کے لیے بھی طویل عرصہ انتظار کرنا پڑے گا'' ایک پیاسے نے اپنا نکتہ نظر پیش کیا اور ''بک'' سے پانی پینے میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا مسافر آگے بڑھا پھر تیسرا اور ایک بار پھر لائن لگ گئی۔

اتنی دیر میں دوسری طرف سے آنے والی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ جس کا مطلب

تھا کہ پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی چند لمحوں میں چلنے والی ہے۔ اس پر پیاسوں میں بھگدڑ مچ گئی اور اب وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے پانی پینے کی تگ ودو کر رہے تھے آنکھوں سے صابن نکالنے کے لیے بے چین ریلوے ملازم اب گالیوں پر اتر آیا تھا۔ لیکن پیاسے اس پر بھی بے مزہ نہیں ہوئے تھے اور یکے بعد دیگرے ٹونٹی کے ساتھ منہ لگاتے چلے جاتے تھے حتیٰ کہ دوسری طرف سے آنے والی ٹرین ایک زناٹے کے ساتھ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور طوفان کی طرح گزر گئی۔ پلیٹ فارم پر کھڑی تیز گام نے بھی وسل دیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے سرکنے لگی جو پیاسے ہونٹ گیلے کرنے سے رہ گئے تھے انہوں نے پانی کا خیال چھوڑا اور لپک لپک کر ٹرین پر سوار ہونے لگے' ان میں سے ایک نے گیٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے ریلوے کے ''نابینا'' ملازم کو مخاطب کیا اور دانت نکالتے ہوئے حلق کی پوری قوت سے چیخ کر کہا:

''تسی نہالو ساڈی خیر اے!'' (تم نہا لو ہماری خیر ہے) یہ سن کر اس دل جلے نوجوان نے جلدی سے آنکھوں پر پانی کا چھینٹا مارا اور پھر اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر خاموشی سے لنگوٹ کی ''نشست'' تبدیل کر دی اس کا منہ ٹرین کی طرف تھا اور اس کے حریف مسافروں سے بھری ہوئی بوگیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرتی جا رہی تھیں۔

❖❖❖

# انکل جیری

میں نے اپنا سامان سمیٹا اور کراچی سے واپس لاہور آنے کے لیے لارنس روڈ پر واقع مہر آباد بلڈنگ کا فلیٹ نمبر 17 چھوڑنے ہی کو تھا کہ دروازے پر گھنٹی ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک ہونق سا امریکی نوجوان کھڑا تھا۔ قدرے لمبوترا چہرہ' سر پر خشخشی بال' پورے منہ میں صرف سات دانت' تین اوپر چار نیچے' اوپر کے تین دانتوں میں سے درمیانی دانت سیاہ پڑ چکا تھا اور اب وہ بھی جھڑنے والا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی پتلون اور میرون کلر کی دھاری دار قمیض پہنی ہوئی تھی۔

''سالا مالیکم ! مجھے انکل جیری کہتے ہیں۔ میں سیدھا نیو یارک سے آ رہا ہوں۔ مجھے موبین پیر زیدہ (مبین پیرزادہ) سے ملنا ہے!'' اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور پھر چار نیچے اور تین اوپر والے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیا۔

میں نے ایک نظر اس بغلول کو دیکھا اور پیشتر اس کے کہ اسے کوئی جواب دیتا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگا۔

''مبین یہاں نہیں ہے'' میں نے دروازے کے درمیان میں کھڑے ہو کر راستہ بند کرتے ہوئے کہا۔ کمرے میں میری اہلیہ چیزیں سمیٹنے میں مشغول تھی اور وہ اس مخلوق کو اچانک سامنے پا کر ڈر جاتی۔

''آ وَوَوَ'' اس کے چہرے پر سخت پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے ''کیا وہ بتا کر نہیں گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟''

''وہ گزشتہ شام کو اپنے والدین کے پاس حیدرآباد چلا گیا تھا اور حیدرآباد یہاں سے سوا سو میل ہے۔''

''آ وَ وَ'' ایک بار پھر اس کے حلق سے یہ عجیب وغریب آواز نکلی ''کیا میں ٹیلی فون پر اس سے بات کرسکتا ہوں؟''

''ایک منٹ ٹھہر جاؤ'' میں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے دروازے پر روکا اور پھر اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آیا۔ میں نے مبین کا نمبر ملایا تو اتفاق سے وہ گھر پر ہی موجود تھا'' تمہارا ایک دوست جیری نیویارک سے تمہیں ملنے کے لیے آیا ہے اور وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

''ہے'' (HAY) جیری نے مجھے شانوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ''جیری نہیں' انکل جیری کہو''

''انکل جیری'' میں نے مبین کو تصحیح شدہ پیغام پہنچایا اور ساتھ ہی ریسیور جیری کو تھما دیا۔ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد جیری نے ریسور واپس رکھ دیا۔ وہ اب خوش نظر آ رہا تھا'' مو بین کہتا ہے کہ میرے ماموں ابھی لاہور واپس جا رہے ہیں تم ان کے ساتھ ٹرین میں آ جاؤ۔ میں تمہیں حیدرآباد اسٹیشن پر اتار لوں گا۔''

لارنس روڈ سے اسٹیشن تک جاتے ہوئے جیری نے ٹیکسی کی کھڑکی میں سے اپنا سر باہر نکالا ہوا تھا اور دھڑا دھڑ گدھا گاڑیوں اور خستہ حال بسوں سے چمگادڑوں کی طرح چمٹے ہوئے لوگوں کی تصویریں اتارنے میں مشغول تھا۔ ایک جگہ اس نے اچانک چلانا شروع کر دیا'' روکو۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے گھبرا کر ایک دم بریکیں لگائیں جس سے حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

''اسے کہو کہ گاڑی ذرا پیچھے لے جائے۔'' جیری نے میری وساطت سے ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی ریورس کرنے کے لیے کہا اور پھر اسے واپس اسی جگہ لے آیا جہاں ایک اونٹ گاڑی کھڑی تھی اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور پھر مجھے بھی اترنے کو کہا اس کے

چہرے سے جوش وخروش جھلک رہا تھا۔

''میں اونٹ پر بیٹھتا ہوں' تم میری تصویر اتارو'' اس نے مجھے کیمرہ تھماتے ہوئے کہا۔

''اندر ٹیکسی میں بیٹھو'' میں نے جھلا کر کہا'' سارا ٹریفک جام ہو گیا ہے تم یہ تصویر کسی اور موقع پر بھی لے سکتے ہو۔''

آ وَ وَوَ'' اس بار اس کی طرف سے یہ تاسف کا اظہار تھا اور پھر وہ اونٹ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتا ہوا واپس ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

''وہ دیکھو۔ وہ دیکھو'' اس نے چلتی ٹیکسی میں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر'' ٹک'' سے تصویر لے لی۔ میں نے اس طرف دیکھا تو پام کے درختوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''پام کے درخت تو صرف ہوائی میں ہوتے ہیں۔ کیا تم لوگ اس کی پنیری وہاں سے منگوا کر یہاں کاشت کرتے ہو؟''

یہ خالص امریکی ذہنیت کا سوال تھا سو میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اس اثنا میں ٹیکسی ریلوے اسٹیشن پہنچ چکی تھی۔ قلی نے سامان اٹھایا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے سر پر رکھ لیا۔

''اس نے سامان سر پر کیوں رکھا ہے ہاتھ میں کیوں نہیں اٹھاتا؟''

''اس لیے کہ اس کے ہاتھ صرف دو ہیں جب کہ صندوق چار ہیں'' میں نے جھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''آ وَ وَوَ'' جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اب ہم اپنی سیٹوں پر براجمان ہو گئے تھے۔

''ہے'' جیری نے مجھے مخاطب کرنے کے لیے آواز نکالی۔

''میرا نام'' ہے ''نہیں' عطا ہے ویسے کیا بات ہے؟''

''ادھر دیکھو'' اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ کس قدر خوبصورت پرندہ ہے' اس کا کیا نام ہے؟''

''اس خوبصورت پرندے کا نام کوا ہے'' میں نے جل کر کہا

''یہ کوا نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا ہے؟''

''یہی تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔'' جیری نے کہا۔

''تو پھر مجھ پر اعتبار کرلو یہ کوا ہی ہے اور ہمارے ہاں اس کا شمار خوبصورت پرندوں میں نہیں ہوتا۔''

''اگر یہ کوا ہے تو بھی کس قدر خوبصورت ہے' او گاڈ ہمارے ہاں اس طرح کے کوے نہیں ہوتے کیا میں یہ پکڑ سکتا ہوں؟''

''کوشش کر دیکھو'' میں نے اکتا کر کہا ''ویسے اس کے حسن کے بارے میں جو کلمات تم نے میرے سامنے کہے ہیں اگر اس کے کان میں کہہ دو تو وہ رضا کارانہ طور پر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردے گا۔''

اتنی دیر میں کوا اڈاری مار کر دوسرے پلیٹ فارم کی طرف نکل گیا تھا اس بار جیری نے حسرت بھری نظر کوے پر ڈالی اور پھر چار نیچے اور تین اوپر والے دانت نکال کر ہنسنے لگا ''ہے' ہے'' اس نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا۔

''ہے' ہے'' ''نہیں' عطا'' میں نے ایک بار پھر اسے ٹوکا۔

''آٹا''؟

''نہیں'' ''ہے ہے'' ہی ٹھیک ہے!''

''یہ دیکھو! بچہ ننگا ہے' اس کے جسم پر کپڑے نہیں ہیں' اس نے پلیٹ فارم پر کے

برابر میں کھڑی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک آٹھ دس سالہ بچی کی طرف اشارہ کیا' جس نے گود میں ایک زرد مریل سا بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ جیری کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں "یہ بچہ ننگا کیوں ہے؟ اس لڑکی کے پاؤں میں جوتے کیوں نہیں؟ یہ ہاتھ پھیلا کر مجھ سے کیا مانگ رہی ہے؟" ان سوالوں کا راستہ روکنے کے لیے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا' میں نے ایک سکہ نکالا اور بچی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ لڑکی آگے بڑھ گئی اور اس نے برابر والی کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

گاڑی چلنے والی تھی۔ جیری کھڑکی میں سے سر نکالے ہر آنے جانے والے کو "سالام لیکم" کہتا تھا اور پھر اپنے گنتی کے دانتوں کی نمائش لگا دیتا تھا' یہ اس کی طرف سے غالباً خوش اخلاقی کا مظاہرہ تھا' ایک آوارہ کتا پلیٹ فارم پر پھر رہا تھا' چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گیا اور پھر تھوتھنی اٹھا کر جیری کی طرف دیکھنے لگا۔

"آؤؤؤ" اور اس بار یہ آواز کتے نے نکالی تھی!

گاڑی چل پڑی تھی مگر جیری کی عجیب وغریب حرکات اسی طرح جاری تھیں۔

"مجھے آدھے چہرے کو نقاب میں رکھنے والی عورتیں بہت اچھی لگتی ہیں' سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے کہو کہ وہ اپنے چہرے کو آنکھوں سے نیچے تک نقاب سے ڈھانپ دے' میں اس کی تصویر لینا چاہتا ہوں!" جیری نے کیمرے کا رخ عورت کی طرف کرتے ہوئے مجھ سے فرمائش کی۔ عورت نے کیمرے کو اپنی طرف دیکھا تو جھینپ کر نقاب چہرے پر گرالیا اور منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئی۔

"ہے' اس نے منہ کیوں پھیر لیا ہے؟"

"ابھی تو اس نے صرف منہ پھیرا ہے' اگر تم نے اپنی یہ حرکتیں جاری رکھیں تو وہ سینڈل اتار لے گی۔"

"مگر کیوں؟" اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔

"میرے پاس اس کیوں کا جواب نہیں ہے' اس کے لیے تمہیں کچھ عرصہ یہاں

رہنا پڑے گا۔ ویسے یہ بتاؤ تم مبین کو کس طرح جانتے ہو؟"

"میں نیویارک کی بندرگاہ پر جہازوں میں تبلیغ کے لیے جایا کرتا تھا' مبین وہیں میرا دوست بنا تھا!"

"تو کیا تم مبلغ ہو؟" میں نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میں خدا کا پیغام رساں ہوں!" اس نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تم عیسائیوں کے کس فرقے سے تعلق رکھتے ہو؟"

"میں کسی فرقے سے تعلق نہیں رکھتا' میں سچا عیسائی ہوں۔"

"مگر تم کسی چرچ سے تو وابستہ ہو گے؟"

"ہاں میرا تعلق "یہوواز وٹ نیس" (Jehoua's Witness) سے ہے اور صرف یہی ایک سچائی کا راستہ ہے۔"

"تبلیغ کے علاوہ تمہارا کیا مشغلہ ہے؟" میں نے پوچھا

"میں کوڈک کمپنی میں کام کرتا ہوں!"

"پوریاں ای پاناں ہوویں گا۔" میں نے ہنستے ہوئے پنجابی میں کہا۔ دراصل ابھی تک اس کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ کم از کم ایک آدھ میری بات بھی اسے سمجھ میں نہیں آنا چاہیے تھی!

اس دوران باتیں کرتے کرتے جیری نے اچانک دائیں ہاتھ کی سیٹ پر بیٹھے میرے ڈھائی سالہ بیٹے یاسر کو متوجہ کرنے کے لیے انگوٹھے کے برابر والی دو انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے "ہو ہو" کی آواز نکالی اور پھر ہنسنا شروع ہو گیا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" جیری نے ایک جرک کے ساتھ اپنی ہنسی روکی اور پوچھا

"یاسر" میں نے جواب دیا۔

"آ وَ وَ" اس بار اس نے حقارت کے اظہار کے لیے یہ آواز نکالی "مجھے یہ نام

اچھا نہیں لگتا!''

''کیوں؟''میں نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے قتل وغارت گری سے نفرت ہے اور یاسر عرفات کا یہی مشغلہ ہے!''

''تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے'' میں نے غصے سے کہا۔''مظلوموں کو اپنا غصب شدہ حق واپس لینے کے لیے تلوار اٹھانا ہی پڑتی ہے۔''

''نہیں یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے۔'' جیری نے کہا ''انہیں چاہیے کہ وہ یہووا سے مدد چاہیں' وہ خود مظلوموں کی مدد کو پہنچے گا'' اور وہ ایک بار پھر ہنسنا شروع ہو گیا۔

''یہ تمہارے دانتوں کو کیا ہوا ہے''؟ ہنسنے کے دوران اس کے دانتوں پر پھر میری نظر پڑ گئی۔

''پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔'' اس نے لاپرواہی سے کھڑکی سے باہر سر نکال لیا۔

''تم ان کا علاج کیوں نہیں کراتے؟''

''ڈاکٹر میرے دانت واپس نہیں دلا سکتے' یہووا مجھے پہلے سے بہتر دانت دے گا۔''

مجھے جیری سے کچھ ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی' اور اب میں اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

''تم تنہا رہتے ہو یا اپنے والدین کے ساتھ رہائش پذیر ہو؟'' میں نے پوچھا

''میں تنہا ہوں۔ میرے بچپن ہی میں میرا باپ کثرتِ شراب نوشی سے چل بسا تھا' کچھ عرصہ بعد ماں بھی مر گئی اب ایک بہن ہے مگر میں نے گزشتہ دس برس سے اس کی شکل نہیں دیکھی۔''

''وہ کیوں؟''

اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی۔ وہ منی سکرٹ پہنتی تھی، سگریٹ پیتی

تھی، شراب نوشی کرتی تھی اور اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ نائٹ کلبوں اور دوسری بُری بُری جگہوں پر جاتی تھی میں اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"تو کیا تمہارے مذہب میں یہ سب چیزیں گناہ ہیں"؟

"ہاں شادی سے پہلے ہم کسی عورت کا بازو بھی نہیں تھام سکتے۔ میں جن لوگوں کے درمیان رہتا ہوں وہ سچے عیسائی نہیں ہیں۔"

"تمہاری شادی ہوگئی ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں" اس کی آواز میں غم کی لرزش تھی۔

"تم اپنی تنہائیاں دور کرنے کے لیے شادی کیوں نہیں کرا لیتے کیا میں اس میں کسی قسم کی مذہبی رکاوٹ ہے؟" میری دلچسپی اس میں بڑھتی جا رہی تھی!

"نہیں اس کی کچھ ذاتی وجوہ ہیں" جیری نے ڈوبتی آواز میں کہا "لیکن مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے مجھ سے سب چھوٹے بڑے محبت کرتے ہیں۔ میں ان میں بہت مقبول ہوں وہ مجھے انکل جیری کہتے ہیں!" یہ کہتے ہوئے اچانک جیری نے ایک بار پھر یاسر کو متوجہ کرنے کے لیے اپنی دو انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے "ہو،ہو" کی آواز نکالی اور پھر اس کے ساتھ ہی بے تحاشا ہنسنے لگا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے فراٹے بھرتی ہوئی حیدرآباد کی طرف جا رہی تھی کسی گھنے سائے سے محروم بنجر اور بے رفاقت زمینوں میں کیکٹس کے پودے ایک دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے انجن نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پھر انکل جیری کی ہنسی اس چیخ میں تحلیل ہوتی چلی گئی!

❖❖❖

# طوطے ای طوطے

گزشتہ دنوں میں نے بازار میں لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جو ایک جگہ جمع تھا میں نے آگے بڑھ کر جھانکا تو ایک طوطے فروخت کرنے والا تھا جس نے کئی پنجروں میں بہت سے طوطے قید کر رکھے تھے مگر لوگ ان طوطوں کو دیکھنے کے لیے یہاں جمع نہ تھے بلکہ ان کی دلچسپی کا مرکز وہ شخص تھا جس نے بھاری قیمت ادا کر کے وہ تمام طوطے خرید لیے تھے اور اب انہیں ایک ایک کر کے آزاد کر رہا تھا تھوڑی ہی دیر میں تمام طوطے قید سے رہا ہو چکے تھے اور اڈاری مار کر کہیں کے کہیں پہنچ چکے تھے مگر ان میں ایک طوطا ایسا بھی تھا جو اڑنے کا نام نہیں لیتا تھا' طوطوں کو آزاد کرنے والے شخص نے اسے کئی بار ہاتھ میں پکڑ کر فضا میں اچھالا مگر وہ ہر بار آزاد اور کھلی فضاؤں میں گم ہونے کی بجائے زمین پر واپس آ جاتا اور پھر پھدک پھدک کر واپس اپنے آقا کے قدموں میں پہنچ جاتا۔ یہ غالباً ''وفادار'' طوطا تھا اور باقی غالباً ''طوطا چشم'' طوطے تھے۔

جب میں نے اس نیک دل شخص کو طوطوں کو یوں آزاد کراتے دیکھا تو میرے دل سے دعا ابھری کہ ''یا خدا! مجھے بھی کچھ وسائل عطا کر کہ میں بھی بہت سے ''طوطوں'' کو آزاد کرانا چاہتا ہوں'' اور پھر چشم تصور میں مَیں نے دیکھا کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے اور میں ایک بہت بڑے پنجرے کے قریب کھڑا ہوں اس پنجرے میں مختلف قسم کے طوطے بند تھے ان میں سے کچھ بولنے والے تھے اور کچھ ایسے تھے جو بولتے نہیں تھے میں نے علیحدہ علیحدہ ان کی قیمت پوچھی تو دکاندار نے ان کی ایک ہی قیمت بتائی۔ میں نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا ''خاموش رہنے والے طوطوں کی قیمت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ خاموش

رہتے ہیں اور بولنے والے طوطوں کی قیمت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ بولتے ہیں۔'' میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رقم گن کر دکاندار کی ہتھیلی پر رکھ دی اس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا پہلے میں نے خاموش طوطوں کو باہر نکالا اور پھر انہیں ایک ایک کر کے فضا میں اچھال دیا۔ انہوں نے بازار کا ایک چکر لگایا اور پھر خاموشی سے اپنے آقا کے قدموں میں آ گئے اس کے بعد میں نے بولنے والے طوطے باہر نکالے اور انہیں فضا میں اچھال دیا۔ بازار کا چکر لگانے کے بعد وہ بھی ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے اپنے آقا کے قدموں میں پھدکنے لگے۔ میں نے مالک سے اس کی وجہ پوچھی تو پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک بولنے والے طوطے نے سنہری لکیر والی گردن اوپر اٹھائی اور کہنے لگا ''ہم بازار کا چکر لگا کر آئے ہیں سب کاروبار مندا پڑا ہے۔ روزی پنجرے کے باہر نہیں پنجرے کے اندر ہے'' اور خاموش رہنے والے طوطوں نے گردن ہلا کر اس کی تصدیق کر دی۔

میں نے تعجب سے ایک نظر طوطوں کو اور پھر ان کے مالک کو دیکھا۔ مالک ہنس رہا تھا' طوطے بھی ہنس رہے تھے میں نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا اور کہا ''یہ طوطے ہم انسانوں کی باتیں سمجھتے ہیں اور ہم انسانوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں' یہ کیا ماجرا ہے؟'' مالک نے بتایا ''یہ طوطے معمولی طوطے نہیں ذہین طوطے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی طوطے ہیں' کچھ ادبی اور صحافی طوطے ہیں' انقلابی طوطے ہیں۔ اور اسلام پسند طوطے ہیں یہ سب دانا جانور ہیں!'' میں نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''اگر یہ اتنے ہی دانا ہیں' تو انہوں نے تمہاری غلامی کس طرح قبول کر لی ہے!'' آقا نے جواب دیا ''میں تو محض ان کا رکھوالا ہوں' یہ میرے غلام نہیں۔ میں تو خود غلام ہوں۔ یہ دیکھو!'' یہ کہہ کر اس نے اپنی پشت پر سے کپڑا اٹھایا جس پر غلامی کا داغ موجود تھا۔

''تم کس کے غلام ہو؟'' میں نے پوچھا۔''

''میں جس کا غلام ہوں' وہ آگے کسی کا غلام ہے اور یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔''

یہ سن کر میں نے اس مظلوم انسان سے ہاتھ ملایا اور واپس جانے کو تھا کہ اس نے میرے روپوں کی تھیلی مجھے لوٹا دی اور کہا ''تم ضرورت مند شخص لگتے ہو' اپنے روپے واپس لے لو'' میں نے ممنونیت کی نظروں سے اسے دیکھا اور پیسے جیب میں ڈال لیے۔

میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے ایک بار پھر مجھے پکارا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے جیب میں سے روپوں کی ایک اور تھیلی نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے ایک آنکھ میچ کر کہا ''طوطا بنو گے؟''

# بچپن سے ایک ملاقات

انسان کا بچپن بھی کیا چیز ہے‘ یہ گزر بھی جائے تو اس کا بچپنا نہیں جاتا‘ چنانچہ ایک چھوٹے بچے کی طرح کبھی منہ بسورتا اور کبھی اٹھکیلیاں کرتا پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔ میں چار سال کا تھا جب اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے وزیر آباد آیا اور یہاں کے گلی کوچوں میں سما گیا‘ میں نے یہاں پرائمری تک تعلیم حاصل کی اور پھر لاہور چلا آیا۔ لیکن وزیر آباد جو میرا بچپن ہے آج بھی منہ بسورتا اور کبھی اٹھکیلیاں کرتا میرے پیچھے چلا آتا ہے۔ ہم محلہ بکریانوالے میں رہتے تھے اور اس کی جس گلی میں ہمارا مکان تھا اس کا نام کوچہ لیر چونیاں تھا۔ اس کا ایک ایک مکان اور ایک ایک مکین میرے حافظے میں محفوظ ہے اور قریباً ربع صدی گزرنے کے باوجود جب ان میں سے کوئی نظر پڑتا ہے تو مجھ پر ایک عجیب وارفتگی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کار بس یا ٹرین میں پنڈی جاتے ہوئے جب میں وزیر آباد کے قریب سے گزرتا ہوں‘ تو مجھے اپنے بچپن کا لمس محسوس ہوتا ہے اور میں وزیر آباد کی حدود شروع ہونے سے چناب کا پل گزرنے تک بچوں کی طرح اپنا سر کھڑکی سے باہر رکھتا ہوں۔

میں گزشتہ دنوں اپنی ہمشیرہ اور اپنی پھوپھی سے ملنے کے لیے وزیر آباد میں تھا اور بچپن میں دیکھے ہوئے چہرے اور سنے ہوئے نام میرے تعاقب میں تھے‘ ان میں بلند مرتبہ اور کم مرتبہ کی کوئی تمیز نہیں‘ بس یہ نام میرے حافظے کا حصہ ہیں اور میں جب بھی وزیر آباد جاتا ہوں‘ یہ نام اور چہرے میرا تعاقب کرتے ہیں۔ ان میں راجہ عبداللہ (مرحوم) شیخ احسان‘ ملک عبدالرحیم (مرحوم) مولانا عبدالغفور ہزاروی (مرحوم) مولانا محمد رمضان

(مرحوم) لطیف چوہان' میاں للّی (میاں منظور الحق) مولوی فضل کریم (مرحوم) شریف طوسی' حاجی اخباراں والا (مرحوم) بابو اسحاق' مجید پہلوان (مرحوم) مکل عطاء اللہ (شیر فروش) کیفی (سب پوسٹ ماسٹر) اور ان کے علاوہ دوستوں میں سے منور (مرحوم) منور کا چھوٹا بھائی چھبا (سرور بٹ) سمیع' سمیع کا چھوٹا بھائی چھاؤ (صلاح الدین) اور پھیکا (رفیق) رفیع شفیع موچی اور کئی دوسرے لوگ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس چھوٹے سے قصبے کا چھوٹا سا مین بازار' غلہ منڈی' کھوتی اسکول (ایم سی پرائمری سکول نمبر 2) گرو کوٹھا' نالہ پلکھو راجوں کی حویلی' موتی بازار' کانواں والا محلّہ' کمہاراں دی گلی' ریل بازار' سرکلر روڈ اور ان کے علاوہ شہر میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے رات کو گھر میں جلنے والی لالٹین کی مدھم روشنی' گرمیوں میں رسی سے کھینچا جانے والا پنکھا اور جنوں بھوتوں اور چڑیلوں کا خوف جو ابھی تک قائم ہے۔ میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ عزیزوں' رشتہ داروں میں دودھیا بالوں والی نانی جان (مرحوم) ان کا اکلوتا مجذوب بیٹا یعنی اکرام ماماں جی (مرحوم) میاں بھائی جان (سید مسعود شاہ قادری) لالہ بھائی جان (سید ادریس شاہ قادری) آمنہ پھوپھو (مرحومہ) سید یعقوب شاہ (خالو) اور میرے پھپھڑ سیّد محمود شاہ قادری جو باقاعدگی سے کونسلر کا انتخاب لڑتے تھے' میرے بچپن کی یادوں کا ورثہ ہیں۔ اور گزشتہ ہفتے جب میں وزیر آباد میں تھا' میں نے ان میں سے کچھ کو دیکھا اور کچھ کو یاد کیا۔

میں نے جنہیں دیکھا' ان میں میرا اسکول' ایم سی پرائمری سکول نمبر 2 بھی تھا جو ''کھوتی سکول'' کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے بڑے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میری نظروں نے محمد حسین بلّے کو تلاش کیا' جس سے ہم آدھی چھٹی کے وقت چھولے کھایا کرتے تھے' مگر اس کی ریڑھی وہاں موجود نہیں تھی۔ سکول میں بچے اُونچی آواز سے کورس میں پہاڑے یاد کر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح لہک لہک کر جس طرح ہم یاد کرتے تھے۔ وہی پرانا نقشہ یعنی درمیان میں خالی جگہ۔ بائیں طرف ایک طویل برآمدہ جس میں آج بھی ٹاٹ بچھے ہوئے تھے۔ یہ برآمدے کی بجائے کلاس روم کا کام دیتا تھا۔ سامنے کوٹھڑیوں کی جگہ ایک کمرہ بن گیا تھا اور دائیں جانب ہیڈ ماسٹر صاحب کا دفتر اور اس کے

ساتھ پانچویں جماعت کا کلاس روم' مجھے سامنے والے کمرے کے دروازے میں ایک شناسا سا چہرہ نظر آیا' لیکن وقت کی دھول میں اَٹا ہوا' میں نے اسے شباب کے آغاز میں دیکھا تھا لیکن اب یہ بڑھاپے کی دہلیز پر تھا۔ یہ مولوی محمد یونس کا چہرہ تھا۔ میرے ایک استاد مولوی فضل کریم کے بیٹے کا چہرہ اسی دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے ان کے والد بچوں کو پڑھاتے تھے' اب ان کی جگہ ان کے بیٹے نے لے لی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ ''مولوی صاحب دا کیہہ حال اے؟'' انہوں نے مجھ سے میرے والد ماجد کی خیریت دریافت کی۔ ''اللہ دا شکر اے' ٹھیک نیں۔'' اور پھر میں نے ٹاٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے بچپن کو دیکھا یہ بچپن دو بڑوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر شباب پر آ گیا تھا۔ یعنی بچوں نے کتابیں پرے رکھ دی تھیں اور تختیاں ہاتھ میں لے کر ایک دوسرے سے طبع آزمائی میں مشغول ہو گئے تھے۔ ایک بچہ اکیلا مسلسل روئے جا رہا تھا۔ تین بچے ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی درمیان والی دو انگلیاں کھڑی کر کے ماسٹر صاحب سے باہر جانے کی اجازت طلب کرنے لگے' لیکن ان کی یہ درخواست نامنظور ہو گئی۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر ایم عبدالحمید اختر اپنے کمرے سے باہر کرسی بچھائے بیٹھے تھے۔ میں اور مولوی یونس دونوں ان کے پاس آ گئے۔ مولوی یونس نے ان سے میرا تعارف کرایا تو وہ بڑی گرمجوشی سے ملے' انہوں نے کرسیاں منگوائیں اور چائے کا آرڈر دیا۔ میرے زمانے میں ماسٹر اللہ دتا صاحب اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جو ایک قریبی گاؤں سوہدرے سے بائیسکل پر آیا کرتے تھے۔ آج کل آٹھ سو بچوں کے لیے سات ماسٹر ہیں۔ میں ایم عبدالحمید اختر صاحب سے باتوں میں مصروف تھا' مگر حقیقتاً بچوں کی ان یادوں میں کھویا ہوا تھا جو انسان کو تپتے ہوئے صحراؤں سے ان نخلستانوں کی جانب لے جاتی ہیں۔ جہاں ٹھنڈے پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ میری نظر سکول کے مین گیٹ پر پڑی تو ایک سفید داڑھی والا بزرگ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں مگر آنکھوں کی چمک زندہ تھی۔ مولوی یونس نے اسے مخاطب کیا۔ ''اوئے محمد حسین' ایناں نوں پہچاننا ایں؟'' اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''کیوں نئیں اے ایتھے پڑھدے رہے نیں!'' یہ خوبرو اور کڑی

کمان ایسی جوانی والا بلا نہیں تھا جو سکول کے باہر چھولے بیچا کرتا تھا۔ یہ اس بلے کا بڑھاپا تھا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں! اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں اسے نہیں پہچان سکا تھا۔

سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی اور بچے گولی کی رفتار سے اپنے کمروں سے نکلے اور ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو دھکے دیتے مین گیٹ سے باہر نکلنے لگے۔ اب انہوں نے ڈھائی ماہ بعد واپس آنا تھا' کیونکہ آج سے موسم گرما کی تعطیلات کا آغاز ہو گیا تھا جب کہ میں آج پچیس سال بعد واپس آیا تھا!

جب میں سکول سے نکلا تو میرا بچپن منہ بسورتا اور اٹھکیلیاں کرتا میرے پیچھے پیچھے آ رہا تھا' میں نے اسے تھپکی دی اور واپس اپنی دنیا میں لوٹ آیا!!

---

# ادھا پہلوان!

گوہم فلم دیکھنے کے بھی خاصے شوقین ہیں مگر فلم خصوصاً انگری فلموں کی ''سٹوری'' سننے کا تو ہمیں جنون ہے مگر اسی صورت میں اگر یہ ''سٹوری'' سنانے والا ہمارا یار ادھا پہلوان (ٹھنڈی کھوئی والا) ہو۔ ادھا پہلوان کو بچپن میں اس کے باپ نے ''اعلیٰ تعلیم'' کے لیے کارپوریشن سکول میں داخل کروایا تھا۔ لیکن یہاں اسے اپنی ''صلاحیتوں'' کو زنگ لگتا محسوس ہوا اور وہ اکثر سکول سے غائب رہنے لگا۔ اِدھر اس کا باپ محسوس کر رہا تھا کہ دکان پر بیٹے کی عدم موجودگی کی وجہ سے کڑھائیوں کو زنگ لگ رہا ہے۔ لہٰذا اس نے ادھے پہلوان کو دوبارہ دکان پر بٹھا دیا چنانچہ وہ اس روز سے آدھا وقت کڑاھیاں مانجھنے میں صرف کرتا ہے اور آدھا وقت احباب کو کسی تازہ دیکھی ہوئی انگریزی فلم کی سٹوری سنانے میں مشغول رہتا ہے۔

ہم دوپہر کو اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر اس کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہیں تو وہ اپنے احباب پھیکا گجر اور غلام نبی خرادیئے وغیرہ کے جھرمٹ میں آدھی سڑک گھیرے موہڑھے پر بیٹھا نظر آتا ہے وہ اس سے پورے انہماک کے ساتھ کسی فلم کی کہانی سن رہے ہوتے ہیں ہمیں دور سے آتا دیکھ کر ادھا پہلوان وہیں سے بیٹھے بیٹھے پوچھتا ہے۔

''قاشمی شاب! آپ نے نابالغ حسینہ دیکھی ہے؟''

ہم اس قدر ذاتی سا سوال سن کر نروس ہو جاتے ہیں۔ تاہم وہ ہماری گھبراہٹ تاڑ لیتا ہے اور اپنے سوال کو وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''اجی' وہی نابالغ حسینہ جو صرف بالغوں کے لیے ہے اور ان دنوں ''اصلاح معاشرہ'' سینما میں چل رہی ہے؟''

یہ سن کر ہم اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور ماتھے پر سے عرق ندامت پونچھتے ہوئے اس کے قریب پہنچ جاتے ہیں اس پر وہ آواز لگاتا ہے۔

''اوئے چھوٹے ویکھدا نئیں باؤ ہوڑی کھلوتے ہوئے نیں...... (سنسرڈ) ایناں لئی سٹول لے کے آ...... (سنسرڈ)''

جب وہ بزعم خود ہماری اچھی طرح عزت افزائی کر چکتا ہے اور ہم یونہی خود کو بے عزت محسوس کر بیٹھتے ہیں۔ نیز دریں اثنا ''چھوٹا'' اندر سے سٹول بھی لے آتا ہے تو ہم اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔

''قاشی شباب، فلم دیکھنے کے قابل ہے، بس ایک دفعہ دیکھ آئیے''

''کیوں بھئی آخر کیا ہے اس میں؟'' ہم دانستہ یہ سوال پوچھتے ہیں!

''سٹوری اس کی یہ ہے'' خدا اسے ایسا موقع دے۔ چنانچہ وہ شروع ہو جاتا ہے:

''ہیرو اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے اتنے میں ہیروئن ٹخنوں سے اونچا گھگرا (منی سکرٹ) پہنے اندر داخل ہوتی ہے ہیرو ایک بار نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور دوبارہ کتاب پڑھنے لگتا ہے۔ ہی ہی ہی' ہے نا عجیب بات۔ یہ دیکھ کر ہیروئن ''کچھ'' کہتی ہے آگے سے ہیرو بھی ''کچھ'' کہتا ہے۔ پھر ہیروئن ''کچھ'' کہتی ہے اور اس کے بعد ہیرو پھر ''کچھ'' جواب دیتا ہے۔ اس پر یہ غصے میں زور زور سے ''کچھ'' بولنے لگتی ہے وہ اس سے زیادہ زور سے ''کچھ'' کہتا ہے۔ اور پھر دونوں لڑ پڑتے ہیں۔ ہیرو زور سے اسے ایک ''ریپٹا'' دیتا ہے اور وہ آگے سے چیختی ہوئی کہتی ہے پتہ نہیں کیا کہتی ہے لیکن کیا بات ہے قاشی شاب سٹوری کی آپ یہ فلم ضرور دیکھیں۔''

ادھے پہلوان سے ایسی ''ادی پچدی'' کہانیاں سن سن کر ہم بھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں چنانچہ اب تو یہ عالم ہے کہ کوئی دوست کسی فلم ہی کی نہیں کسی جلسے جلوس کی کہانی بھی ہمیں سنانے کے لیے کہتا ہے تو ہم اسے اسی طرح کی ''ادی پچدی'' کہانی سناتے ہیں مثلاً گزشتہ دنوں ہم نے ایک جلسے میں عوام کی حیثیت سے شرکت

کی اور دوستوں نے اس کی ''سٹوری'' سنانے کو کہا تو ہم نے انہیں بتایا کہ پہلا مقرر جب سٹیج پر آیا تو اس نے ''کچھ'' کہا پھر دوسرے مقرر نے ''کچھ'' کہا پھر تیسرے مقرر نے ''کچھ'' کہا۔ حتیٰ کہ سب مقرروں نے ''کچھ'' کہا ہماری زبانی اس نوع کی کہانی سن کر احباب خاصے ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم سٹوری سنا رہے ہو۔ یا کسی اخبار کے لیے رپورٹنگ کر رہے ہومگر ہم یہ طعن و تشنیع گول کر جاتے ہیں کہ جانتے ہیں یہ سب تماشبین ہیں۔

ہم جو آدھی کہانی سناتے ہیں اور وہ جو پوری کہانی سننا چاہتے ہیں۔ سب ادھے پہلوان ہیں ہماری آدھی عمر کڑھائیاں مانجھتے گزر گئی ہے باقی بھی گزر ہی جائے گی۔

# شیر دا بچہ

رات کے ایک بجے جب میں گجرات سے لاہور آنے کے لیے ویگن ''(شیر دی بچی'') پر سوار ہوا تو مجھے ڈرائیور کے برابر میں سیٹ ملی جو پنڈی سے آنے والے ایک مسافر نے ابھی ابھی خالی کی تھی، میرے ساتھ ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان جس کے چہرے پر باریک مونچھیں تھیں۔ سیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ اس نے کانوں کے گرد مفلر لپیٹا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کونوں کھدروں سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے باعث وہ اپنی ٹانگیں سکیڑ لیتا تھا اور مفلر کو زیادہ مضبوطی سے کانوں کے گرد لپیٹنے لگتا تھا۔ میری پچھلی سیٹ پر ایک امریکی جوڑا براجمان تھا۔ نوجوان کے چہرے پر گھنی ''بلانڈ'' داڑھی تھی لیکن اس قدر بارِیش ہونے کے باوجود وہ کم سن لگتا تھا۔ اس کی ''سفری گرل فرینڈ'' کم سن ہی نہیں خاصی تروتازہ بھی تھی۔ اسے غالباً زکام ہو رہا تھا کیونکہ اس کی ستواں ناک سرخ نظر آ رہی تھی۔ اس کے برابر میں تیسرا مسافر اپنا ہم وطن ہی تھا اور اس میں ہم وطنوں کی خصوصیات کچھ زیادہ ہی نمایاں تھیں کیونکہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اونگھنے کے بہانے اپنا سرسوں کے تیل سے لتھڑا ہوا سر اس امریکی دوشیزہ کے کاندھوں پر رکھ دیتا جس پر وہ جھنجھلا کر اپنے بوائے فرینڈ کو دیکھنے لگتی۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ابھی سگریٹ سلگانے ہی کو تھا کہ پچھلی سیٹ پر سے امریکی نوجوان نے ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھا، میں نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا تو وہ سگریٹ کا طلب گار تھا کیونکہ اس کے بقول ڈرائیور نے راولپنڈی سے روانگی کے بعد ویگن کو کہیں بریک نہ لگائی تھی اور گجرات میں بھی اس نے

ویگن وہاں کھڑی کی جہاں سگریٹوں کی کوئی دکان نہ تھی، میں نے ایک سگریٹ اسے پیش کرنے کے بعد پیکٹ میں سے جھانکتا ہوا ایک سگریٹ اس کی گرل فرینڈ کی طرف بھی بڑھایا مگر اس نے شکریے کے ساتھ یہ کہہ کر انکار میں سر ہلایا کہ وہ سگریٹ نہیں پیتی۔ اس پر میں نے ایسے موقعوں کے لیے امریکہ میں سیکھے ہوئے ''ٹوٹکوں'' میں سے ایک بروئے کار لاتے ہوئے کہا:

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے موٹے گناہوں میں یقین نہیں رکھتیں'' جس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ہم آج ہی کابل کے رستے پشاور پہنچے ہیں اور اب پنڈی سے لاہور جا رہے ہیں۔ ہم کتنے بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے؟'' سنہری داڑھی والے امریکی نے غالباً گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے مجھ سے پوچھا۔

''اس امر کا امکان موجود ہے کہ ہم تین بجے لاہور میں ہوں گے اور اس امر کا قومی امکان بھی موجود ہے کہ ہم کبھی لاہور نہیں پہنچ سکیں گے!''

میں نے ڈرائیور کی تیز رفتاری اور ہر آدھ منٹ بعد سامنے سے ٹیڑھی گردنوں اور ایک آنکھ والے ٹرکوں کی آمد و رفت مدنظر رکھتے ہوئے ہر دو امکانات پوری دیانت داری سے اس کے سامنے پیش کر دیئے۔

''اوہ خدایا!'' اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی پسی کیٹ **(Pussy Cat)** نے سسکاری لی ''میں نے تو ابھی انڈیا میں جوگیوں سے ملاقات کرنا ہے۔ مہارشی گورو جے کے چرنوں کو چھونا ہے جو آج کل وہیں ہیں نیپال بھی جانا ہے۔ تمہیں منہ سے ایسی بات نہیں نکالنا چاہیے تھی۔''

''میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں تم یہی سمجھو کہ ہم واقعی لاہور پہنچ جائیں گے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر میں لاہور ہی میں تمہاری ملاقات بڑے بڑے مہارشیوں سے کرا دوں تو تم اپنا سفرِ بھارت ملتوی کر دو گی؟''

''سچ مچ؟'' اس نے تحیر کے عالم میں آگے کو جھک کر پوچھا!

''ہاں! ہمارے ہاں بھی اس نوع کا ایک سے ایک ''گرو' پڑا ہوا ہے۔ لیکن حکومت ان کی روحانی سرگرمیوں میں رکاوٹ بنتی ہے چنانچہ پچھلے دنوں حکومت نے اس نوع کے ایک بہت بڑے ''گرو' حضرت ڈبہ پیر کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا!''

''کریزی پیپل (Crazy People) دوشیزہ کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں ہوئے'' چھوڑو اس ذکر کو تم یہ بتاؤ کہ تمہیں پاکستان کیسا لگا؟ میں نے پوچھا۔

''یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔'' امریکی نوجوان نے اس کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ چنانچہ اس دوران میں جہاں کہیں بھی گیا۔ لوگوں نے خوش آمدید کہا۔ ان سے صرف راستہ پوچھو تو وہ گھر تک چھوڑ کر آتے ہیں۔ مہمان نواز بھی بہت ہیں۔ بس اتنا ہے کہ ہمیں وہ کچھ اتنے غور سے دیکھتے ہیں اور ہمارے گرد کچھ اس طرح جمع ہو جاتے ہیں گویا ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہیں۔ بڑے شہروں میں نسبتاً یہ کم ہوتا ہے لیکن چھوٹے شہروں میں تو ہماری کم بختی آ جاتی ہے۔ ویسے ہمیں اس مسئلے سے ایران' ترکی' افغانستان اور بھارت ہر جگہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کیا ہماری شکل بندروں سے ملتی جلتی ہے؟''

آخری فقرہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا۔ جس پر میں نے اس کے کاندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا ''اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ ''آباؤاجداد'' کے ساتھ اگر نقوش نہ ملتے ہوں تو لوگ اس سے زیادہ بری باتیں کرتے ہیں۔''

یہ سن کر سنہری داڑھی والے امریکی نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا جس میں اس کی ریشمی گرل فرینڈ کی مترنم ہنسی بھی شامل تھی۔

''کیا تم طالب علم ہو یا کہیں کام کر رہے ہو۔؟'' میں نے گفتگو کا یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لیے امریکی نوجوان سے پوچھا۔

میرے پاس نفسیات میں ماسٹر کی ڈگری ہے اور میں......''

''تب تو مجھے تم سے ڈرنا چاہیے'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے' میں تو خود سے خوفزدہ ہوں۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

پیشتر اس کے کہ میں جواب میں کچھ کہتا۔ اس کی گرل فرینڈ نے اپنی سیٹ سے قدرے اچھلتے ہوئے ہلکی سی چیخ ماری اور پھر قہر آلود نظروں سے میرے ہم وطن کو دیکھنے لگی۔ جس کے چہرے پر اب قدرے گھبراہٹ کے آثار تھے مگر اس ''شیر کے بچے'' نے یوں آنکھیں بند کرلی تھیں۔ جیسے وہ کچھ نہ جانتا ہو۔ امریکی دوشیزہ اپنی سیٹ سے اٹھی اور اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ سیٹ تبدیل کرلی۔ ویگن راوی کے پل پر سے گزر رہی تھی اور میری پیشانی پر پنجاب کے سارے دریاؤں کا پانی عرق ندامت کی صورت میں جمع ہوگیا تھا! میں دو گھنٹے سے گردن موڑے ان سے باتیں کر رہا تھا مجھے یکا یک شدید تھکن کا احساس ہوا اور میں ان سے نظریں چرا کر اپنی سیٹ پر سیدھا بیٹھ گیا۔

———❖❖❖———

# بے خواب آنکھوں کا سفر

لاہور سے پنڈی جانے کے لیے میں نے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی اس بس کے لیے ٹکٹ حاصل کیا جو آٹھ بجے شب روانہ ہونی تھی مگر ہوا یوں کہ ساڑھے آٹھ بجے جانے والی بس اس سے پہلے روانہ ہوگئی اور اس کے بعد 9 بجے والی بس نے بھی "رختِ سفر" باندھا اور عازم پنڈی ہوگئی آٹھ بجے والی بس 9 بجے والی بس کے بعد اڈے سے باہر نکل سکی کیونکہ "پارکنگ" کرتے وقت فرسٹ کم فرسٹ سروڈ (First Come First Served) کے اصول مدنظر رکھا گیا تھا اور یہ امر ذہن سے نکال دیا گیا تھا کہ جو بس اڈے میں داخل ہوئی ہے' اسے بالآخر وقت مقررہ پر اڈے سے نکلنا بھی ہے بہر حال یہ مانسہرے جانے والی بس تھی جس کا ایک سٹاپ پنڈی بھی تھا اور اب یہ مسافروں سے پوری طرح بھر چکی تھی بس میں تبلیغی جماعت کا ایک گروپ سوار تھا جو اپنے امیر کی ہدایت کے مطابق ذکر میں مصروف تھا۔ میرے برابر میں ڈیرہ غازی خاں کا ایک نوجوان بیٹھا تھا جو پشام میں واقع جانوروں کے ایک ہسپتال میں ملازم تھا اور اس علاقے میں بھیڑوں کی بیماری پھیل جانے کے باعث ایک نایاب دوا خرید کر لاہور سے واپس جا رہا تھا اسے ساری رات اور پھر اگلے دن بھی سفر کرنا تھا کیونکہ اس کے مطابق یہ بس دو بجے رات پنڈی پہنچنا تھی وہاں سے اسے ایبٹ آباد اور پھر مانسہرہ جانا تھا اور بعد ازاں بغیر نشستوں والی جیپ میں اکڑوں عالم میں پشام پہنچنا تھا وہ چہرے مہرے سے ناخواندہ اور اپنی گفتگو سے نیم خواندہ لگتا تھا۔ اگلی سیٹ پر تین نوجوان براجمان تھے اور اپنی گفتگو سے پڑھے لکھے دکھائی دیتے تھے بس نے سفر کا آغاز کر دیا تھا میرے ہم نشست نے سر پر مفلر لپیٹا اور پھر اونگھنے لگا حتیٰ کہ اس کا سر اگلی نشست

کے ساتھ جالگا۔ تبلیغی جماعت کے ارکان گردن جھکائے مسلسل ذکر میں مصروف تھے اور میرے سامنے والی نشست پر بیٹھے تینوں نوجوان پوری طرح کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے میرا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا کیونکہ میں نے ایک رسالہ نکال لیا تھا اور اب اس کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد اگلی نشست کے مسافروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں اور میری توجہ رسالے سے ہٹ کر ان کی طرف مبذول ہوگئی۔ بائیں جانب سے پہلا نوجوان کہہ رہا تھا۔

''ملک میں انٹی پیپل سرگرمیوں پر کوئی قدغن نہیں مگر انٹی پیپلز پارٹی سرگرمیوں کی پاداش میں جیلیں بھر دی جاتی ہیں۔''

''حکومت اس میں حق بجانب ہے کیونکہ پیپلز پارٹی عوام کے دوٹوں سے برسراقتدار آئی ہے اس لیے اس کے خلاف سرگرمیاں انٹی پیپل سرگرمیاں ہیں'' دوسرے نوجوان نے بھی اتنے ہی جوش وخروش سے یہ باتیں کہیں' جتنے جوش وخروش سے پہلا نوجوان بول رہا تھا۔

''ملکی استحکام کا دارومدار جمہوریت پر ہے ملک میں جمہوری اداروں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہیے کیونکہ اس صورت میں عوام اسلام کے حق میں فیصلہ دیں گے اور اسلامی نظام ہی ملکی استحکام کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ اس ملک کی بنیاد اسلام ہی پر ہے لیکن پیپلز پارٹی کبھی اس ملک میں جمہوریت کو پھلنے پھولنے نہیں دے گی کیونکہ اس صورت میں وہ کبھی برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتی۔'' تیسرے نوجوان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں یہ باتیں کہیں۔

''تم کون سے اسلام کی بات کر رہے ہو' مولانا مودودی کا اسلام جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا محافظ ہے یا ابوذر غفاری کا اسلام جو غریبوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور انہیں حوصلہ دیتا ہے۔'' پیپلز پارٹی کی حمایت میں گفتگو کرنے والا نوجوان پہلے شخص کو چھوڑ کر اس نوجوان سے الجھ پڑا۔

''ہاں ہاں بولو' جواب دو!'' پہلے نے دوسرے کی ہم نوائی میں گردن ہلائی۔

''تم گفتگو کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔'' اسلامی نظام کی بات کرنے والے نوجوان نے جواب دیا ''جب عوام اسلامی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے' اس وقت انہیں اس کی جزئیات طے کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کیونکہ کئی برس پیشتر تمام فرقوں کے علماء اسلام کے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے کا اظہار کر کے ایک دستاویز پر دستخط کر چکے ہیں۔''

اس اثنا میں سامنے سے غلط موڑ کاٹنے والی بس سے بچاؤ کے لیے ہماری بس کے ڈرائیور نے بریکیں لگائیں جس پر میرے برابر میں بیٹھا ہوا نوجوان ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا اور چند لمحے اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے اپنے سر کو ہاتھ لگایا اور پھر کہا۔ ''میرا مفلر کہاں ہے؟'' مفلر اس کے پاؤں کے نیچے سے برآمد ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اسے سر پر باندھا اور اگلی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر دوبارہ خراٹے لینے لگا۔

تبلیغی جماعت کے افراد برابر ذکر میں مشغول تھے۔

''تم دونوں عوام دشمن نظریات کے حامل ہو۔'' گفتگو نجانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی اور اب پہلا نوجوان ان دونوں سے الجھ رہا تھا۔ ''غریب عوام کے دکھوں کا حل نہ اسلام میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی اسلامی سوشلزم میں۔ انقلاب کا راستہ صرف مسلح جدوجہد کا راستہ ہے اس کے بغیر سکھ کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا!''

''ہمارے ہاں برسرِ اقتدار آنے والی حکومتوں میں ایک بھی اسلامی نہیں تھی' ان لوگوں نے محض اپنے اقتدار کے لیے اسلام کا نام لیا اور اب پیپلز پارٹی اسلام اور سوشلزم دونوں کا نام لے کر بیک وقت اسلام پسند اور سوشلسٹ حلقوں کے ذریعے برسرِ اقتدار رہنا چاہتی ہے'' اسلامی نظام کے حامی نوجوان نے جواباً کہا۔

''یہ بالکل بکواس ہے۔ پیپلز پارٹی نے عوام کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کیا اس نے جو منشور عوام کے سامنے پیش کیا تھا وہ بتدریج اسے عملی جامہ پہنا رہی ہے' حکومت کے پاس

الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ وہ ربع صدی کے مسائل چند برسوں میں حل کر دے۔''
دوسرے نوجوان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

کھڑکی کا شیشہ پورے طور پر بند نہ تھا۔ چنانچہ میرے برابر میں بیٹھا نوجوان ایک بار پھر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور سر کو ٹٹولتے ہوئے کہنے لگا ''میرا مفلر کہاں ہے؟'' اس بار یہ مفلر سیٹ کی دوسری طرف سے برآمد ہوا اور نوجوان نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

تبلیغی جماعت کے ارکان اسی خضوع وخشوع کے ساتھ ذکر میں مشغول تھے۔

اب یہ تینوں نوجوان بہت اونچی آواز میں بولنا' شروع ہو گئے تھے۔ ان کی آوازیں گڈمڈ ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ گفتگو دلائل سے نکل کر جھگڑے کی حدود میں داخل ہو چکی تھی ان میں سے کسی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بس اتنا پتہ چلتا تھا کہ ان میں سے ایک اسلام دوسرا اسلامی سوشلزم اور تیسرا سوشلزم کا نام لے رہا تھا۔ ان کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں حتیٰ کہ بس کے دیگر مسافروں نے بھی مڑمڑ کر ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اس اثنا میں تبلیغی جماعت کے ارکان نے بھی تھوڑی دیر کے لیے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ سر جھکا کر ذکر میں مشغول ہو گئے۔

میرے برابر والے نوجوان کی آنکھ ایک بار پھر کھل گئی تھی اس نے سر کو ٹٹولا اور مفلر کو اپنی جگہ موجود پا کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک گولی نکالی اور میرے بے خواب چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''میں نے سلیپنگ پِل کھائی ہوئی ہے تم بھی ایک کھالو اور سو جاؤ'' اس نے گولی میری ہتھیلی پر رکھی اور ایک بار پھر سر سیٹ کے ساتھ ٹکا کر خراٹے لینے لگا۔ تبلیغی جماعت کے ارکان بھی اس سارے جھگڑے سے بے نیاز دوبارہ آنکھیں بند کر کے ذکر میں مشغول ہو گئے تھے۔ بس کا ڈرائیور بوجھل آنکھوں سے بس ڈرائیو کر رہا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب گھپ اندھیرا تھا۔ سامنے دو سو گز کا ٹکڑا روشنی کے دائرے میں تھا' اس سے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا!

❖❖❖

# ہارن کے بغیر!

دفتر سے نکلتے ہوئے میں نے گاڑی کو فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی طرف ٹرن کیا تو گاڑی کا ہارن خود بخود بجنا شروع ہو گیا اور پھر بجتا ہی چلا گیا' راہگیروں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں اور دوسری گاڑیوں والوں نے اسے اپنے خلاف جارحانہ اقدام تصور کرتے ہوئے مجھے ایسی نظروں سے گھورنا شروع کیا کہ میں پانی پانی ہو گیا' میں نے جلدی سے اُتر کو بونٹ کھولا اور ایسے ہی اِدھر اُدھر ہاتھ مارنا شروع کر دیا' جس کے لیے صحیح لفظ ٹامک ٹوئیاں مارنا ہے کیونکہ حرام ہے اگر مجھے بونٹ کے نیچے پائی جانے والی چیزوں کے بارے میں کچھ پتہ ہو'ادھر گاڑی کا ہارن بجتا چلا جا رہا تھا بلکہ یوں لگتا تھا کہ فریاد کی لے اور تیز ہو گئی ہے' اتنے میں ایک شریف آدمی کو مجھ پر ترس آیا یا اسے خود پر ترس آیا' چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر ایک تار ڈس کنکٹ کر دی اور اس کے ساتھ ہی ہارن بجنا بند ہو گیا۔ میں نے اس کا شکریہ اُدا کیا کہنے لگا ''شکریے کی کوئی بات نہیں۔'' اب یہ آپ کے بجانے پر بھی نہیں بجے گا۔ آپ اسے کسی مکینک کے پاس لے جائیں!''

مکینک کے پاس لے جانے کا اس وقت میرے پاس وقت ہی نہیں تھا' کیونکہ مجھے اچانک یاد آیا کہ مجھے تو اس وقت ایک دوست کو ریسیو کرنے اسٹیشن جانا تھا' چنانچہ میں نے گاڑی کا رخ بدل کر اسے اسٹیشن کے راستے پر ڈال دیا۔ چیرنگ کراس سے اسمبلی ہال کا نصف راؤنڈ مکمل کرنے کے بعد میکلوڈ روڈ کی طرف آ گیا کہ مجھے یہاں کچھ دیر کے لیے اپنے پرانے دوست اور ینٹ ہوٹل کے مالک شاہد ملک کے پاس کچھ دیر کے لیے رکنا تھا۔ شاہد ملک اپنے دفتر میں نہیں تھا' چنانچہ میں نے گاڑی موٹر سائیکلوں کے سپیئر پارٹس والی

سڑک پر ڈال دی جو سیدھا اسٹیشن کو جاتی ہے اس سڑک پر بہت رش تھا' تانگے' ریڑھے' کاریں' رکشے' سوزوکیاں' اور اللہ جانے کیا کیا کچھ تھا کہ سیل بلا کی طرح رواں دواں تھا۔ ایک عورت بچے کی انگلی پکڑے سڑک پار کرنے کا ارادہ کر رہی تھی' جس کے لیے وہ چہرے پر پڑے بھاری نقاب میں سے دائیں بائیں دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میرے پاس اتنا مارجن نہیں تھا کہ میں بریک لگا کر اسے گزرنے کا موقع دے سکتا' چنانچہ اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے ہارن دبایا' مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ہارن اب دبانے سے بھی نہیں بجے گا' اِدھر عورت اپنے فیصلے پر درآمد شروع کر چکی تھی' چنانچہ وہ اس وقت سڑک کے عین درمیان میں تھی' میں نے اتنی قوت سے گاڑی کی بریکیں لگائیں کہ بریکوں کی چرچراہٹ نے ہارن کا کام دیا' مگر اس کی وجہ سے ایک سکوٹر سوار نے پیچھے سے مجھے ٹکر مار دی۔ سکوٹر سوار کو پیچھے سے آنے والا رکشہ ''ٹکر'' گیا اور ظاہر ہے خود رکشے والے کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا نازیبا سا سلوک ہوا ہوگا۔

ٹرین کی آمد کا وقت ہو گیا تھا مگر سڑک پر رش اس قدر تھا کہ اس میں سے رستہ بنانے کے لیے ہارن کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی' میں نے دو چار دفعہ ہارن کا کام اپنے منہ سے لینے کی کوشش کی یعنی گردن باہر نکال کر مختلف قسم کی آوازیں لگائیں مگر مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک کہاں اثر کرتا ہے؟ چنانچہ میں راضی برضا ہو کر ڈرائیو کرنے لگا' تاہم اس وقت ضبط کا پیمانہ ایک بار پھر چھلک گیا۔ جب ایک سائیکل سوار عجیب وارفتگی کے عالم میں سیٹی پر کسی فلمی گانے کی دُھن بجاتا ہوا میرے آگے آگے چلنے لگا' حالانکہ وہ اگر ذرا سا بائیں جانب ہو جاتا تو میری مرادیں پوری ہو سکتی تھیں' مگر وہ بدبخت ٹھیک ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا تھا' میں نے دُعا کی کہ یا خدا اس کے کتے فیل ہو جائیں' اس کا پاجامہ سائیکل کے چین میں پھنس جائے' اس کی گدی یا ہینڈل ایک دم سے نیچے کو بیٹھ جائے' لیکن لگتا تھا کہ وہ گھر سے ماں کی دعائیں لے کر نکلا ہے' چنانچہ میری بددعائیں اس پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ چوک میں پہنچ کر وہ بائیں طرف مڑ گیا ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا۔

میں نے ہارن کے بغیر یہ چوک جس طرح عبور کیا' وہ ایک دردناک داستان ہے'
مگر اس المیہ کہانی میں چونکہ ایسے دردناک واقعات خاصی تعداد میں موجود ہیں لہٰذا یہ
داستان چھوڑی بھی جاسکتی ہے۔اب اسٹیشن بالکل قریب رہ گیا' مگر اچانک ٹریفک بلاک
ہوگیا' جن کو اللہ تعالیٰ نے ہارن دیئے تھے' وہ خوش نصیب مسلسل ہارن بجا کر اپنے غم و غصے کا
اظہار کر رہے تھے' مگر یہ بغیر ہارن والا حرماں نصیب صرف دعاؤں کے زور پر رستہ صاف
ہونے کی توقع میں چپ چاپ بیٹھا ہونٹ ہلاتا رہا۔ میرے سامنے ایک ریڑھا کھڑا تھا'
جس پر تیز دھار والے سریے لدے ہوئے تھے اور ان ''نیزوں'' کا رُخ میری طرف تھا۔
میں نے احتیاطاً ان ''نیزوں'' اور اپنے درمیان ''باعزت فاصلہ رکھا ہوا تھا مگر اچانک
گھوڑے نے اُلٹے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے' میں
نے گاڑی کا ایکسلیٹر پورے زور سے دبایا' مگر سر اور کانوں کو ''پرنے'' سے اچھی طرح لپیٹ
کر رکھنے والے کوچوان کے لیے یہ نحیف سا الارم کوئی معنی نہیں رکھتا تھا' چنانچہ گھوڑا دبے
پاؤں پیچھے کی طرف چلتا رہا' میں نے ہاتھ باہر نکال کر گاڑی کے دروازے کو زور زور سے
تھپتھپایا' اتنے زور سے کہ میں بھول ہی گیا کہ یہ سوزوکی کار ہے جس کی باڈی بقول شخصے
ڈالڈا کے ڈبوں سے بنی ہوئی ہے' مگر اس باڈی کو اتنے زور سے بجانے کا رسک لینے کے
باوجود گھوڑے اور کوچوان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی' مجھے اس وقت گھوڑے پر بہت
غصہ آیا کہ کمبخت تم گھوڑے ہو کوئی گدھے نہیں ہو لیکن اس غصے کے اظہار کے لیے بھی ہارن
بجانا ضروری تھا' چنانچہ میں صرف جی مسوس کر رہ گیا اب وہ مقام آپہنچا تھا' جس کا شمار
''مقاماتِ آہ و فغاں'' میں ہوتا ہے یعنی ریڑھے پر لدے ہوئے سریوں اور گاڑی میں کم و
بیش اِتنا فاصلہ رہ گیا تھا جتنا جاں اور دشمن جاں میں ہوتا ہے۔ ایک دفعہ پشاور کی طرف
جاتے ہوئے حسن ابدال کے قریب بھی میں اس جان لیوا تجربے سے گزرا تھا' چنانچہ انجام کا
سوچتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں فوراً کار سے نکل کر باہر آگیا تاکہ کار کے
ساتھ میں بھی کسی سریئے میں پرویا نہ جاؤں' تاہم خدا کا شکر ہے کہ اس عرصے میں ٹریفک
رواں ہو گیا' جس کے نتیجے میں کوچوان نے باگوں کو جھٹکا دیا' ''منہ سے ''کچھ کچھ'' کی آواز

نکالی اور یوں میں اس موذی سواری کی زد میں آنے سے بچ گیا!

اسٹیشن پہنچنے پر میں نے دوست کا سامان گاڑی کے کیریر پر رکھا اور کہا "اس ٹرین کو بھی آج ہی وقت پر پہنچنا تھا۔" دوست نے کہا "اس کی کسر تم نے پوری کر دی' دس منٹ سے باہر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کیا بات ہوگئی تھی؟" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "ابھی پتہ چل جائے گا!" جی ٹی ایس کے اڈے کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بس میرے آگے لگ گئی۔ دوست سے کہا "کیا اس کے پیچھے پیچھے رینگ رہے ہو' اسے پاس کیوں نہیں کرتے؟" میں نے کہا "اس کے پیچھے لکھا ہوا ہے' ہارن دے کر پاس کریں!" دوست نے کہا "ہارن کیوں نہیں دیتے؟" میں نے کہا "ابھی پتہ چل جائے گا!" ریڈیو اسٹیشن والی سڑک پر ٹریفک کم تھا' مگر میرے لیے بہت زیادہ تھا۔ دوست نے کہا "تیز کیوں نہیں چلتے' اس طرح تو ہم منزل تک بہت دیر سے پہنچیں گے۔ میں نے کہا "اگر تیز چلے تو یہ امکان بھی موجود ہے کہ ہم منزل تک کبھی پہنچ ہی نہ سکیں!" دوست نے پوچھا "وہ کیوں؟" میں نے کہا "ابھی پتہ چل جائے گا!" گھر میں کھانے پر میرا اور میرے دوست کا انتظار ہو رہا تھا' چنانچہ میں نے علامہ اقبال ٹاؤن تک پہنچنے کے لیے نہر والی سڑک کا انتخاب کیا کہ وہ پُرسکون اور رواں سڑک ہے' چنانچہ اس کے لیے ریڈیو اسٹیشن سے بائیں جانب ٹرن لے کر میں ڈیوس روڈ پر آیا لیکن سرخ پھولوں والے چنار کے دورویہ درختوں میں سے گزرتے ہوئے سامنے سے ایک کار جھومتی جھامتی آتی دکھائی دی میں نے غیر ارادی طور پر ہارن اور بریکوں پر پاؤں رکھ دیا' بریکیں تو کام آگئیں مگر ہارن نے اس موقع پر بھی خاموشی اختیار کیے رکھی' وہ تو خدا کا شکر ہے کہ سامنے سے آنے والی کار کے ڈرائیور کو عین موقع پر اپنی غلطی کا احساس ہوگیا' مگر یہ احساس قدرے لیٹ تھا' جس کا خمیازہ ہم دونوں کو بہرحال بھگتنا پڑا۔

دوست نے ایک ہاتھ سے اپنا گھٹنا سہلاتے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی گردن سیدھی کرتے ہوئے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟" اس دفعہ میری بجائے اس نے کہا "ابھی پتہ چل جائے گا!"

''کیا پتہ چل جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ ہمارے بغیر ہارن کے گاڑی چلانا بہت خطرناک ہے۔

''یہ تم نے کون سی نئی بات کی ہے۔''

''میں نے کب کہا ہے کہ یہ نئی بات ہے'' دوست نے کہا ''میں تو بہت پرانی بات کر رہا ہوں ...... میں تو جو کچھ کہہ رہا ہوں پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے کہہ رہا ہوں پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے کہہ رہا ہوں، تمہیں پتہ ہے کہ ہارن کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہمارے ہاں ابھی تک کتنے سیاسی، فوجی، مذہبی اور معاشرتی المیے رونما ہو چکے ہیں!''

''کیا مطلب؟ میں نے پوچھا۔ دوست کو تازہ تازہ چوٹ لگی تھی اور یوں اسے ہارن کے ڈانڈے دور دور تک ملانے کا حق تھا۔

دوست نے ایک دفعہ پھر اپنی گردن سہلاتے ہوئے کہا ''مطلب یہ کے خطرے سے آگاہ ہونے اور خطرے سے آگاہ کرنے کے وقت سے پہلے ہارن بجانا بہت ضروری ہے تا کہ طرفین متوقع غلطی سے واقف ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں ہولناک انجام سے بچ جائیں، لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہمارا سیاسی نظام، فوجی، نظام، معاشی نظام اور معاشرتی نظام ہارن سے بے نیاز چل رہا ہے۔ ہارن کی آواز کسی کو اچھی نہیں لگتی چنانچہ اگر کوئی ہارن بجائے تو اربابِ اقتدار ناراض ہو جاتے ہیں، سیاست دانوں کو ان کی کسی غلطی پر ٹوکنے کے لیے ہارن بجائیں تو وہ آگے سے دھمکیاں دینے لگتے ہیں۔ اور اپنا رستہ بدلنے کی بجائے پرانے رستوں پر چلتے رہتے ہیں۔ مذہبی رہنماؤں کے کان خطرے کے ہارن نہیں سن رہے حالانکہ اس پر توجہ نہ دینے کی صورت میں ان مذہبی رہنماؤں سمیت سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔ معاشی بزرجمہروں نے معاشی نظام میں وہ ہارن ہی فٹ نہیں ہونے دیا۔ جو بدترین معاشی ناہمواری کے نتیجے میں جنم لینے والے ہولناک تصادم سے بچا سکے۔ معاشرتی سیاست دانوں نے کانوں پر مفلر لپیٹے ہوئے ہیں اور ہارن کی تار بھی ڈس کنکٹ کی ہوئی ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں ہم جن المیوں سے گزر چکے ہیں، وہ ہمیں کافی بڑے

ایسے لگتے ہیں۔لیکن یقین کرو' یہ نظام اگر زیادہ دیر بغیر ہارن کے چلتے رہے تو ان کی تباہ کاریاں ایسی ہیں کہ جن کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں۔لوگوں کی زندگیوں اوران کے عقیدوں سے کھیلنا بہت بڑا جرم ہے' ایک نسل تو ہمارے اس جرم کا عذاب بھگت چکی ہے' کم از کم آئندہ نسلوں کواس عذاب سے بچالو!

میں نے کار ایک الیکٹریشن کی دکان پر روکی اور کہا۔''اس کا ہارن خراب ہے' ٹھیک کردو!''اوراس کے بعد میں کچھ اس طرح مطمئن ہوگیا جیسے میں نے اپنی کار کا ہارن نہیں' موجودہ نظام کا ہارن ٹھیک کروانے کی ہدایت کردی ہے!

# آسیب زدہ گھر

یوم آزادی کی شام کو میرا بھانجا ندیم ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا' اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر خوف کی لکیریں تھیں۔

''ماموں! ماموں! ہمارا گھر آسیب زدہ ہے' وہاں ہمارے علاوہ کوئی اور بھی رہتا ہے۔'' اس نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور کون رہتا ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''کوئی بھوت رہتا ہے!'' ندیم نے پورے یقین سے کہا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''کل جب میں سو کر اُٹھا تو باجی نے مجھ سے پوچھا کہ تم رات کو صحن میں کیا کر رہے تھے۔ میں نے باجی سے کہا کہ میں تو شام کو گھر آتے ہی سو گیا تھا اور ویسے بھی رات کو تو صحن والے دروازے کو تالہ لگا دیا جاتا ہے' لہٰذا میرے صحن میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' مگر باجی قسمیں کھاتی ہیں۔ انہوں نے رات کو اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ میں صحن میں درخت کے پاس کھڑا تھا۔ ماموں آپ یقین کریں ہمارے گھر میں کوئی بھوت ہے!''

میں ندیم کی اس کیفیت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا!

''ماموں آپ ہنس رہے ہیں' آپ یقین کریں میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' ندیم نے سنجیدگی سے کہا ''یہ صرف ایک واقعہ نہیں۔ پرسوں عابد بھائی جان گھر آئے تو انہوں نے

دیکھا کہ باجی کی چھوٹی بچی پورچ میں کھیل رہی ہے۔ حالانکہ اس روز میرے اور عابد کے علاوہ سب لوگ امجد بھائی جان کے گھر گئے ہوئے تھے' آپ کو پتہ ہے عابد بھائی جان بہت دلیر ہیں مگر اس کے بعد سے وہ بھی اتنے ڈرے ہوئے ہیں کہ اکیلے کمرے میں نہیں سو رہے!''

''بیٹے بھوت دوت کچھ نہیں' یہ سب تمہارا وہم ہے۔''

میں نے ندیم کو تسلی دیتے ہوئے کہا میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ ڈرا ہوا ہے!

''ماموں آپ کمال کی بات کرتے ہیں' سارا گھر سہا ہوا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں۔ چلیں آپ میری بات پر یقین نہ کریں' ابا جی کے بارے میں تو آپ کو پتہ ہے کہ وہ ان باتوں کو نہیں مانتے مگر آپ فون کر کے ان سے پوچھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا ہے؟''

''وہ اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے کہ انہیں دادا ابا نظر آئے!'' دادا ابا؟ وہ تو فوت ہو چکے ہیں!

''ہاں' لیکن وہ دادا ابا ہی تھے۔''

''انہوں نے ابا جی کے گالوں کو ہلکے سے سہلایا اور پھر غائب ہو گئے! اب آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''یہی کہ یہ سب وہم کے کرشمے ہیں۔'' میں نے اعتماد سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ انسانی ذہن انسان کو ایسے ایسے فریب دیتا ہے کہ انسان انہیں فریب ماننے پر بھی مائل نہیں ہوتا۔ تم لوگ چونکہ اپنے گھر کے بارے میں وہم میں مبتلا ہو گئے ہو اس

لیے ہر فرد مزید وہم کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔''

''مگر باجی نے مجھے خود صحن میں کھڑے دیکھا' انہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں نے کب کہا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے' مگر درحقیقت اس نے خواب دیکھا تھا جس کا اثر صبح تک اس کے ذہن پر تھا' بعض خواب اسی طرح کے ہوتے ہیں!''

اور عابد بھائی جان نے جو کچھ دیکھا وہ بھی خواب تھا؟''

''نہیں' وہ خواب نہیں تھا' عابد روزانہ گھر آتا ہے تو اسے پورچ میں بچے کھیلتے ہوئے ملتے ہیں' پورچ سے اپنے کمرے تک جاتے ہوئے چند سیکنڈ لگتے ہیں' عابد اس بچی کے پاس رُکا نہ اس سے بات کی۔ اسے چند لمحوں کے لیے صرف اس کی موجودگی کا احتمال ہوا' دراصل وہ اپنی روٹین میں ادھر سے گزرا اور اپنی سابقہ روٹین میں اسے بچی پورچ میں کھیلتی ہوئی محسوس ہوئی' یہ محض نظر کا دھوکہ ہے اور کچھ نہیں!''

''چلیں مان لیا' مگر وہ دادا ابا؟ جب کہ ابا جی تو ان چیزوں کو مانتے بھی نہیں!''

''یہ گھر میں پھیلے ہوئے خوف کا منطقی نتیجہ ہے'' میں نے کہا ''وہ اگرچہ بہادر آدمی ہیں' ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتے مگر لاشعوری طور پر وہ بھی اس خوف کے تسلط میں آگئے جس خوف میں پورے گھر والے مبتلا ہیں' چنانچہ ان کا وژن ان کے لاشعور کے اتنے تابع ہو گیا کہ انہیں ان کے مرحوم والد دکھائی دیئے جو اُن کی طرف بڑھے' ان کے گالوں کو سہلایا اور انہیں اس کا باقاعدہ لمس بھی محسوس ہوا' اسے ہیلوسی نیشن کہتے ہیں!''

''ندیم کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اگرچہ میری بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی' لیکن اسے میری گفتگو سے تھوڑا بہت اطمینان ضرور حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کے لیے گفتگو کو طول دیتے ہوئے کہا۔

''دراصل گزشتہ کچھ برسوں سے ملکی حالات نے عوام کے اعصاب شل کر دیئے ہیں' اور وہ خود کو گھر کی چار دیواری میں بھی محفوظ تصور نہیں کرتے۔ دن دہاڑے ڈاکے' اغوا'

قتل، نامعلوم ہاتھوں سے سفاکانہ قتل عام، یہ سب عوامل ہیں جس کے نتیجے میں عوام کی ایک بڑی تعداد نفسیاتی امراض کا شکار ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے مضبوط اعصاب والے لوگ ان دنوں اسی طرح کے توہمات کا شکار ہیں۔ اب تم گھر جاؤ اور اطمینان سے سو جاؤ تمہارے گھر میں باہر کا کوئی آدمی نہیں، یہ سب تمہارے اندر کے وہم ہیں''!

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ندیم میری باتوں سے اب پوری طرح پُرسکون ہے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد میں نے مین گیٹ اور اندر کے دروازے مقفل کیے اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا، میں ابھی غنودگی کے عالم میں تھا کہ دروازے پر گھنٹی سنائی دی، میں باہر نکلا تو سامنے ندیم کھڑا تھا، وہ اپنی عینک بھول گیا تھا اور اسے واپس لینے آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دوبارہ دروازے مقفل کیے اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا!

اگلے روز ندیم میری طرف آیا تو وہ بہت ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کہا ''ماموں جان آپ سے گفتگو کا مجھے بہت فائدہ ہوا، میرے سب وہم دور ہو گئے بلکہ اب سب گھر والوں کو بھی یقین ہو گیا ہے کہ گھر میں کوئی آسیب نہیں ہے، یہ صرف ہمارے اندر کے خوف ہیں!''

''چلو شکر ہے کہ تم لوگوں کو بھی عقل آئی'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''ویسے تمہیں دیکھ کر میں سمجھتا تھا کہ شاید رات کو تم عینک کے علاوہ کوئی اور چیز بھی بھول گئے تھے جو صبح صبح لینے کے لیے آ گئے!''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میں تو عینک پہنتا ہی نہیں!''

ندیم نے حیرت سے کہا۔

''کیا؟ تم رات کو دوبارہ میری طرف نہیں آئے تھے؟''

''نہیں ماموں، میں تو گھر جا کر آرام سے سو گیا تھا اور صرف گھنٹہ پہلے بیدار ہوا ہوں!''

خوف کی ایک شدید لہر نے میرے پورے جسم کو شل کر کے رکھ دیا۔

ندیم کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ میں آج کسی عامل کے پاس جاؤں گا اور اس سے پوچھوں گا کہ یہ کیسا آسیب ہے جو کسی غیر کے نہیں اپنوں کے روپ میں ہمارے گھروں میں داخل ہو گیا ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے خوف زدہ کرتا چلا جا رہا ہے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے بھوت بنتے جا رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی ہم سے ہمارے گھر خالی کرانا چاہتا ہو؟

# ڈائننگ

دوحہ کے لبنانی ریستوران میں راشد بٹ نے اشارے سے نیپالی ویٹر کو بلایا اور پھر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس پر وہ گھبرا کر بولا ''نہیں صاحب نہیں صاحب' ایسا نہیں ہوسکتا۔'' یہ صورتحال دیکھ کر چودھری نورالحسن تنویر' قاضی محمد اصغر اور خود مجھے بھی فکر لاحق ہوئی چنانچہ میں نے ویٹر سے پوچھا ''کیا مسئلہ ہے؟'' اس نے کہا' صاحب بولتا ہے کہ ریستوران میں جو کچھ ہے وہ دو دو کلو لے آئے۔ میں بولا ایسا نہیں ہوسکتا۔ چار آدمی اتنا کھانا نہیں کھاسکتے۔'' یہ سن کر چودھری نورالحسن تنویر اور قاضی محمد اصغر نے بھی معصوم سی شکل وصورت کے راشد بٹ پر چڑھائی کردی ''بٹ صاحب! خدا کا خوف کریں۔ آپ اور عطا صاحب تو کشمیری ہیں۔ چنانچہ آپ لوگ تو کھا جائیں گے مگر ہم دو شرفا کو آپ کیوں احساس کمتری میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے قاضی اصغر نے مینو ہاتھ میں تھاما اور کہا ''میں خود آرڈر کرتا ہوں۔'' آرڈر کی مقدار سن کر راشد بٹ تلملا اٹھا اور بولا ''قاضی صاحب! آپ میرے ساتھ مذاق کرسکتے ہیں کہ آپ میرے بڑے ہیں مگر آپ مہمان کے ساتھ مذاق نہ کریں۔ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟'' اس موقع پر مجھے دخل در ''ماکولات'' دینا پڑا چنانچہ میں نے راشد بٹ کو مخاطب کرکے کہا ''اگر تو تم مجھے کشمیری سمجھ کر چار آدمیوں کے لیے پچاس آدمیوں کا آرڈر دے رہے ہو تو واضح رہے میں تمہاری عمر کا کشمیری نہیں ہوں اور اگر مہمان سمجھتے ہو تو جو آرڈر قاضی صاحب دے رہے ہیں وہ بھی میرے حساب سے بہت زیادہ ہے۔'' مگر میزبان راشد بٹ بضد رہا کہ کھانے کا آرڈر دینا اس کا ذاتی مسئلہ ہے اور کسی کے ذاتی مسئلے میں دخل دینا کوئی اچھی بات نہیں لیکن بالآخر بظاہر فتح چودھری نورالحسن

تنویر اور قاضی محمد اصغر کی ہوئی۔ ''بظاہر'' کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کھانا آیا تو وہ اگر چہ پچاس لوگوں کے لیے تو نہیں تھا مگر دس بیس لوگ بہر حال بآسانی کھا سکتے تھے۔ راشد بٹ جب ہم سے اجازت لے کر واش روم گیا تھا وہ دراصل اس نیپالی ویٹر کے پاس گیا تھا۔

کھانے کا ذکر چھڑا تو اس حوالے سے کچھ باتیں بھی ہو جائیں مثلاً یہ جو ہم ''سندھ ہند'' والے رنگ برنگے کھانوں کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی مشہور ہو گئے ہیں تو سچی بات پوچھیں اس معاملے میں ہم عربوں کی ''خاکِ پا'' بھی نہیں ہیں۔ ''تقبلات''، یعنی اسٹارٹر میں ایک پورا ٹرے سلاد کا آتا ہے۔ اس کے ساتھ خمس جو چنے اور تل پیس کر بنایا جاتا ہے تل، بینگن اور انار دانہ کا مرکب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بابا غنوج، اسے آپ بینگن کا بھرتا کہہ سکتے ہیں پھر ختوش یہ سلاد کی ایک قسم ہے جس میں چھوٹے پاپڑ ہوتے ہیں اور اوپر لیموں نچوڑا گیا ہوتا ہے۔ تقبلات میں ''فولی'' بھی ہوتا ہے۔ ہے نا بیوقوفانہ نام۔ یہ سرخ لوبیا ہے جس میں زیتون کا تیل تیرتا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ روٹی کی مختلف قسمیں جن میں ترکی روٹی کا جواب نہیں۔ آپ جب ان لذیذ ''کھانوں'' سے پیٹ بھر چکتے ہیں تو پتہ چلتا ہے یہ تو وقت گزاری کے لیے تھا جس اصل کھانے کا آپ نے آرڈر دیا تھا وہ تو وہی آتا ہے اور اس میں سی فوڈ کی ورائٹی ہوتی ہے جس میں جھینگا مچھلی سے کیکڑا تک شامل ہے پھر مکسڈ گرل (Mixed Grill) جو کباب، چکن اور مٹن کی چانپوں اور پیسز پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کبدہ یعنی کلیجی، چکن ونگز اور اللہ جانے کیا کیا! آخر میں سویٹ ڈش جس میں سے مشہور ترین کا نام ''ام علی'' ہے یہ مزے میں دودھ باقر خانی جیسی ہے اور ہاں مشروبات کا تو میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ ایک مشروب ''منصف'' کے نام کا ہے جو گھی، دہی، گوشت اور چاول کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ یہ اردنی مشروب ہے اور اس سے ملتا جلتا ہے جسے ہم ''کاڑھا'' کہتے ہیں اور جو عورتوں کی ڈلیوری کے بعد طاقت کی بحالی کے لیے پلایا جاتا ہے۔

کھانا کھا کر ریستوران سے نکلے تو راشد بٹ نے کہا ''مجھے احساس ہے کہ آج کا کھانا آپ کے لیے قدرے ہیوی تھا۔ آپ کا رات کا کھانا انکل عبدالحمید المفتاح کے بیٹے

ماجد کی طرف تھا جو میرا دوست ہے۔ میں نے اس سے اجازت لے لی ہے کہ آپ رات کا کھانا بھی میری طرف کھائیں۔ میں آپ کو سادہ سی کوئی ڈش کھلاؤں گا تا کہ سفر میں آپ کے لیے کوئی پرابلم نہ ہو۔!'' میں نے اس کے خیر خواہانہ جذبے کی داد دیتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔ رات کو چودھری تنویر الحسن' زاہد مفتاح' قاضی محمد اصغر' شکیل بٹ اور میں راشد بٹ کے گھر میز کے گرد بیٹھے کسی سادہ سی ڈش کے منتظر تھے۔ اتنے میں دو مزدور اندر داخل ہوئے انہوں نے ایک بہت بڑا تھال اٹھایا ہوا تھا۔ یہ ''سادہ سی ڈش'' سالم بکرا تھا جس میں پانچ کلو چاول' دس مرغ روسٹ' بیس ابلے ہوئے انڈے' کشمش اور دوسرا ڈرائی فروٹ شامل تھا۔

میں نے بے بسی سے راشد بٹ کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا ''انکل! آپ پریشان نہ ہوں یہ بہت لائٹ عربی ڈش ہے اس کا نام ''دسکجو بوس'' ہے دوپہر کو اگر کچھ بد پرہیزی ہوئی ہے تو یہ اسے بیلنس کر دے گی۔ ویسے انکل میں اگر ان دنوں ڈائٹنگ نہ کر رہا ہوتا تو آپ کو اپنی مرضی کا کھانا کھلاتا۔'' بہر حال اس روز یہ عقدہ ضرور حل ہو گیا کہ کشمیر ابھی تک آزاد کیوں نہیں ہوا۔

---

# نیویارک میں غریب غربا سے ملاقاتیں!

نیویارک کے ٹائم اسکائر میں عزیز احمد کے ساتھ مٹر گشت کرتے ہوئے اچانک میری نظر ایک سائیکل رکشہ پر پڑی جسے ایک گورا امریکی کھینچ رہا تھا' میں نے سوچا کہ کھاتے پیتے لوگوں کا یہ کوئی نیا چونچلا ہے کیونکہ یہ سواری تو صحت اور انسانی وقار کے منافی قرار دے کر ہمارے بہاولپور اور بعض دوسرے علاقوں میں سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف نے ختم کردی تھی اور ان غریب لوگوں کو متبادل روزگار کے وسائل فراہم کیے تھے۔ یہ سواری اب بھارت یا بنگلہ دیش ایسے ملکوں ہی میں نظر آتی ہے جہاں نحیف ونزار غریب لوگ دو دو من کے مہاشوں اور سیٹھوں کا بوجھ کھینچ رہے ہوتے ہیں چنانچہ میں نے سوچا کہ دنیا کی واحد سپر پاور اور اس کے منتخب روزگار شہر نیویارک میں سائیکل رکشہ محض شوقیہ ہی رکھا جاسکتا ہے مگر میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھ فٹا گورا امریکی سائیکل رکشہ کو فٹ پاتھ کے قریب کھڑا کر کے گاہکوں کی تلاش میں اپنی نظریں اِدھر اُدھر گھمار ہا ہے' اس کی نظر ہم پر پڑی تو اس نے کچھ اس طرح کا اشارہ کیا کہ بچپن میں ایک عمارت کی دیوار پر لکھا ہوا یہ شعر یاد آ گیا ؎

جاتے ہو کدھر کو' کدھر کا خیال ہے
بیمار دانتوں کا یہی ہسپتال ہے

اسی دوران بارش شروع ہو چکی تھی اور فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی' ہمارا ہوٹل ''ٹریول ان'' نویں اور دسویں ایونیو کے درمیان 42ویں اسٹریٹ پر واقع تھا یعنی ٹائم اسکائر سے ہمیں قریباً ڈھائی بلاک (ایک فرلانگ) اس بارش اور سردی میں پیدل چلنا تھا' چنانچہ سوچا کہ اس گورے امریکی کی خدمات حاصل کی جائیں تا کہ ایک تو نیویارک میں سائیکل رکشہ کی

سواری کا تجربہ کیا جائے اور دوسرے غریب امریکی کی سرپرستی بھی ہو سکے۔ عذیر احمد نے پوچھا ''کتنے پیسے لوگے؟'' بولا ''دس ڈالر'' یہ سراسر استحصالی دام تھے میں نے پانچ ڈالر کی پیشکش کی اور وہ چھ پر رضا مند ہوگیا' اس سائیکل رکشے میں بڑے اچھے طریقے سے سواریوں کو بارش سے بچانے کا انتظام کیا گیا تھا مگر جب سامنے سے ہوا کے تھپیڑے پڑنا شروع ہوئے اور گورے امریکی کو دو ''صحت مند'' پاکستانیوں کو کھینچنا پڑا تو اس کا سانس پھول گیا اور اس نے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پوچھنا شروع کر دیا ''تمہارا ہوٹل اور کتنی دور ہے؟'' تاہم منزل مقصود پر پہنچ کر ہم نے اس امریکی کو ٹپ دی' اگرچہ یہ ٹپ اس ٹپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو امریکی بین الاقوامی خدمات کے عوض ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو دیتے ہیں!

ٹائم اسکائر میں ہم نے صرف سائیکل رکشہ ہی نہیں' تانگہ بھی دیکھا بلکہ اسے یکہ کہنا چاہیے جسے ایک ''یکے والی'' حسینہ چلا رہی تھی بلکہ اس کی شکل بھی ہماری فلم ''یکے والی'' کی ہیروئن مسرت نذیر سے ملتی جلتی تھی' ماضی کی یہ ''قیامت خیز'' ہیروئن ان دنوں ہے بھی امریکہ میں' چنانچہ کوئی پتہ نہیں کہ یہ وہی ہو۔ تفنن برطرف' امریکہ میں مقیم ہمارے پاکستانی دوستوں کا کہنا ہے کہ یہ یکہ اور یہ سائیکل رکشہ محض ٹورسٹوں کا دل لبھانے ہے' یکے کی حد تک تو ان کی بات ٹھیک ہے' لیکن سائیکل رکشہ بھی اگر ٹورسٹوں کو اپنی طرف اٹریکٹ کرنے کے ہیں تو پھر ان رکشہ ڈرائیوروں کے اس ''قومی جذبے'' کی داد دینا چاہیے جو اپنی صحت اور انسانی وقار کے منافی یہ کام محض جذبہ حب الوطنی کے تحت کر رہے ہیں!

امریکہ میں ہارلم کے علاقے ہی میں نہیں ''پوشڈ'' علاقوں میں بھی بہت سے غریب غربا سے ملاقاتیں ہوئیں' یہ لوگ ٹریفک سگنل بند ہونے پر آپ کی کار کی سکرین صاف کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے عوض اگر آپ انہیں کچھ نہ دیں تو یہ آپ کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں اور یہ (کم سے کم) گالیاں ہوتی ہیں...... ایک کالے امریکی کو میں نے دیکھا کہ مین ہٹن کے بس ٹرمینل کے پاس لگے ٹیلیفون بوتھ میں لوہے کی باریک تار داخل کر کے اس میں سے پیسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا' اس کے پاس ایسے سینکڑوں لوگ

گزر رہے تھے مگر وہ ان سے بے نیاز اپنے کام میں مشغول تھا۔ کچھ غریب غربا رحم بھری اپیلوں کے بینر لگائے بھیک مانگ رہے تھے البتہ ان میں سے ایک گداگر مجھے بہت کھرا شخص لگا' اس نے اپنے پاس لکھ کر لگایا ہوا تھا "میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہوا ہے چنانچہ میں بھوکا نہیں ہوں مگر مجھے پیسوں کی ضرورت ہے"میں نے ان سب گداگروں کی مدد کی اور سب کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا کیونکہ یہ امریکی تھے اور میں پاکستانی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ انفرادی گداگر تھے' ہم من حیث القوم گداگر ہیں چنانچہ یہ گداگر جب ان گداگروں کی ہتھیلی پر ایک کوارٹر رکھتا تھا تو ضمیر پہ سے تھوڑا سا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔!

# میں دہشت گرد ہوں!

میں ایک غیر ملکی ائیر لائن میں ہیوسٹن سے پیرس کے لیے روانہ ہوا تو جہاز میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ مسافروں میں' میں اکیلا پاکستانی ہوں۔ میں نے اپنا ہیڈ بیگ سامان والے باکس میں رکھا اور اپنی آرام دہ نشست پر دراز ہوگیا۔ ائیر ہوسٹس نے اورینج جوس کا گلاس نشست کے ساتھ بنی مخصوص جگہ پر رکھ دیا تھا اور اب وہ دوسرے مسافروں کو سرو کر رہی تھی۔

مسلسل ایک ماہ کی تھکن مجھ پر سوار تھی چنانچہ کچھ ہی دیر بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی مگر اچانک ایک خیال نے میری نیند اڑا دی۔ میں نے سوچا کہ چونکہ اس جہاز میں سفر کرنے والا میں اکیلا پاکستانی ہوں۔ لہٰذا اگر دوران پرواز اسے ''کچھ'' ہوگیا اور سارے مسافروں سمیت میں مارا گیا تو اگلے ہی روز دنیا بھر کے اخباروں کی سرخیاں ہوں گی ''دہشت گردی کے نتیجے میں جہاز فضا میں تباہ ہوگیا دوسرے مسافروں کے ساتھ خودکش پاکستانی بمبار بھی ہلاک'' اس اس خبر کے ساتھ میرے دہشت گرد ہونے کے بہت سے ثبوت بھی پیش کیے جائیں گے۔ مثلاً جہاز کے تباہ شدہ ملبے سے دہشت گرد کا صحیح سلامت پاسپورٹ برآمد ہوا۔ ہیوسٹن انیر پورٹ پر نصب کیمروں سے پتہ چلا ہے کہ دہشت گرد بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد دو تین دفعہ بے چینی کے عالم میں بریفنگ لاؤنج سے باہر نکلا اور سگریٹ نوشی کرتا رہا' اسے دو پاکستانی الوداع کہنے آئے تھے۔ جس کے حلیئے دہشت گردوں جیسے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھسر پھسر کرتا رہا۔ ملزم کے دہشت گرد ہونے کے حوالے سے کچھ اور ٹھوس ثبوت بھی ملے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ اسے متعدد مرتبہ ایک دینی

مدرسے کے سامنے سے گزرتے دیکھا گیا۔ اگرچہ یہ مدرسہ اس کے دفتر کے راستے میں آتا تھا تاہم وہ دفتر جانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی تلاش کر سکتا تھا۔ اس نے کسی زمانے میں چھوٹی سی داڑھی بھی رکھی تھی جو دو ہفتے بعد منڈوا دی کہ اس سے خارش ہوتی تھی۔ اسے اکثر لوگوں نے عید کی نماز بھی پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک بڑا ثبوت یہ کہ اس نے اپنے حالیہ سفر کے دوران اپنا ایک روٹ بھی تبدیل کرایا تھا جس کی تفصیلات سے پتہ چلا ہے کہ اس نے پہلے پیرس سے نیویارک اور نیویارک سے ٹورنٹو جانا تھا مگر وہ پیرس سے سیدھا ٹورنٹو گیا اور پھر ٹورنٹو سے نیویارک آیا!

میں نے سوچا میرے دہشت گرد ہونے کے حوالے سے اتنے ٹھوس شواہد کی موجودگی میں متعدد ملکوں میں پاکستانیوں کے خلاف کریک ڈاؤن کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ پاکستان میں میرے دوست حیرت سے ایک دوسرے سے کہیں گے ''یار وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا' مگر انسان کا کیا پتہ؟'' پاکستانی حکومت اس حوالے سے اٹھنے والے بین الاقوامی پراپیگنڈے پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرائے گی کہ یہ دہشت گرد کا ذاتی فعل تھا۔ لہٰذا اس کی مذموم کارروائی کو پاکستان یا اسلام کے کھاتے میں نہ ڈالا جائے۔ اس کے ساتھ میرے بیوی بچوں کو حراست میں لے لیا جائے گا۔ کوئی پتہ نہیں امریکہ کے حوالے کر دیا جائے۔ وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ بھی ہو گی اور یوں یہ تسلیم کر لیا جائے گا کہ دہشت گردی میں نے ہی کی ہے۔

ان خوفناک خیالات کے نتیجے میں میری نیند بالکل ہی ہوا ہو گئی' چنانچہ میں نے خود کو تسلی دینے کے لیے اپنی سوچ کو مثبت بنانے کی کوشش کی' میں نے سوچا کہ ان بے ہودہ قسم کے مفروضوں کے نتیجے میں دنیا مجھے دہشت گرد کیسے قرار دے سکتی ہے۔ ایسی الزام تراشی پر سنجیدہ طبقے اپنی حکومتوں سے یہ نہیں کہیں گے کہ کسی کا جرم ثابت ہونے سے پہلے اسے مجرم کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟ مگر میری یہ سوچ عارضی ثابت ہوئی کیونکہ مجھے یاد آیا کہ نائن الیون اور سیون سیون کے ''ملزموں'' کو اگر دنیا نے بغیر کسی عدالتی کارروائی کے ''مجرم'' تسلیم کر لیا ہے۔ تو میرے سلسلے میں وہ انصاف کے تقاضے پورے کیوں کیے جائیں گے؟

میرے ان خیالات نے مجھے دوبارہ مایوسی کے پاتال میں دھکیل دیا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اپنے اللہ سے مدد مانگوں چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر کے ایک دو عربی دعاؤں کے ساتھ اللہ سے دعا کی کہ یارب اس جہاز کو بخیر و عافیت اس کی منزل تک پہنچا۔ تاہم میں نے یہ عربی دعائیں دل ہی دل میں پڑھی تھیں، اگر اونچی آواز میں پڑھتا تو دوسرے مسافروں کے علاوہ خود مجھے بھی یقین آ جانا تھا کہ میں دہشت گرد ہوں۔

❖❖❖

# نشیب وفراز

پیر کے روز صبح ساڑھے تین بجے برطانیہ میں جشن فراز میں شرکت کے لیے میں لاہور سے برمنگھم جانے والے جہاز میں سوار ہوا تو ساری رات جاگنے کی وجہ سے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، اس جشن کے آرگنائزر میرے دوست منصور آفاق تھے۔ جہاز نے پہلے دوبئی رکنا تھا اور اس کے بعد برمنگھم کے لیے روانہ ہونا تھا۔

دوبئی تک میرے ہم سفر زیادہ تر پاکستانی تھے مگر دوبئی سے آگے مجھے چٹی چمڑی والوں کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ میں نے دیکھا کہ تقریباً 65 برس کا ایک چھ فٹا انگریز بابا جس نے جین کی شرٹ اور پتلون پہنی ہوئی تھی اور جو اپنی عمر اور لباس میں عدم مطابقت کے باوجود شکل وصورت سے ایک معقول شخص لگتا تھا' میرے ساتھ والی قطار کی پہلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جو اس نے بہت احتیاط سے بیگج کیبن میں رکھ دیا تھا۔ شدید تھکاوٹ کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں' میں نے سیفٹی بیلٹ باندھی اور سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے ان احتیاطی تدابیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جن کی تفصیل سمندر میں جہاز گرنے کے حوالے سے بتائی جا رہی تھیں حالانکہ اس صورت میں جو کرنا ہوتا ہے وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر ہی نے کرنا ہوتا ہے چنانچہ متوقع وفات سے قبل بے بس مسافروں کو خوفزدہ کرنے کا یہ انداز مجھے کبھی پسند نہیں آیا!

میں ابھی سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں تھا کہ مجھے خطیبانہ انداز کی ایک تقریر سنائی دینا شروع ہوئی۔ مجھے اس پر موچی دروازے کے باہر مجمع لگانے والے اس "خطیب" کا شائبہ گزرا جو اپنی تقریر کا آغاز امتِ مسلمہ کے زوال سے شروع کرتا اور اس کا

اختتام جسم میں برقی لہر دوڑا دینے والی ''ادویات'' پر ہوتا تھا۔ مگر جو تقریر مجھے سنائی دے رہی تھی وہ انگریزی میں تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور گردن موڑ کر پچھلی سیٹوں پر نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی مقرر مجھے نظر نہ آیا۔ میں نے اپنے بائیں جانب دیکھا تو وہاں ایک گول مٹول سا انگریز بچہ سیٹ کے ساتھ لگی ٹی وی سکرین پر ویڈیو گیم کھیلنے میں مشغول تھا۔ آواز مسلسل آ رہی تھی۔ میں نے اپنے دائیں جانب نظر دوڑائی تو جین کی شرٹ اور پتلون میں ملبوس وہ چھ فٹا انگریز سیٹ کی ٹیک پر اپنا سر ٹکائے بالکل ساکت انداز میں بیٹھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تو حرکت نہیں کر رہیں لیکن اس کے لب حرکت کر رہے ہیں۔ یہ ولولہ انگیز تقریر دراصل ادھر ہی سے نشر ہو رہی تھی۔ مجھے اس کے شیکسپیئرین لہجہ کی وجہ سے اس کی انگریزی پوری طرح سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر بچپن ہی سے مجمع بازوں کی حیات افروز تقریریں سننے کے شوق نے اس عمر میں بھی میری نیند اڑا دی اور میں اس انگریز مجمع باز کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ مجھے اس امر پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس انگریز سنیاسی بابا کو جہاز میں اپنی مقوی ادویات بیچنے کی اجازت کیسے ملی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی اپنی سیٹ سے اٹھے گا بیلج کیبن میں سے اپنا بیگ نکالے گا اور اعلان کرے گا ''مہربان قدردان' اگر آپ یہ دوا کمپنی سے منگوائیں گے تو پچاس پاؤنڈ کی ملے گی مگر یہاں کمپنی کی مشہوری کے لیے صرف پانچ پاؤنڈ میں آپ یہ دوا خرید سکتے ہیں۔ جن صاحب کو درکار ہو وہ آواز دے کر طلب کریں۔ پانچ پاؤنڈ' پانچ پاؤنڈ' پانچ پاؤنڈ!''

مگر میری یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی' وہ مجمع باز ضرور تھا مگر وہ دوا نہیں اپنی شاعری بیچ رہا تھا۔ وہ اپنی نظمیں مسلسل پورے جوش و خروش اور بلند آواز میں سنا رہا تھا مجھے اس کی جو لائنیں سمجھ آئیں وہ کچھ یوں تھیں ........

میں آنکھیں بند کر کے کیتھرین کے بارے میں سوچتا ہوں وہ آنکھیں کھول کر مجھے دیکھتی ہے۔

اور سوچنا بند کر دیتی ہے

وہ نہیں جانتی وہ کتنے بڑے شاعر کی محبت سے محروم ہوگئی ہے جب ایک سو سال بعد ولیم کی شاعری پر کتابیں لکھی جائیں گی اور اس میں اس بے وفا کا ذکر ہوگا۔

تو اس کے پڑپوتے کہیں گے

کتنی بے وقوف تھی ہماری پڑنانی!

تو گویا اس عظیم شاعر کا نام ولیم تھا جس کی قدر اس کے مرتبے کے مطابق نہیں ہو رہی تھی مگر اسے یقین تھا کہ آنے والا وقت اس کی عظمت کو تسلیم کرے گا۔ مجھے اس عظیم شاعر پر ترس آنے لگا لیکن اس کے دل میں میرے سمیت جہاز کے تمام رات کے جاگے ہوئے مسافروں کے لیے کوئی رحم نہیں تھا کیونکہ وہ مسلسل بآواز بلند اپنی نظمیں پڑھنے میں مشغول تھا اور درمیان میں خود ہی اپنی شاعری پر داد و تحسین کے ڈھونگرے بھی برساتا جاتا تھا۔ ''تم بہت عظیم ہو مسٹر ولیم! تمہارے جیسا شاعر کسی ماں نے نہیں جنا۔ اس دنیا میں واحد شعر شناس تمہارا دوست پیٹر ہے جس نے تمہارے شاعرانہ مرتبے پر کتاب لکھ کر ان سب نقادوں کے منہ بند کر دیئے ہیں جو مارے حسد کے تمہیں معمولی شاعر قرار دے دیتے ہیں۔''

مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے سو اس عظیم المرتبت شاعر کے شور شرابے کے باوجود میری آنکھ لگ گئی۔ تاہم ولیم نے میر صاحب کا یہ شعر کہاں سنا ہوگا۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو

ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

کیونکہ میرے بالیں پر شورِ قیامت جاری تھا میں سودا نہیں تھا کہ خدام ادب کہتے ''ابھی آنکھ لگی ہے'' چنانچہ میری آنکھ ایک دفعہ پھر کھل گئی۔ میری طرح جہاز کے دوسرے مسافر بھی اس صورتحال سے اب پریشان نظر آنے لگے تھے۔ ولیم کے برابر والی نشست پر بیٹھی ایک ادھیڑ عمر خاتون اپنی نشست سے اٹھ کر میرے اور ویڈیو گیم کھیلنے والے گول مٹول

سے انگریز بچے کے درمیان والی خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی تھی تا کہ کانوں تک پہنچنے والے براہ راست شور سے وہ کسی حد تک محفوظ ہو سکے۔اس نے مجھے ٹہوکا دیا اور پھر میرے کان میں سر گوشی کی''یہ بیچارا پاگل ہے۔لگتا ہے کہ کسی بڑے صدمے سے دوچار ہوا ہے۔''میں نے کہا ''آپ ٹھیک کہتی ہیں اسی لیے میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ انسان کو اپنے پرچے کی مارکنگ خود نہیں کرنا چاہئے۔'' خاتون نے حیرت سے پوچھا''کیا مطلب؟''میں نے کہا ''مطلب واضح ہے جو انسان خود مارکنگ کرے گا اس کا حشر مسٹر ولیم جیسا ہی ہوگا۔''نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی ادھیڑ عمر خاتون کو غالباً میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں نے وضاحت کی''اس معصوم سے شاعر نے اپنی شاعری کو سو میں سے سو نمبر ہی دے دیئے تھے مگر اس کے قارئین نے اسے 33 نمبر بھی نہیں دیئے۔اتنے زیادہ فرق کو یہ بھولا بھالا انسان برداشت نہ کر سکا اور ذہنی توازن کھو بیٹھا۔اب اسے یقین ہے کہ اگر اس کے عہد میں اس کی قدر نہیں ہوئی تو آنے والے زمانے میں اس کی قدر ضرور ہوگی حالانکہ زمانے کا پہلا فیصلہ ہی کم و بیش اس کا آخری فیصلہ ہوتا ہے بشرطیکہ یہ فیصلہ عوام وخواص دونوں کی طرف سے بیک وقت سنایا گیا ہو!''

دوبئی سے برمنگھم تک کی سوا سات گھنٹے کی فلائٹ میں''خود تشخیصی سکیم'' کے تحت معرض وجود میں آنے والا یہ عظیم المرتبت شاعر مسلسل اپنی عظمت کے ترانے گاتا رہا۔ میں نے سوچا کاش اس وقت برادرم مرتضیٰ برلاس میرے ساتھ ہوتے اور اسے بتاتے کہ ان کی موجودگی میں اسے اس قسم کا دعویٰ سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے مگر افسوس ہزاروں دوسری خواہشوں کی طرح میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ برمنگھم ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے بعد جب میں اپنا سامان کنوئیر بیلٹ میں سے نکال کر ٹرالی میں رکھ رہا تھا وہی خاتون ایک بار پھر میرے پاس آئی اور ولیم کی طرف اشارہ کر کے کہا''اب تو یہ شخص بالکل نارمل لگ رہا ہے کیا اس کا مقصد صرف ہماری نیندیں اچاٹ کرنا تھا؟''میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا''ہاں ......اور یاد رکھو اس کام پر صرف ولیم مامور نہیں بلکہ دنیا بھر کے حکمران خبطِ عظمت کا شکار ہوتے ہیں اور انہیں اپنے عوام پر بہت غصہ آتا ہے کہ وہ انہیں عالمی مدبر تسلیم کیوں نہیں

کرتے۔ یہ لوگ دن بدن نشیب میں اترتے چلے جاتے ہیں مگر خود کو فراز پر محسوس کرتے ہیں۔ آج میں ایک نشیب سے ملا ہوں اب میری ملاقات ایک سچ مچ کے فراز سے ہوگی۔ کل اس کا یہاں جشن ہے۔ زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہی رہتے ہیں۔" اسے میری بات سمجھ نہ آئی اور اس نے اپنی گہری نیلی آنکھوں سے میری طرف "بٹر بٹر" دیکھنا شروع کر دیا۔

# بھاگتانوالہ ائیرپورٹ

سرگودہا جانے کے لیے میں نے بریفنگ ہال میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی خاتون کو اپنا ٹکٹ تھماتے ہوئے کہا ''سیٹ' سموکنگ ایریا میں دیجیے!'' خاتون نے بورڈنگ کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''میں نے سیٹ کا نمبر نہیں لکھا' جس جہاز میں آپ جارہے ہیں' اس میں توازن برقرار رکھنے کے لیے پی آئی اے کا عملہ مسافروں کو خود ''موقع'' پر بٹھاتا ہے!''

میرے ہاتھ سے بورڈنگ کارڈ گرتے گرتے بچا۔ یا خدا! یہ کون سا جہاز ہے' جس میں توازن برقرار رکھنے کے لئے اتنی احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں؟

اور جب رن وے پر کھڑے دیوہیکل جہازوں کے پاس سے گزرتے ہوئے پی آئی اے کی بس نے ایک جہاز نما چیز کے پاس اتارا تو اسے دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے جہاز کے بچے نکلوائے گئے ہوں۔ یہ جہاز ویگن سے بڑا نہیں تھا اور بھیگی بلی کی مانند یوں سر جھکائے کھڑا تھا جیسے اپنی جسامت پر خود بھی شرمندہ ہو۔ اس مخلوق کے دھان پان ہونے کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں داخل ہونے کے لیے علیحدہ سیڑھی لگانے کی ضرورت ہی نہیں تھی' اس کے دروازے ہی میں چار STEPS والی سیڑھی فٹ تھی' یہ دروازہ کھول کر زمین سے لگا دیا گیا تھا' جسے مسافروں کے اندر داخل ہو جانے کے بعد واپس اوپر اٹھا کر اسی طرح بند ہو جانا تھا!

میں جہاز میں داخل ہوا تو ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ میں ویگن میں ہوں' چودہ چھوٹی چھوٹی سیٹیں اور نیچی چھت' جس سے میرا سر ٹکرا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا بریف

کیس نیچے رکھا اور ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ جہاز کے ''کلیز'' نے جو مرغابنا مسافروں کو ان کی نشست پر بٹھا رہا تھا' مجھے گھور کر دیکھا اور ایک دوسری نشست کی طرف اشارہ کر کے کہا ''آپ یہاں بیٹھ جائیں! میں چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھا اور ''کلیز'' کی بتائی ہوئی نشست پر بیٹھ گیا مگر صورتحال۔

اڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا

''کلیز'' نے مسافروں کو ان کی نشستوں پر بٹھانے کے بعد ایک دفعہ ان کی گنتی کی اور جہاز سے باہر نکل آیا' اس نے دروازہ (جو سیڑھی کا کام دے رہا تھا) اٹھا کر بند کیا' جہاز کی باڈی پر ''چلو'' کہہ کر زور سے ہاتھ مارا اور ہمیں خدا کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا!

اب یہ ''جہاز'' ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ رن وے پر دوڑ رہا تھا' اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر جی چاہا کہ ''ڈرائیور'' سے کہوں ''بھائی ڈرائیور ہولی چلا'' مگر میں نے خود کو سنبھالا اور آیات مقدسہ کے ورد میں مشغول ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ جہاز رن وے پر اسی طرح کچھ دیر دوڑنے کے بعد ہانپتا کانپتا دوبارہ اپنی جگہ آن کھڑا ہو گا مگر میرا یہ واہمہ درست ثابت نہ ہوا کہ کچھ دیر بعد یہ فضا میں تھا!

میں جہاز میں حفاظتی پیٹی باندھنے میں عموماً سستی سے کام لیتا ہوں۔ مگر یہاں میں نے یہ پیٹی اتنی کس کر باندھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ اب میں ذہنی طور پر خوفناک جھٹکوں حتیٰ کہ کسی بڑے حادثے کے لیے بھی تیار ہو چکا تھا۔ سرگودھا کا سفر مجھے ویسے بھی راس نہیں آتا۔ ایک دفعہ ویگن جاتے ہوئے ہماری ویگن سامنے سے آنے والی ایک بس سے جا ٹکرائی۔ دوسری دفعہ کار میں سرگودھے سے واپس آتے ہوئے ایک خوفناک حادثے سے بال بال بچے اور اب تیسرا موقع تھا! اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنے ''سرگودھوی دوستوں'' کو معاف نہیں کرتا۔

اس جہاز کا نام ''ٹوئن ٹوٹر'' تھا جو اس وقت لاہور شہر پر بہت نیچی پرواز کر رہا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ لاہور کو اتنے قریب سے دیکھا اور اتنی محویت سے دیکھا جیسے آخری دفعہ

دیکھ رہا ہوں، مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔

''یہ وہی جہاز ہے!'' میرے برابر میں بیٹھے ہوئے مسافر نے مہمل سا جملہ کہا۔ وہ چہرے سے خالص پنجابی لگ رہا تھا اور پان چباتے ہوئے ویسے ہی لگ رہا تھا جیسے کوئی پنجابی پان چباتے ہوئے لگتا ہے!

''وہی جہاز سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ نہیں جانتے؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''نہیں!''

''یہ جناب اپنی جگہ سے اٹھا اور کافی پرے کھڑے ڈی سی ٹین کے اوپر جا گرا!!'' اس پان خور نے ہنستے ہوئے کہا۔

''واقعی؟'' میں نے سہم کر کہا۔

''ہاں جی...... ڈیڑھ مہینے تک اس کی پروازیں معطل رہی ہیں، یہ تو پی آئی اے والوں کا ''کمال'' ہے کہ انہوں نے اسے اب دوبارہ چلا دیا ہے کسی اور ملک میں ہوتا تو کوڑ کباڑ والوں کے سپرد کر دیا جاتا''۔

میں نے ایک بار پھر آیات مقدسہ کا ورد شروع کر دیا

''آپ کو ایک اور بات بتاؤں!''

''کیا کوئی بہت ضروری بات ہے؟''

''ہاں جی!''

''چلیں پھر بتائیں!'' میں نے اپنی سانس روک کر کہا۔

''جس کمپنی نے یہ جہاز بنایا تھا نا!''

ہاں''

''وہ کمپنی کب کی بند ہو چکی ہے' وہ یہ بزنس ہی چھوڑ گئی ہے!''

میرا جی چاہا کہ میں اس مسافر کے پاس سے اٹھ جاؤں اور کسی دوسری نشست پر جا بیٹھوں' مگر پھر جہاز کے توازن بگڑنے کے خیال سے اپنی نشست پر دبکا رہا! اور پھر میرے ساتھ میرا بریف کیس بھی تھا جسے اٹھانے سے بھی توازن بگڑ سکتا تھا۔

''اور کوئی بات؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ میری بات سن کر ہنسا اور اُس نے کہا ''جہاز کے باہر آپ نے پی آئی اے لکھا ہوا دیکھا تھا؟''

''ہاں دیکھا تھا' مگر وہ تو سارے جہازوں پر لکھا ہوتا ہے اور اس کا مطلب پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز ہے!''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں'' مسافر نے کہا ''مگر اس جہاز پر جو پی آئی اے لکھا ہے' اس کا مطلب ''پلیز انفارم اللہ'' ہے!''

اور اس کے ساتھ ہی اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پیشتر اس کے کہ اس پر میں اسے اس بے موقع ہنسی پر ٹوکتا' جہاز ایک جھٹکے کے ساتھ سینکڑوں فٹ نیچے چلا گیا!

''یا اللہ خیر!'' میں نے بے ساختگی سے کہا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں' انشاءاللہ کچھ نہیں ہوگا!'' مسافر نے کہا ''ایسے چھوٹے موٹے جھٹکے تو لگتے ہی رہتے ہیں' مگر آج تک اس جہاز کو کوئی بڑا حادثہ پیش نہیں آیا! اس کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست رابطہ ہے''۔

تھوڑی دیر بعد پرواز ہموار ہوگئی اور میں نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

''مجھے یہ جہاز بہت عزیز ہے'' مسافر نے کہا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے اس بے تکے مسافر سے پوچھا۔

''ایک تو یہ چھوٹا سا ہے' چند مسافر ہیں' یوں لگتا ہے ایک خاندان کے افراد اپنے

گھر کے لاؤنج میں بیٹھے ہیں''۔ یہ کہہ کر اُس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کہا ''دوسرے اس میں ایئر ہوسٹس بھی نہیں ہے۔ آپ نے پی آئی اے کی ہوسٹسز دیکھی ہیں نا!''

اس دفعہ میں بھی اس کی ہنسی میں شریک تھا۔

''اس جہاز کو پسند کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے'' اب کے وہ سنجیدہ تھا ''اس کی پرواز دوسرے جہازوں کی نسبت بہت نیچی ہے۔ آپ نے دیکھا لاہور پر سے گزرتے ہوئے سارے منظر کتنے صاف تھے۔ گھروں کی چمنیوں سے نکلنے والا دھواں بھی نظر آ رہا تھا۔ بادشاہی مسجد کے صحن میں لوگ چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے' مینار پاکستان اپنی پوری سربلندی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ دریائے راوی کے پل پر چلتی ہوئی کاریں ڈنکیوں کی بجائے کاریں ہی دکھائی دے رہی تھیں' یہ وہ جہاز ہے جو فضا میں پرواز کرتے ہوئے بھی زمین سے اپنا رشتہ برقرار رکھتا ہے!''

یہ شخص اچھی باتیں کر رہا تھا' سو اب مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ ''اور اب دیکھیں' سرگودہا آنے والا ہے' ایئر پورٹ شہر سے ۲۵ کلومیٹر دور چک بیس میں ہے جو ایک قصبے بھاگٹانوالہ کے قریب واقع ہے' چنانچہ ایئر پورٹ کا نام اسی قصبے پر ہے۔ آپ کھڑکی سے باہر دیکھیں' کس قدر خوبصورت نظارہ ہے!''

اور باہر منظر واقعی بہت خوبصورت تھا' جہاز گھنے باغات اور کھیتوں پر سے گزرتا ہوا لینڈ کرنے کے لیے نیچے کی طرف آ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں بہت دیر تک یہ منظر دیکھتا رہوں' چنانچہ میں نے اپنی نظریں اس وقت تک زمین کے خوبصورت نظاروں پر جما کر رکھیں جب تک جہاز لینڈ نہ کر گیا۔

جہاز کھیتوں سے چند گز کے فاصلے پر پکی اینٹوں کے فرش پر کھڑا تھا دروازے کو کھول کر دوبارہ سیڑھی بنا دیا گیا۔ ہم ایک چک میں کھڑے تھے جہاں ایئر پورٹ کی چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس پر ''بھاگٹانوالہ ایئر پورٹ'' لکھا تھا۔ بالکل سامنے لوہے کا ایک جنگلہ تھا اور جنگلے کے پار ایک سنسان سڑک نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف دو کاریں کھڑی تھیں

جن میں سے ایک میری منتظر تھی، جس نے مجھے پھلروان لے جانا تھا!

"آپ سے مل کر مجھے حقیقتاً بہت خوشی ہوئی" میں نے اپنے ہم سفر سے رخصت ہونے کے لیے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اگر آپ نہ ہوتے تو میرا سارا سفر سہمے ہوئے گزرتا کیونکہ جہاز کی حالت بہت ڈرا دینے والی تھی"۔

"ڈرا دینے والی حالت تو ہمارے ملک کی بھی ہے" مسافر نے الوداع ہوتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ "اسی جہاز کی طرح چھوٹا سا خدشات سے بھرا ہوا اور محدود وسائل کا حامل ملک! مگر آپ اس کے مستقبل سے مایوس نہ ہوں بس حفاظتی اقدامات ملحوظ رکھیں اور ہاں یہ واحد پرواز ہے جس کا رشتہ آسمان اور زمین دونوں سے برقرار ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو!"

# نارِ جہنم

''شیخ صاحب بول رہے ہیں؟''

''جی جی!''

''میں ملک بشیر بول رہا ہوں!''

''جی ملک صاحب کیسے حال ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے جی۔ وہ دراصل میں نے فون اس لیے کیا تھا کہ آپ کی طرف کچھ پیسے نکلتے ہیں، بہت ضرورت آن پڑی ہے!''۔

''میں تو چند دنوں تک مرنے والا ہوں۔ ملک صاحب''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شیخ صاحب، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے''۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں، میرا دل کہتا ہے کہ دو ہفتوں کے اندر اندر انتقال کر جاؤں گا!''۔

''آپ کو ایسی بات نہیں کرنا چاہیے شیخ صاحب! آپ سے محبت کرنے والوں کو اس سے تکلیف ہوتی ہے!''

''آپ کی اس بات سے میری بہت ڈھارس بندھی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، آپ سنائیں آپ کے کاروبار کا کیا حال ہے!''۔

''اللہ کا شکر ہے کام چل رہا ہے۔ آپ کا کاربار کیسا جا رہا ہے''۔

''بہت اچھا جا رہا ہے۔ان دنوں سیزن بھی ہے!''۔

''ہاں میں نے یہی سوچ کر فون کیا تھا' اگر ہو سکے تو آج کچھ ادائیگی فرما دیں!''۔

''ایسی کون سی بات ہے؟ آپ خدانخواستہ بیمار و بیمار تو نہیں ہیں؟''۔

''نہیں بیماری تو کوئی نہیں' لیکن میرا دل کہتا ہے کہ......''۔

''کیا منہ سے برے بُرے کلمے نکالتے ہیں آپ! آپ یہ بتائیں بچوں کا کیا حال ہے؟''

''بچے بالکل ٹھیک ہیں۔میں نے پچھلے ہفتے انہیں ایک ایک پلاٹ خرید کر دیا ہے کہ ان پر اپنی اپنی کوٹھیاں خود بنوالیں!''

''ماشاءاللہ۔بہت بہت مبارک ہو!''

''خیر مبارک''

''آپ کی کار کیسی جا رہی ہے؟''

''کون سی کار''

''ہاں یہ تو میں بھول ہی گیا۔میرا مطلب ہے کہ کاریں کیسی چل رہی ہیں؟''

''میں نے کل ایک نئی مرسڈیز کا آرڈر دیا ہے۔آپ کسی دن بچوں کو لے کر آئیں نا!''۔

''بس انشاءاللہ کسی دن حاضر ہوں گا۔اس وقت تو میں نے ضرورت کے تحت فون کیا تھا۔اگر ہو سکے تو کچھ پیسوں کا انتظام کر دیں!''

''میں نے تو چند دنوں تک مر جانا ہے۔اب اس دنیا میں جی نہیں لگتا' کچھ نہیں رکھا اس دنیا میں! کوئی شخص میرا حال نہیں پوچھتا' سب کو اپنے اپنے پیسوں کی فکر ہے!''

''خدا کے لیے شیخ صاحب' خدا کے لیے......!''

''میں صحیح کہہ رہا ہوں ملک صاحب' میں تو ان لوگوں کی وجہ سے دفتر بھی بہت کم آتا ہوں میں نے سب کام بیٹوں کے سپرد کر دیئے ہیں' اب تو کاروبار بھی وہی چلا رہے ہیں!''

''خیر یہ تو اچھی بات ہے کہ بیٹے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں' لیکن آپ کو مایوسی کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں''۔

''بڑی مہربانی ملک صاحب! آپ کی باتوں نے مجھے بہت حوصلہ دیا ہے۔ میں ان دنوں سوچ رہا ہوں کہ دل بہلانے کے لئے یورپ کی سیاحت کو نکل جاؤں!''

''بہت اچھا خیال ہے اگر ہو سکے تو اس دفعہ ایک چکر امریکہ کا بھی لگا لیں''۔

''کیا رکھا ہے جی! اس قوم کا کوئی کلچر ہی نہیں' سب دولت ہی دولت ہے۔ اب دیکھیں نا دنیا میں صرف پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے!''

''وہ تو ٹھیک ہے شیخ صاحب' مگر اس میل کی بھی کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے' میں نے آج اسی لیے فون کیا تھا!''۔

''میں نے چند دنوں تک مر جانا ہے۔ اب تو اس دنیا میں جینے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے تو وصیت کے کاغذات بھی تیار کروا لیے ہیں!''۔

''اللہ نہ کرے شیخ صاحب کہ آپ فوت ہوں......!''

''جی جی جی!''

''مگر دیکھیں نا! لین دین تو ساتھ ساتھ چلتا ہی ہے''۔

''بالکل بالکل' مگر میں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ بیٹھا ہوں' بس چند دنوں کی بات ہے......!''

''یعنی کتنے دنوں تک آپ ادائیگی کر دیں گے؟''۔

''میں ادائیگی کی بات نہیں کر رہا ملک صاحب! چند دنوں تک تو میں نے مر جانا

ہے۔ مجھے کہاں ہوش ہے کہ میں نے کس سے کیا لینا ہے' کس کا کیا دینا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ملک صاحب!''۔

''آپ بجا فرماتے ہیں شیخ صاحب' لیکن جو دینا ہے' وہ تو دینا ہی ہے!''۔

''مگر میں نے چند دنوں تک مر جانا ہے''۔

''پکی بات ہے''۔

''کون سی بات؟''۔

''یہی کہ آپ نے چند دنوں تک فوت ہو جانا ہے!''۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ملک صاحب! اظہار ہمدردی کی بجائے دوسروں کی طرح آپ بھی میری موت کی دعائیں مانگنے لگے!''۔

''میں ایسی دعا کیسے مانگ سکتا ہوں شیخ صاحب! میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ موت کے سلسلے میں آپ کا احساس واقعی بہت قوی ہے؟''۔

''جی ہاں آپ یقین کریں مجھے یہی لگتا ہے کہ بس دو چار دنوں تک مر جاؤں گا!''۔

''میں تو بس یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ جہاں میں نے پیسوں کا اتنا عرصہ انتظار کیا تھا' عام حالات میں دو چار مہینے اور انتظار کر لیتا' لیکن اگر آپ کا دو چار دنوں میں فوت ہونا یقینی ہے تو میں ابھی آپ کی طرف پہنچ رہا ہوں تا کہ ایک تو آپ کا آخری دیدار ہو جائے اور رقم ڈوبنے سے بچ جائے' یوں بھی میں چاہتا ہوں کہ میرا دوست خدا کے سامنے سرخرو ہو کر جائے' دوسرں کی دولت' دولت نہیں' جہنم ہے' میری خواہش ہے کہ آپ نار جہنم ساتھ لے کر نہ جائیں۔ براہ کرم میرے آنے تک فوت نہ ہوں کچھ دیر انتظار فرمائیں' میں حاضر ہو رہا ہوں۔خدا حافظ!''۔

❖❖❖

# ایک ہوائی کالم

دوسروں کے گھروں میں جھانکنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن ہمارے دوسرے اعمال کون سے اتنے اچھے ہیں کہ اس برائی سے احتراز کرنے سے ہمارا اشمار فرشتوں میں ہونے لگے گا چنانچہ ہم زمین پر چلتے ہوئے ''اندر'' ہوجانے کے خوف سے ممکن ہے تانکا جھانکی سے پرہیز کرتے ہوں مگر جب ہمارے پاؤں زمین پرنہیں ہوتے یعنی جس وقت ہم فضاؤں میں پرواز کررہے ہوتے ہیں تو ہزاروں فٹ بلندی سے ان گھروں میں ضرور جھانکتے ہیں جہاں عام حالات میں جھانکنے کا ہمیں حوصلہ نہیں پڑتا یوں بھی جہاز پر سے بڑے بڑے ایوان بھی چھوٹے چھوٹے نقطوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جو عام حالات میں بھی چھوٹے چھوٹے نقطے ہیں، وہ جہاز پر سے اور بھی حقیر نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ رہا سہا خوف بھی دل سے نکل جاتا ہے گزشتہ ہفتے لاہور سے اسلام آباد تک کے فضائی سفر میں ہم نے حسب معمول اس تانکا جھانکی کا مظاہرہ کیا یعنی ہزاروں گھروں پر سے گزرتے ہوئے ہم نے چشم تصور میں ان گھروں میں جو ہوتے دیکھا اور جو سنا اس کی چند جھلکیاں آپ کو بھی دکھاتے ہیں تو لیجئے ملاحظہ فرمائیں۔

## ایک صاحب اقتدار کا گھر

ایک محل نما عالیشان کوٹھی۔ پورچ میں نئے ماڈل کی تین چار کاریں کھڑی ہیں گھر کے ڈرائنگ روم میں باپ اور بیٹا محوِ گفتگو ہیں۔

بیٹا۔ ابو الیکشن تو آپ نے جیت لیا وزارت بھی آپ کو مل گئی مگر آپ کے ہاتھ کیا آیا؟

باپ۔ کیا مطلب میں سمجھا نہیں!

بیٹا۔ الیکشن پر آپ کے کوئی تیس لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں تیس لاکھ روپے پاس ہوں تو حکومت سے لون لے کر کوئی ایک کروڑ روپے کی انڈسٹری لگائی جا سکتی ہے۔

باپ۔ میں نے تمہیں کئی دفعہ کہا ہے کہ اتنی مادہ پرستی ٹھیک نہیں بیٹے جانی دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی!

بیٹا۔ مجھے آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ابو

باپ۔ دیکھو بیٹا میرا نصب العین عوام کی خدمت ہے جب کئی برس قبل میں الیکشن میں کھڑا ہوتا تھا تو میرے پاس کیا تھا لوگوں نے چندہ اکٹھا کر کے میرا زرضمانت جمع کرایا تھا اللہ کے فضل سے میں کامیاب ہوا اب یہ جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے عوام کی دیرینہ خدمت ہی کا صلہ ہے ورنہ میرے پاس تو تمھارے سکول کی فیس ادا کرنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔

بیٹا۔ وہ تو سب ٹھیک ہے ابو' مگر اس دفعہ عوام کی خدمت کا کچھ صلہ ملتا نظر نہیں آتا۔

باپ۔ نہیں بیٹے' اگر ایسا ہوتا تو میری طرح کے سینکڑوں لوگ عوام کی خدمت کے لیے بے چین نہ ہوتے میری طرح ان سب کو اپنے عوام پر مکمل اعتماد ہے۔

بیٹا۔ لیکن اگر ایم آر ڈی والوں نے کوئی کامیاب تحریک چلا کر حکومت کا تختہ الٹ دیا تو؟

باپ۔ تو بیٹے پھر کیا ہوا' ایم آر ڈی والے کوئی غیر تو نہیں ہیں وہ بھی ہمیں میں سے ہیں۔ میں نے اور تمھارے تایا ابو نے الیکشن لڑنے سے پہلے پرچیاں ڈالی تھیں کہ کون الیکشن لڑے گا اور کون الیکشن کی مخالفت کرے گا میرا نام پرچی میں نکل آیا چنانچہ میں حکومت میں ہوں تمھارے تایا ابو ایم آر ڈی میں ہیں۔

بیٹا۔ مجھے تو آپ کی باتیں سمجھ نہیں آتیں ابو۔

باپ۔ سمجھ جاؤ گے بیٹے' سمجھ جاؤ گے' یہ باتیں خود مجھے بھی بہت دیر بعد سمجھ میں آئی تھیں۔

## ایک اپوزیشن لیڈر کا گھر

لیڈر اپنے حویلی نما محل میں بیٹھا ہے اردگرد کئی خستہ حال کارکن بیٹھے نظر آرہے ہیں۔

کارکن۔ یہ جو حفیظ پیرزادہ' عطا اللہ مینگل اور ممتاز بھٹو وغیرہ کھلے لفظوں میں کنفیڈریشن کی باتیں کررہے ہیں تو کیا ہم سمجھیں کہ یہ پارٹی لائن ہے۔

لیڈر۔ آج گرمی کچھ زیادہ ہے اوئے لڑکے' یہ دوسرا ائرکنڈیشنر بھی آن کردو۔

کارکن۔ ایم آرڈی کو چاہیے کہ وہ ملک دشمنی کی باتیں کرنے والے نام نہاد لیڈروں کے خلاف سخت ایکشن لیں ہمیں پارٹی سے محبت اس لیے ہے کہ ہمیں پاکستان سے محبت ہے ہم یہاں مکمل جمہوریت لانا چاہتے ہیں ملک توڑنا نہیں چاہتے۔

لیڈر۔ اس دفعہ خربوزے بہت میٹھے آرہے ہیں اوئے لڑکے جاؤ فریج سے خربوزے نکال کرلاؤ۔

کارکن۔ آپ ہماری باتوں پر دھیان نہیں دے رہے اگر آپ ہماری باتیں نہیں سننا چاہتے تو ہم اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

لیڈر۔ نہیں نہیں' یہ تم کیا کہہ رہے ہو میں تمھاری باتیں بڑے غور سے سن رہا ہوں مگر تم ساتھ ساتھ یہ خربوزے بھی تو کھاؤ بہت میٹھے ہیں۔

کارکن۔ لیکن ہماری بات کا جواب آپ نے پھر بھی نہیں دیا۔

لیڈر۔ بھئی تم لوگ ٹھیک کہتے ہو مگر وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ تمھاری باتوں میں بھی خلوص ہے ان کی باتوں میں بھی خلوص ہے تم بھی محب الوطن ہو وہ بھی محب الوطن ہیں۔

کارکن ۔ جناب! یہ آپ ہمارے سوالوں کا جواب دے رہے ہیں یا سیاسی

تجزیئے کے نام پر لکھے جانے والے بعض کالموں والا کام کر رہے ہیں۔

لیڈر۔ بھئی تم بھی ٹھیک کہتے ہو اور جن کا تم حوالہ دے رہے ہو وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں تمھاری باتیں بحث طلب ہیں ان پر گفتگو کے لیے خاصا وقت درکار ہے میں ذرا ایک اہم میٹنگ میں جا رہا ہوں تم بیٹھو اوئے لڑکے فریج میں سے اور خربوزے نکال کر لاؤ۔

## ایک صنعت کار کا گھر

صنعت کار۔ بیٹے میری طرف سے تمام کارکنوں کو گرمیوں کے دو دو جوڑے بطور تحفہ دینے کا اعلان کر دو!

بیٹا۔ ابو اعلان کیا وہ جوڑے تو انہیں دیئے بھی جا چکے ہیں آپ تو بہت جلدی بھول جاتے ہیں۔

صنعت کار۔ بچارے اللہ بخش کا ہاتھ مشین میں آ کر کٹ گیا تھا میں نے کہا تھا کہ تمام عمر کے لیے اسے پوری تنخواہ دینے کے آرڈر کیے جائیں اس کا کیا بنا؟

بیٹا۔ یہ ہو گیا تھا اور وہ آپ کو بہت دعائیں دیتا ہے۔

صنعت کار۔ اور ہاں دیکھو نذیر کی بیوہ کے لئے تاعمر وظیفہ جاری کر دو اللہ جنت بخشے وہ بھی بہت محنتی کارکن تھا۔

بیٹا۔ ٹھیک ہے ابو۔

صنعت کار۔ اور مجھے یاد دلانا محمد دین کو اس کی بیٹی کے جہیز کے لیے پانچ ہزار روپے کا چیک دینا ہے۔

بیٹا۔ بہت اچھا ابو مگر وہ بچارا فضلو چھ ماہ سے ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔

صنعت کار۔ اسے اس کی تنخواہ تو مل رہی ہے نا؟

بیٹا۔ جی ابو مگر بچارا غریب آدمی ہے ہسپتال کا خرچ اس کی استطاعت سے بہت زیادہ ہے۔

صنعت کار۔کوئی بات نہیں اسے کہو ہسپتال کے سارے بل ہم ادا کریں گے۔

بیٹا۔ابو آپ کتنے اچھے ہیں لیکن میں ایک بات کہوں۔

صنعت کار۔کہو بیٹے کہو۔

بیٹا۔آپ اس قدر صدقہ زکوٰۃ اور خیرات دیتے ہیں لیکن ان مدوں سے جتنی مراعات آپ اپنے مزدوروں کو دے رہے ہیں اگر اس سے آدھی مراعات بھی آپ ان کی شرائط ملازمت میں شامل کر دیں تو اس سے ان کی انا مجروح ہونے سے بچ جائے۔

صنعت کار۔وہ تو ٹھیک ہے بیٹے مگر پھر ہمیں "مخیر" کون کہے گا؟

## ایک کالم نگار کا گھر

کالم نگار۔ بیٹے میں یہ کالم چھپنے کے لئے بھیج رہا ہوں ذرا ایک نظر دیکھ لو۔

بیٹا۔دیکھ لیا ہے۔ابو!

کالم نگار۔حکومت تو ناراض نہیں ہوگی؟

بیٹا۔وہ تو ہوگی۔

کالم نگار۔اپوزیشن والے؟

بیٹا۔وہ بھی ناراض ہوں گے۔

کالم نگار۔اور صنعت کار؟

بیٹا۔ابو وہ بھی ناراض ہوں گے۔

کالم نگار۔کوئی بات نہیں تم یہ دفتر بھجوا دو یہ میرا کوئی آخری کالم تو نہیں ہے' آئندہ ہفتوں میں ایک ایک کالم ان کی حمایت میں لکھ دوں گا اس قسم کا ایک کالم برسوں کی خوشامد پر پردہ ڈالنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

———❖❖❖———

# مَولوی صاحب

گزشتہ روز ہم نے ایک مولانا کو سرِراہے روکا اور انہیں بصد اصرار ایک قہوہ خانے میں لے گئے ۔ مولانا سے ہمارے دیرینہ عقیدت مندانہ تعلقات ہیں۔ ہم نے چائے کا آرڈر دیا اور چائے آنے پر ایک کپ مولانا اور ایک کپ اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا ’’حضرت! بہت دنوں سے جی چاہتا تھا کہ آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا جائے‘ مگر مکروہاتِ دنیا سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج چند لمحے آپ کی صحبت میں میسر آئے‘‘۔ مولانا نے فرمایا۔ ’’من آنم کہ من دانم‘ آپ کیوں اس گنہگار کو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں‘‘۔ ہم نے کہا ’’حضرت! آپ کا انکسار آپ کی عظمت کی دلیل ہے۔ بہرحال ممنون ہوں کہ آپ نے چند لمحے اپنے قیمتی وقت میں سے اس ہیچمدان کو بھی عطا فرمائے۔

مولانا نے فرمایا ’’اللہ تعالیٰ آپ کو حسن نیت کا اجر عطا فرمائے‘ مگر ایسی کونسی بات تھی کہ آپ نے اس ننگ اسلاف کو یاد کیا!‘‘ ہم نے عرض کیا! یا حضرت‘ آپ خود کو ننگ اسلاف نہ کہیں ورنہ کچھ ناسمجھ لوگ وفور عقیدت میں آپ کے اس کہے کو بھی سچ تصور کر بیٹھیں گے‘ ویسے نئے دور کے بعض نئے مسائل کے بارے میں آپ سے رہنمائی حاصل کرنا تھی‘ اس لیے آپ کو زحمت دی‘‘ فرمانے لگے ’’آپ کن مسائل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں‘‘۔ عرض کیا ’’کفار نے کچھ ایسی ایجادات کی ہیں کہ جن سے بہت پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں‘ مثلاً اس ایک کیمرے کی وجہ سے گھر گھر میں بت خانے کھل گئے ہیں‘ کوئی اخبار ایسا نہیں‘ جس میں مردوں اور عورتوں کی تصویریں شائع نہ ہوتی ہوں‘‘۔

حضرت نے فرمایا ''زندہ چیزوں کی تصویر بنانا حرام ہے لہٰذا جملہ مومنین کو چاہیے کہ وہ اس سے اجتناب کریں۔ علما کا سوادِ اعظم تصویر کشی کو متفقہ طور پر خلافِ شرع سمجھتا ہے'' ہم نے کہا ''یا حضرت! نامور علما میں سے شاید ہی کوئی عالم ایسا ہو جس کی تصویر اخبار میں شائع نہ ہوتی ہو'' حضرت نے فرمایا ''یہ تصویریں ان کی بے خبری میں کھینچی گئی ہوں گی!'' ہم نے عرض کیا' نہیں حضرت! انہوں نے یہ تصویریں باقاعدہ پوز بنا کر کھنچوائی ہیں' بلکہ بعض سیاسی جماعتوں سے وابستہ جید علما تو اخبار والوں سے خفا ہو جاتے ہیں' اگر ان کے بیان کے ساتھ ان کی تصویر شائع نہ کی جائے! اس پر حضرت نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا ''یہ ان کے ایمان کی کمزوری ہے!''

پھر ہم نے عرض کیا ''قبلہ گاہی! دورِ حاضر کی ایک ایجاد ریڈیو بھی ہے' جس کی وجہ سے گھر گھر میں ''استاد جی'' پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے مخربِ اخلاق گانے نشر ہوتے ہیں' طبلہ سارنگی کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور پائل کی چھم چھم سنائی دیتی ہے۔'' مولانا نے فرمایا ''یہ سب کچھ خلافِ شرع ہے چنانچہ گھروں میں ریڈیو رکھنے سے اجتناب کرنا چاہیے!'' عرض کیا ''مگر حضور' یہ ریڈیو رکھنا بھی پڑتا ہے کیونکہ یہاں سے علما کی دلپذیر تقریریں نشر ہوتی ہیں۔ بولے ''بس وہ تقریریں سن لیا کریں عرض کیا' مگر یہ تقریریں ٹھمریوں اور گانوں کے درمیان پھنسی ہوتی ہیں اور اتنی اعلیٰ پائے کی دینی نوعیت کی تقریریں سننے کے لیے یہ اناؤنسمنٹ بھی سننا پڑتی ہے کہ ابھی آپ نے استاد ماٹھے خاں سے راگ ملہار سنا' اب مولانا سرکار علی سے اخلاقِ حسنہ پر تقریر سماعت فرمائیں' بلکہ بعض اوقات تو اناؤنسر کی مخبوط الحواسی سے اناؤنسمنٹ الٹ پلٹ بھی ہو جاتی ہے''۔ اس پر حضرت نے ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا'' ''ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ ایسی دکان سے آبِ زم زم نہ خریدیں جہاں شراب بھی فروخت ہوتی ہو!'' عرض کیا ''پھر گھر میں ریڈیو رکھنے کے بارے میں آپ کا حتمی ارشاد کیا ہے'' فرمایا گھر میں ریڈیو اور ریڈیو میں علما نہیں ہونے چاہئیں جو لوگ ایسا کرتے ہیں' وہ ایمان کی کمزوری کا ثبوت دیتے ہیں!''

ہم نے کہا ''مولانا ایک الجھن اور بھی ہے'' فرمایا ''وہ کیا'' عرض کیا ''ٹیلی ویژن

معاشرے میں بہت فساد پیدا کر رہا ہے اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟'' فرمانے لگے'' یہ بھی تصویر کشی کے زمرے میں آتا ہے' اس کا دیکھنا حرام ہے!'' عرض کیا'' یا حضرت اس میں ایک قباحت اور بھی ہے۔ فرمایا'' وہ کیا؟'' عرض کیا'' جو خواتین و حضرات اس کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں' انہیں سکرین پر آنے سے پہلے میک اپ مین سے باقاعدہ میک اپ کروانا پڑتا ہے' حتی کہ مردوں کو بھی سرخی پاؤڈر لگایا جاتا ہے!'' فرمایا'' مردوں کے لیے تو خصوصاً بہت نازیبا بات ہے''۔ ہم نے کہا'' حضرت ! ریکارڈنگ سے پہلے میک اپ روم میں ان علماء کا میک اپ بھی کیا جاتا ہے' جو دینی پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں چنانچہ ایک کرسی پر ڈرامے کی کوئی اداکارہ بیٹھی میک اپ کروا رہی ہوتی ہے اور اس کی برابر والی کرسی پر کسی عالم دین کا میک اپ ہو رہا ہوتا ہے! فرمایا'' یہ ایمان کی کمزوری ہے''۔

عرض کیا'' یا حضرت ! فلموں میں بہت عریاں مناظر ہوتے ہیں تشدد دکھایا جاتا ہے' نئی نسل کو بے راہ روی کی طرف مائل کیا جاتا ہے!'' فرمانے لگے'' اس میں کیا شبہ ہے ہماری بیشتر معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کی جڑ سینما ہے''۔ ہم نے کہا'' سنسر بورڈ کے چیئرمین ڈاکٹر صفدر محمود اپنے طور پر فلموں میں ان برائیوں کی جڑ کاٹنے میں مشغول ہیں''۔ فرمایا'' اس سے کیا ہوتا ہے' کنوئیں سے سو بوکے پانی بھی نکالا جائے' لیکن اگر کتا کنوئیں ہی میں رہے تو کنواں پاک نہیں ہوتا۔ جو چیز شرعی طور پر حرام ہے' وہ حرام ہی رہے گی!'' عرض کیا'' مولانا ! سنسر بورڈ میں علما بھی ہوتے ہیں' چنانچہ اگر فلم میں کوئی عریاں سین ہو تو اسے بار بار چلا کر دیکھا جاتا ہے تا کہ فلم میں اس کا نام ونشان تک نہ رہنے دیا جائے!'' فرمایا'' یہ بھی ایمان کی کمزوری ہے!''

ہم نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا'' مولانا آپ کو چائے کیسی لگی؟'' فرمایا'' بہت عمدہ چائے ہے'' ہم نے پوچھا'' ریستوران کیسا ہے؟'' فرمانے لگے'' بہت صاف ستھرا ہے' آج آپ کے طفیل یہ ریستوران دیکھنے کا موقع ملا' آئندہ یہیں آیا کروں گا!'' ہم نے کہا'' حضرت ایک بات آخر میں اور عرض کرنا چاہتا ہوں!'' فرمانے لگے'' کہیئے کہیئے!'' عرض

کیا"میں نے علما سے سنا ہے کہ بازاروں میں کھانا پینا شرعی طور پر ایک ناپسندیدہ فعل ہے' بلکہ بازاروں میں کھانے پینے والوں کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔اس حوالے سے صرف ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں" گھبرا کر فرمایا"کہو کہو" عرض کیا"مختلف مسائل کے حوالے سے جو آپ نے ابھی ابھی آراء دی ہیں' متذکرہ اصول کی روشنی میں' میں آپ کی ان گواہیوں کو معتبر نہیں سمجھتا لہٰذا جو امور میں آپ کے ساتھ زیر بحث لایا ہوں' وہ میں کسی جید اور باعمل عالم سے ڈسکس کروں گا! خدا حافظ

❖❖❖

# غمگین سلیمانی کا خط

پیارے عطا!

ان دنوں شہر میں شادیاں بہت ہو رہی ہیں۔اس لیے تمھارے خط کا جواب جلدی نہ دے سکا۔شہر میں جس طرف نکل جائیں قناتوں اور سائبانوں سے رستہ بند ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔پھر ان دنوں کوئی بارات بینڈ باجے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور یوں شور و شغب سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔اوپر سے دولہا نے چہرے کو سہرے سے چھپایا ہوتا ہے جس سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے کس قدر احمقانہ رسم ہے خدا جانے ہم لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ میں تو ہر وقت اس خیال سے پریشان رہتا ہوں کہ ہم لوگ ہر وقت خوشیوں کے پیچھے کیوں دوڑتے رہتے ہیں۔حالانکہ ہم سب نے ایک روز مرنا ہے۔ چنانچہ اس دنیا کے چند روز ہم اگر ہنسی خوشی بسر بھی کرلیں تو کیا فائدہ۔بالآخر مرنا تو ہے کل میرے بچے کی سالگرہ تھی۔ بہت سارے لوگ گھر میں جمع تھے۔ کیک کاٹا گیا۔پھر تالیاں بجائی گئیں میری بیوی جو ایک بیوقوف سی عورت ہے سب سے زیادہ خوش نظر آ رہی تھی اور فرط مسرت سے بیٹے کو بار بار چوم رہی تھی۔ میں یہ سب خاموشی سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہم لوگ کدھر جا رہے ہیں۔آخر ہمیں موت کیوں یاد نہیں۔ یہ خوشیاں دائمی نہیں ہیں' کیا فائدہ ان چیزوں کا کہ بالآخر ہم سب نے تنگ و تاریک قبر میں لیٹنا ہے۔مگر ہم لوگ یہ سب کب سوچتے ہیں' یہاں میرے دفتر میں جتنے لوگ ہیں' سب بے فکر ہیں' لنڈے کے کپڑے پہنتے ہیں' بسوں میں دھکے کھاتے ہیں' غلیظ اور تنگ گھروں میں رہتے ہیں غربت' افلاس اور بیماری نے ان کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔مگر دفتر میں آتے ہیں تو

سب کچھ بھول کر قہقہے لگانے میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے تو ان لوگوں کو دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے انہیں چاہیے کہ اکٹھے بیٹھیں تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ بلکہ صرف دکھ پھرولیں اگر ان کے دل غموں سے بھرے ہوئے ہیں تو ان کے چہروں پر بھی دکھ کی پرچھائیاں ہونی چاہئیں مگر یہ سب لوگ جھوٹے قہقہے لگا کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جوانمردی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بھلا یہ کہاں کی جوانمردی ہے اور اگر جوانمردی ہے بھی تو اس جوانمردی کا کیا فائدہ کہ ایک روز بالآخر سب کو مر جانا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں یہ زندگی اسی طرح گزارنی چاہیے جس طرح قبر میں لیٹ کر گزارنی ہے تاکہ ہم اس زندگی کے عادی ہو سکیں جو اس چندروزہ زندگی سے کہیں زیادہ طویل ہے چند روز پیشتر میں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنے بچے کی بے معنی سی حرکتیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا حالانکہ اس میں خوش ہونے والی کوئی بات نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خوش ہونا کون سی کوئی ایسی بات ہے کہ خوامخواہ خوش ہوا جائے میں تو روزانہ صبح اٹھتے ہی زندگی اور موت کے مسئلے پر سوچنا شروع کرتا ہوں' ناشتے کی میز پر بھی دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا ہوں اور رات کو سونے سے پہلے ایک دفعہ پھر موت کا منظر یاد کرتا ہوں۔ میں نے ان دنوں میں خواجہ اسلام کی معرکتہ الآرا کتاب ''موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہوگا'' بھی پڑھی میرے خیال میں یہ کتاب پہلی جماعت سے بچوں کو پڑھانی چاہیے سبحان اللہ کیا عمدہ کتاب ہے' جب سے پڑھی ہے زندگی کی جو تھوڑی بہت رمق میرے اندر موجود تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

تمہیں لٹریچر سے بہت دلچسپی ہے۔ جبکہ تم جانتے ہو مجھے لٹریچر سے کبھی شغف نہیں رہا لیکن گزشتہ دنوں میں نے اردو کے کلاسیکی شعرا کا ایک انتخاب دیکھا تو اردو ادب سے مجھے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی' موت پر ان شاعروں نے کیا کیا شعر کہا ہے' خواجہ اسلام کی کتاب اور اردو کے ان شعرا نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ثبت کیا ہے' چنانچہ اب زندہ

رہنے کی کوئی خواہش نہیں رہی۔دو تین شعر تم بھی سنو۔

کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر
کہتے ہیں سب یہ قبر کسی نوجواں کی ہے
سنگ پھینکے ہیں میری قبر پہ گل کے بدلے
گالیاں دے ہے پس مرگ بھی قُل کے بدلے
پڑھی نمازِ جنازہ ہماری غیروں نے
مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے

میں جانتا ہوں تمہیں میرا خط اچھا نہیں لگے گا کیونکہ تمہیں زندگی عزیز ہے۔مگر میرے عزیز ہم سب کو ایک روز مرنا ہے۔لہٰذا اس زندگی کا ایک ایک لمحہ موت کو یاد کرتے ہوئے گزارنا چاہیے۔

تمھارا دوست !غمگین سلیمانی

## خوش باش عیش پوری کا خط

ہیلو عطا!

یار آج اخبار میں پڑھا کہ کشمیری حریت پسند مقبول بٹ کو بھارتی حکومت نے پھانسی دے دی ہے۔بھئی اس پر ایک لطیفہ یاد آیا ہے۔ پرانے زمانے میں تین افراد کو سزائے موت کا حکم ہوا'چنانچہ ان میں سے ایک کو معمول کے مطابق گلوٹین کے نیچے لٹا دیا گیا اور اس کی آخری خواہش پوچھی گئی اس نے اپنی آخری خواہش بتائی'اس کے بعد گلوٹین کا بٹن آن کر دیا گیا۔مگر جب تیز دھار والا یہ آلہ اس شخص کی گردن کے قریب پہنچا تو مشین میں کسی

خرابی کی وجہ سے وہ وہیں رک گیا' چنانچہ قواعد کے مطابق اس کی جان بخشی ہوگئی' پھر دوسرے شخص کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ یعنی گلوٹین کسی فنی خرابی کی وجہ سے اس کی گردن کے قریب آ کر رک گئی اور یوں اس کی جان بھی بچ گئی۔ اس کے بعد جلادوں نے تیسرے شخص کو گلوٹین کے نیچے لٹایا اور پوچھا "تمھاری آخری خواہش کیا ہے" اس نے کہا "تم میری آخری خواہش پر لعنت بھیجو پہلے اپنی مشین ٹھیک کراؤ" میں جانتا ہوں تم نہیں ہنسو گے' تمہیں مقبول بٹ کی پھانسی کا صدمہ ہوگا' چھوڑو یار' کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو' جس بدقسمت شخص نے اپنے لیے زندگی کی بجائے موت کو پسند کیا۔ وہ بھی کوئی شخص ہے کہ اس کے لیے خواہ مخواہ اداس ہوا جائے۔ زندگی سب سے بڑی حقیقت ہے' زندہ رہنا اور ہر قیمت پر زندہ رہنا اصل زندہ دلی ہے "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے" جیسی باتیں زندگی کی نعمتوں سے محروم یا مایوس لوگوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ میں تو کبھی کسی جنازے میں شریک نہیں ہوتا' جنازے کو کندھا دیتے ہوئے اور روتے ہوئے لوگ کس قدر مضحکہ خیز لگتے ہیں کل میرا ہمسایہ مر گیا۔ میں اس وقت گلی میں سے گزر رہا تھا جب اس کا جنازہ گھر سے برآمد ہوا' چنانچہ مجبوراً مجھے چند قدم جنازے کے ساتھ جانا پڑا مگر یار کندھا دیتے ہوئے چارپائی جس طرح کبھی ایک طرف کو اور کبھی دوسری طرف لڑھک جاتی تھی' اس پر مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ میں دوڑ کر واپس اپنے گھر میں گھس گیا اور اپنے کمرے کی چٹخنی چڑھا کر دیر تک ہنستا رہا۔ اب تم پھر اس پر منہ بسورو گے اور کہو گے کہ انسان کو نہ غمگین سلیمانی ہونا چاہیے کہ ہر وقت موت کو یاد کرتا رہے اور نہ اتنا سنگدل ہونا چاہیے کہ اسے کبھی موت یاد ہی نہ رہے تم دراصل منافق آدمی ہو۔ چنانچہ ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ارے میاں اس چکر سے نکلو ورنہ جینا بھی مشکل ہو جائے گا اور مرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ لاحول ولاقوۃ یہ کیا موت کا ذکر درمیان میں لے آیا ہوں۔ ایک تازہ لطیفہ سنو' ابھی کل ہی سنا ہے ریلوے کی ملازمت کے لیے ایک شخص کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ انٹرویو لینے والے نے پوچھا "اگر تم دیکھو کہ دو گاڑیاں ایک ہی پٹڑی پر آمنے سامنے آ رہی ہیں تو تم کیا کرو گے"۔ ملازمت کے خواہشمند نے کہا "میں کانٹا بدل دوں گا"۔

"اگر اس وقت کانٹا بدلنا ممکن نہ ہوا' تو پھر کیا کرو گے؟"

''پھر میں سرخ جھنڈی لہراؤں گا''۔

''اگر اس وقت سرخ جھنڈی دستیاب نہ ہوئی تو پھر؟''

''پھر میں لالٹین ہاتھوں میں پکڑ کر خطرے کا اشارہ دوں گا''

''اگر اس وقت تمہیں لالٹین بھی نہ ملی تو پھر کیا کرو گے''

''تو پھر میں اپنے چھوٹے بچے کو گھر سے لے آؤں گا''۔

''وہ بچہ وہاں کیا کرے گا؟ انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ اسے گاڑیوں کی ٹکر دیکھنے کا بہت شوق ہے''! انٹرویو دینے والے نے جواب دیا۔

دراصل یہ جواب جو اس نے سب سے آخر میں دیا ہے' اسے سب سے پہلے دینا چاہیے تھا' کیونکہ اس قسم کے مناظر واقعی بہت ''تھرلنگ'' ہوتے ہیں تم جو سپر پاورز کے تصادم دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے ہو تو پیارے ان پر کڑھنا نہیں چاہیے انہیں انجوائے کرنا چاہیے۔ میں نے اور تم نے کون سا کوئی روز روز پیدا ہونا ہے کہ خواہ مخواہ سارے جہاں کے درد کو اپنے جگر میں جگہ دیتے پھریں۔ ہمیں تو

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

والی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ تمہارا دوست غمگین سلیمانی اسے نصیحت نہیں' وصیت کہے گا' چلو وصیت ہی سہی' مگر سبحان اللہ کیا عمدہ وصیت ہے کتنا اچھا ہو اگر کسی کو مجبوراً مرنا پڑ جائے تو وہ اس قسم کی وصیت کر کے مرے۔ سقوطِ حیدر آباد' سقوطِ جونا گڑھ' سقوطِ کشمیر اور سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے مجھے چند لاجواب لطیفے یاد آ رہے ہیں' مگر اس وقت مجھے ایک پارٹی میں شرکت کے لیے جانا ہے لہٰذا پھر کبھی سناؤں گا۔

تمہارا دوست! خوش باش عیش پوری

———❖❖❖———

# گم گشتہ

رات کو گیارہ بجے جب جھنگ سے تابوت جیسی شکل وصورت والی بس لاہور روانہ ہوئی تو مجھے جتنے کلمے یاد تھے' وہ میں نے دل ہی دل میں پڑھ لیے۔ اس بس کو ڈھائی بجے شب لاہور پہنچنا تھا۔ چنانچہ میرا خیال تھا کہ تین ساڑھے تین گھنٹے کی نیند بس میں کرلوں گا۔ اور نیند کی دوسری ''قسط'' گھر پہنچ کر ''ادا'' کرلوں گا۔ مگر جب بس سٹارٹ ہوئی تو میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا' کہ باقی سب کچھ ہوسکتا ہے' اس بس میں نیند نہیں ہوسکتی۔ گیٹ کے برابر والی سیٹ کا سپورٹنگ راڈ' ٹوٹا ہوا تھا' بلکہ کئی دفعہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور اس دفعہ تو اس کی ویلڈنگ اکھڑی ہوئی تھی' چنانچہ بس کے سٹارٹ ہوتے ہی اس ٹوٹے ہوئے راڈ نے جلترنگ کی طرح بجنا شروع کردیا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو شاید جلترنگ' نیند آور ثابت ہوتا۔ مگر ڈرائیور نے گانوں کی کیسٹ بھی آن کردی تھی۔ اگر گانوں کی یہ ٹیپ صفدر جاوید چیمہ کے گانوں پر مشتمل ہوتی تو شاید مجھے نیند آجاتی' مگر اللہ جانے اس ٹیپ میں کون مظلوم قید تھا۔ کیونکہ کثرت استعمال سے آواز بھی نہیں پہچانی جارہی تھی۔ بلکہ یہ اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں تھا کہ جو آواز ہم سن رہے ہیں۔ وہ گانے کی ہے یا گانے والی کی ہے؟ اس کے علاوہ بس کے اندر کی تمام بتیاں ڈرائیور نے آن کررکھی تھیں' جن کی موجودگی میں نیند آنا خاصا محال تھا۔ ان سب چیزوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ دراصل نیند ڈرائیور کو آئی ہوئی ہے اور یہ سارا ماحول اس نے صرف خود کو جگائے رکھنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ غالباً اپنی نیند ہی پر قابو پانے کے لیے وہ تنگ سی سڑک پر بس کو فل سپیڈ پر دوڑا رہا تھا اور ''موراوور'' یہ کہ اسی سپیڈ پر بس چلاتے ہوئے وہ گردن موڑ کر کنڈیکٹر کو ہدایات بھی دیتا تھا۔ میری نشست بس

کے بائیں جانب والے پہیے کے عین اوپر واقع تھی' چانچہ رہی سہی کسر ان جھٹکوں سے پوری ہورہی تھی' جو ہر دو منٹ بعد میرا مقدر بنتے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنا سر کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ٹکالیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنا سر بھی "واپس" لینا پڑا کیونکہ قدرے زوردار جھٹکے کی صورت میں سر ان دو راڈوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جا ٹکراتا تھا' جو اس شیشے پر سے گزر رہے تھے۔ اس پر میں نے دائیں جانب سرکنے کی کوشش کی' مگر سیٹ اس قدر تنگ تھی کہ میرے ذرا سے دباؤ سے دوسرا مسافر سیٹ پر سے گرتے گرتے بچا' چنانچہ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا "بھاجی! آرام نال بیٹھو"

اب میرے لیے نیند تو کجا' سکون سے بیٹھنے کے تمام راستے بھی مسدود ہو چکے تھے' چنانچہ میں نے سگریٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو برابر والے مسافر نے ایک بار پھر برا سا منہ بنایا اور کہا "بھاجی' اپنی جیب چ ہتھ پاؤ" میں نے شرمساری کے عالم میں "سوری" کہا اور پوری احتیاط کے ساتھ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود ماچس نہ مل سکی' چنانچہ میں نے بادل ناخواستہ اپنے ہم نشست سے ماچس مانگی اور اس نے بادل ناخواستہ جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی' اور میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی میری ہی طرح بیزار ہے۔ کیونکہ یہ سفر وہ بھی سہولت سے کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی نشست بھی بس کے اسی پہیّے پر واقع ہے' جہاں پر میری نشست ہے۔ ٹوٹے ہوئے راڈ' کی کھڑکھڑاہٹ' ناہموار سڑک' پرشور گانوں' گھسی ہوئی کیسٹ بس کے اندر روشن تیز بتیاں اور ڈرائیور کی بے احتیاط ڈرائیونگ اسے بھی اتنا ہی ڈسٹرب کر رہی تھی۔ جتنا کہ میں ہو رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر ماچس اسے واپس کی اور کش لگاتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر کی طرف جھانکا' مگر بس میں سے نکلتی ہوئی روشنیوں کے دائرے سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

بس فیصل آباد پہنچ چکی تھی' جھنگ سے روانہ ہوتے ہوئے کنڈیکٹر نے مسافروں کو یقین دلایا تھا کہ یہ بس براہ راست لاہور تک جائے گی۔ مگر اب وہ مسافروں کو دوسری بس میں بٹھا رہا تھا کہ اس کا کہنا تھا بس خراب ہو چکی ہے۔ دوسری بس کے حالات بھی

دگرگوں تھے۔ یہاں بھی پرشور گانوں کی گھسی ہوئی کیسٹ' بس کے اندر روشن تیز بتیاں ناہموار سڑک اور ڈرائیور کی بے احتیاط ڈرائیونگ مسافروں کی نیند اڑائے ہوئے تھی۔ اس بس کے مسافر بھی بس پر نہیں' بس کے پہیوں پر سفر کر رہے تھے اور اس دفعہ جو میرا ہم نشست تھا' وہ خود ہی بے چین نہیں تھا' اس کی مرغیاں بھی خود کو سخت بے چین محسوس کر رہی تھیں جن کی ''نشست'' اس مسافر کے پاؤں میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد نیند کے غلبے کی وجہ سے اس کا پاؤں کسی مرغی کی گردن پر جا پڑتا اور بس کے دوسرے شور کے علاوہ ان بے زبانوں کی فریاد بھی سنائی دیتی۔ ہم جھنگ سے رات کو گیارہ بجے روانہ ہوئے تھے اور اصولاً ہمیں ڈھائی بجے لاہور پہنچ جانا چاہیے تھا' مگر اس وقت صبح کے چار بج چکے تھے۔ اور منزل کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ بس کی کھڑکیوں میں سے باہر کے موسم کا اندازہ ہوتا تھا' اور موسم کوئی اتنا سہانا نہیں تھا' آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بارش شروع ہوگئی ور لگتا تھا یہ بارش بس کے باہر نہیں' بس کے اندر ہو رہی ہے۔ کیونکہ بارش کا پانی بس کی کھڑکیوں کے علاوہ چھت سے بھی ٹپکنا شروع ہو گیا تھا' چنانچہ بے آرام مسافروں کی بے آرامی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے ہم نشست مسافر کے پاؤں میں بیٹھے ہوئے مرغوں کی کڑکڑاہٹ بھی بڑھ گئی تھی' اور انہوں نے گھبرا کر بانگیں دینا شروع کر دی تھیں۔ باہر دن کی روشنی طلوع ہو چکی تھی مگر رات بھر جاگے ہوئے مسافروں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہاں سے لاہور سات آٹھ میل دور تھا اور بس ایک دفعہ پھر خراب ہو گئی تھی۔ بس میں بیٹھے ہوئے مرد' عورتیں' بچے بوڑھے ایک بار پھر ٹوٹے ہوئے جسموں کے ساتھ اٹھے اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ بس میں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ ان کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ بارش ان کے سروں پر برس رہی تھی اور وہ ایڑیاں اٹھا کر کسی نئی بس کا انتظار کر رہے تھے' کسی ایسی بس کا' جس کا ڈرائیور انہیں ان کی گم گشتہ منزل تک پہنچا دے!۔

❖❖❖

# ریاض خردماغ

"بھئی اقبال ٹاؤن چلو گئے؟"

"بیٹھو باؤ جی بیٹھو"۔

"بیٹھ تو جائیں گے مگر پہلے پیسے مکالیں تو بہتر ہے"۔

"جناب اس کی کیا ضرورت ہے آپ جو دیں گے لے لوں گا"۔

"چلو ٹھیک ہے مگر ذرا آہستہ چلانا"۔

"بہتر جناب یہ رفتار ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک تو نہیں ہے۔مگر گوارا ہے' خیر' تم یہ بتاؤ تم نے اپنے رکشے کے پیچھے "ریاض خردماغ" کیوں لکھا ہوا ہے؟"۔

"ریاض میرا نام ہے جی"۔

"اور خردماغ تمھارا تخلص ہے؟"۔

"نہیں جناب نہیں۔تخلص تو میں نے "پردیسی" رکھا تھا' مگر یہ شاعر بڑے کمینے اور ذلیل ہوتے ہیں۔ میں نے ایک شاعر کو اپنی غزل سنائی تو اس نے کہا کہ شاعری تمھارے بس کا روگ نہیں' یہ "خردماغ" کا خطاب مجھے میرے محلے کے شاعروں نے دیا تھا۔ان کا خیال تھا میں اس سے چڑ جاؤں گا۔لیکن میں نے اسے اپنے رکشے کے پیچھے لکھ لیا ہے۔جی وہ شعر کیا ہے۔

تندی باد مخالف سے تو کیوں گھبراتا ہے اے عقاب

یہ تو چلتی ہے تجھ کو اونچا اڑانے کے لیے

''ہاں ہاں' کچھ اسی قسم کا شعر ہے' مگر تم ذرا آہستہ چلو''۔

''صاحب جی مجھ سے ان شاعروں' ادیبوں کی شکل نہیں دیکھی جاتی' میں اگر چار جماعتیں پڑھا ہوا ہوتا' تو ان کو سیدھا کر دیتا! میں اخباروں میں ان لوگوں کے خلاف لکھتا''۔

''اخباروں میں اور بہت سے لوگ یہ کام کرر رہے ہیں' لہٰذا تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیے' مگر تم ان لوگوں کے خلاف کیا لکھتے کہ یہ تمہیں دانشور نہیں مانتے' ''خردماغ'' کہتے ہیں؟''۔

''نہیں جناب نہیں' خردماغ ضرور ہوں مگر اتنا بھی نہیں' لکھتے وقت تو میں کوئی اور بات لکھتا مخالفت کی اصل وجہ کا تو لوگوں کو پتہ ہی نہ چلتا۔ وہ آپ نے شعر نہیں سنا ہوا۔

تپش سورج کی ہوتی ہے جلنا دل کو پڑتا ہے

قصور تو آنکھوں کا ہوتا ہے تڑپنا دل کو پڑتا ہے

''بہت اچھے' تم تو خاصے چالاک آدمی ہو' تمہارے دوستوں کو واقعی تمہیں دانشور مان لینا چاہیے''۔

''بس صاحب جی' یہ سب تحسین باہمی میں پڑے ہوئے ہیں' ہمیں کون مانتا ہے ہمیں تو ڈنگر سمجھتے ہیں!''۔

''یہ ان کی زیادتی ہے' تم جیسے ''بڑبولے'' لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ نیک نیت ہوتے ہیں' ایماندار ہوتے ہیں' میں تو تم جیسے لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میرا ایک دوست بالکل تم جیسا ہے' بہت کڑوی باتیں کرتا ہے' لیکن میرے دل میں اس کے لیے بہت احترام ہے' کیونکہ اس کے بعد اس کا دل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے''۔

''جناب! یہ تو آپ کی اپنی نیک دلی ہے' ورنہ سب لوگ کب اس طرح سوچتے ہیں۔ اب آپ نے ذکر چھیڑا ہے تو یقین جانیں میں ملک وقوم کے حالات دیکھ دیکھ کر کڑھتا

رہتا ہوں، ہماری قوم کے لوگ لالچی ہو گئے ہیں، ان کی نیتیں ٹھیک نہیں رہیں، ہم لوگ حسد بھی بہت کرتے ہیں اور اپنے کسی بھائی کو آگے بڑھتے دیکھ نہیں سکتے سر جی، ہماری قوم کا کیا بنے گا؟"۔

"اللہ بہتر کرے گا ہم سب کو چاہیے کہ ہم اپنی اپنی اصلاح کی کوشش بھی کریں، ان باتوں پر صرف کڑھنے سے کام نہیں چلے گا!"۔

"جی وہ تو ٹھیک ہے، مگر لوگ تو یہاں سیدھی بات کا بھی غلط مطلب لیتے ہیں، میں پچھلے دنوں بیمار ہوا، تو میرا ایک دوست میری خبر لینے آیا، وہ میرے لئے "فُول" بھی لایا تھا۔ جس پر اللہ کی قسم میرا دل بہت خوش ہوا، چانچہ میں نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

فول نے جب فول بھیجا فول کر میں نے کہا

فول کیوں لائے میری جاں فول تو تم خود ہی ہو

مگر صاحب جی وہ مجھ سے ناراض ہو گیا، کہنے لگا تم نے مجھے "فول" کیوں کہا ہے؟"۔

"وہ تو ٹھیک ہی ناراض ہوا، تمہیں "پھول" کہنا چاہیے تھا"۔

جناب! میں نے فُول ہی تو کہا تھا"۔

"تم پھر "فُول" کہہ رہے ہو"۔

"میں جناب! "فُول" نہیں "فُول" کہہ رہا ہوں فول......فول!

"چلو چھوڑو تم یہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟"۔

"پھر کیا ہونا تھا میں نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر اس کا غصہ کم ہی نہ ہوا۔ میں نے تو اسے اپنا یہ شعر بھی سنایا۔

تو بول نہ بول تیرے بولنے کا غم نہیں

تیرا ایک ہی دیدار تیرے بولنے سے کم نہیں

''یار تم تو خاصے مزیدار آدمی ہو' تمہارے دوست تو تم سے خواہ مخواہ بیزار ہیں''۔

''بس جی رونا تو یہی ہے' خلوص کی تو کوئی قدر ہی نہیں رہی لوگوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہیں اور ساتھ ساتھ ان کی جیبیں بھی کترتے رہیں تو وہ خوش رہتے ہیں۔ صاحب جی میرا قصور یہ ہے کہ میں منافق نہیں ہوں!''۔

''اچھا یار تم سے پھر ملاقات ہوگی' کتنے پیسے ہو گئے؟''۔

آپ جی صرف ۲۳ روپے دے دیں''۔

''۲۳ روپے؟ میٹر پر تو ۱۵ روپے بنے ہیں''۔

''آپ کمال کرتے ہیں جناب' آپ کو مجھ سے زیادہ میٹر پر اعتبار ہے۔ آپ آرام سے ۲۳ روپے مجھے دے دیں''۔

''ریاض میاں' تم تو دھمکیاں دینے لگے ہو''۔

''بابو میرا نام ریاض میاں نہیں ''ریاض خر دماغ'' ہے۔ آپ سیدھے ہاتھ سے ۲۳ روپے میری ہتھیلی پر رکھ دیں میں تو آپ کو بہت بھلا آدمی سمجھا تھا' مگر آپ بھی دوسری سواریوں جیسے نکلے' ذرا جلدی کریں میرے پاس فالتو ٹیم نہیں ہے''۔

# حقِ دوستی

''یار تم نے اپنا گھر بہت خوبصورت بنایا ہے!''

''بھئی تم جانتے ہو اس پر میری کتنی دولت اور کتنا وقت صرف ہوا ہے!''

''اس کا نقشہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟''

''حاصل کیا تھا؟ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ یہ نقشہ ایک بین الاقوامی شہرت کے ماہر تعمیرات سے بنوایا تھا۔ دس لاکھ روپے تو صرف اس کی فیس ادا کی تھی!''

''دس لاکھ روپے صرف نقشے کی فیس کے طور پر ادا کیے تھے!''

''ہاں اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے' تم جانتے ہو اس مکان کی تعمیر پر کتنی لاگت آئی ہے؟''

''کتنی لاگت آئی ہے؟''

''چلو چھوڑو' تم سن کر بیہوش ہو جاؤ گے بس اتنا جان لو کہ اس میں جو کچھ تمھیں نظر آ رہا ہے' وہ سب کا سب امپورٹڈ سٹف ہے!''

''کیا تم اس گھر میں خوش ہو؟''

''کیا مطلب؟ خوش کیا بہت خوش ہوں!''

''یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ تم نے یہ گھر رزق حلال سے نہیں بنایا!''

''ہاں جانتا ہوں۔ مگر پھر؟''

”کیا تمھارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرتا؟“

”ضمیر؟ ضمیر انسان کو گناہوں سے روکتا نہیں! بس ان گناہوں کا مزا کرکرا کرتا ہے سو کبھی کبھی میرا مزا بھی کرا کرا ہو جاتا ہے!“

”اگر تم انٹی کرپشن والوں کی نظروں میں آ گئے؟“

”تو کیا ہوگا؟“

”پکڑے جاؤ گے اور کیا ہوگا؟“

”تم بھی بہت بھولے آدمی ہو۔ کوئی اور بات کرو!“

”کیا تم نے کبھی سوچا کہ اتنے کروفر سے رہنے کے باوجود معاشرہ تمہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا؟“

”کون سا معاشرہ؟“

”ارے بھئی وہی معاشرہ جس میں تم رہتے ہو۔ جس میں تمھارے عزیز و اقربا، تمھارے محلے دار اور تمھارے دوست احباب بھی شامل ہیں؟“

”یہ سب لوگ تو مجھے دیکھ کر سجدے میں چلے جاتے ہیں“۔

یہ سب کچھ اوپرا اوپر سے ہے، اندر سے وہ لوگ تمہیں پسند نہیں کرتے!“

”اندر کی بات جب تک اندر ہی رہے، اس سے ہمیں کیا نقصان پہنچتا ہے؟“

”اچھا چلو ضمیر کو بھی چھوڑو، انٹی کرپشن والوں کو بھی چھوڑو، معاشرے کو بھی چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ مذہب پر ایمان رکھتے ہو!“

”ہاں ہر مہینے باقاعدگی سے گیارھویں شریف کا ختم پڑھاتا ہوں!“

”لیکن اگر تمھارے رزق میں حرام کی ملاوٹ ہے، تو یہ نذر و نیاز تمھارے کسی کام نہیں آئے گی!“

''یار کیوں مجھے ڈراتے ہو؟''

''نہیں اس میں ڈرانے والی کوئی بات نہیں، میں امر واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جو حرام مال سے اپنے لیے گھر بناتے ہیں اور دنیا کی آسائشیں خریدتے ہیں!''

''یار تم کیوں مجھے خوفزدہ کرنے پر تل گئے ہو؟''

''تمھیں خوفزدہ نہیں کر رہا۔ صرف بطور دوست اپنا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ قبر جو پہلے ہی تنگ ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے اور زیادہ تنگ ہو جائے گی''۔

''اور...... اور کیا ہوگا؟''

''اور یہ کہ دوزخ کے فرشتے ایسے بدبختوں کو جلتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیں گے اور جب ان کے جسم جل کر راکھ ہو جائیں گے تو انہیں نیا جسم عطا کیا جائے گا اور اس کے بعد دوبارہ الاؤ میں ڈال دیا جائے گا اور یہ عمل کروڑوں سال تک جاری رہے گا''۔

''کیا تم یہ سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں نے اس معاملے میں جھوٹ بول کر خود جہنم کی آگ میں جلنا ہے؟ تم اب عمر کے آخری حصے میں ہو۔ طرح طرح کے عوارض میں گرفتار ہو کسی بھی وقت سانس تمھارا ساتھ چھوڑ سکتی ہے کیوں چند لمحوں کی آسائش کے لیے خود کو کروڑوں سال کے عذاب میں ڈالتے ہو، قارون کتنا امیر آدمی تھا؟ لیکن جب وہ مرا تو اس کا مال و دولت اس کے کام نہیں آیا اس وقت وہ پڑا دوزخ کی آگ میں جل رہا ہوگا!''

''تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم میرے محسن ہو۔ مجھ سے اب اس گھر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھا جا رہا، تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری باتوں کو دھیان سے سنا اور ان کا اثر بھی قبول کیا۔ اب تم اس عذاب سے اسی صورت میں نکل سکتے ہو کہ اپنے رزق حلال میں سے ایک

چھوٹی سی کٹیا خرید کر یا کرائے پر لے کر اس میں رہو یقین جانو تمہیں اس کٹیا میں زیادہ سکون ملے گا!"

"اور موجودہ گھر کو کیا کروں؟"

"یہ تم میرے نام کردو' میں تمھاری خاطر سارے عذاب سہہ لوں گا آخر حق دوستی تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے!"

# ان ہاتھوں سے

''بہت افسوس ہوا تمھارے دوست جیرے پہلوان کی وفات کا سن کر' بہت پیارا آدمی تھا!''

''ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے۔ایک ہی تو اپنا دوست تھا' آج کل ایسے دوست کہاں ملتے ہیں؟''

''اسے ہوا کیا تھا؟''

''ہونا کیا تھا' بالکل ٹھیک ٹھاک تھا' ایک دن پہلے اکھاڑے میں اس کے ساتھ زور کیا' کیسے کیسے استادی ''دا'' اس نے سکھائے' مگر اگلے دن پتہ چلا کہ اللہ کو پیارا گیا۔ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے۔اللہ کے کاموں میں کسے دخل ہے؟''

''لیکن ہوا کیا تھا اسے؟''

''ہونا کیا ہے جی' اکھاڑے میں ہم زور کرنے گئے ابھی پنڈے پر مٹی نہیں ملی تھی کہ کہنے لگا سینے میں درد ہو رہا ہے' میں نے کہا زور کرو' پنڈا اکھل جائے گا۔اس نے ڈنڈ نکالنے کی کوشش کی' دو ہی ڈنڈ نکالے تھے کہ سانس ٹوٹنے لگا' باؤ ارشد اس وقت پاس ہی تھا' وہ اسے سکوٹر پر بٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ڈاکٹر ابھی ٹوٹی لگا کر دیکھ ہی رہے تھے کہ اس کا دم نکل گیا۔نالائق ڈاکٹر ہیں جی! اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لیے کہنے لگا ''ہارڈ'' اٹیک ہوا ہے!''

''جیرا پہلوان سگریٹ وغیرہ تو نہیں پیتا تھا؟''

’’نہیں جی‘ اس نے تو کبھی خالی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا!‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’زبندہ تھا جی‘ بھرا ہوا سگریٹ پیتا تھا۔ اوہو!!! کتنی خوبیوں والا یار تھا میرا۔ خدا ترس اتنا کہ کسی کی تکلیف دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہفتہ پہلے وہ ٹیکس وصول کرنے کا کا سگریٹ فروش کے کھوکھے پر گیا ہے‘ کا کا سگریٹ فروش جیرے کے پاؤں پڑ گیا کہ روزوں کی وجہ سے اس کی بکری آدھی رہ گئی ہے‘ گھر میں بچے بھوکے بیٹھے ہیں‘ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ سن کر جیرے پہلوان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے‘ اسے اٹھا کر سینے سے لگایا اور کہاں دل چھوٹا نہ کر کا کے۔ آج اگر پیسے نہیں ہیں تو کل ادا کر نا تم پر بے اعتباری تھوڑے ہی ہے!‘‘

’’یہ جیرا پہلوان غنڈہ ٹیکس بھی لیتا تھا؟‘‘

’’نہیں جی نہیں‘ میرا یار غنڈہ نہیں تھا جی‘ وہ تو غریب پرور تھا۔ وہ ان جیبیں کاٹنے والے دکانداروں سے جرمانہ وصول کرتا تھا اور آگے غریبوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ آدھی ہیرا منڈی اس سے پلتی تھی۔ بڑا خوبیوں والا یار تھا میرا مگر بے وفائی کر گیا ساتھ چھوڑ گیا‘ ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے!‘‘

’’میں نے سنا ہے اس کی ماں بہت روتی ہے‘‘

’’ماں نے نہیں رونا تو اور کس نے رونا ہے جی...... اور پھر پہلوان ماں کا فرمانبردار بھی بہت تھا‘ جو کماتا تھا‘ اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا تھا‘ ماں بھی اتنے نصیبوں والی تھی کہ جس روز ماں کی شکل دیکھ کر گھر سے نکلتا‘ اس کے سارے کام خود بخود ہوتے چلے جاتے‘ پولیس نے اسے مفرور قرار دیا ہوا تھا‘ مگر وہ پولیس کے سامنے سے گزر جاتا اور انہیں نظر نہ آتا!‘‘

’’پولیس نے اسے مفرور قرار دیا ہوا تھا؟ وہ کیوں؟‘‘

’’بڑا جی دار یار تھا میرا...... دو چار بندے ’’لاء‘‘ دیئے تھے اس نے‘ بس اس کے بعد پولیس اس کے پیچھے تھی۔ پولیس کے ہاتھ نہیں آیا جی۔ ڈاکٹروں کی نالائقی سے مر گیا۔

کیسا کڑیل جوان تھا میرا یار۔ پھٹے پر کیسے شیر کی طرح پڑا ہوا تھا۔ ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے!"

"میں نے سنا ہے اسے اپنی بہنوں سے بھی بہت محبت تھی"

"محبت تو کوئی لفظ ہی نہیں ہے جی۔ عشق تھا اسے عشق۔ مگر اس کے باوجود بڑا رعب تھا اس کا' گھر میں داخل ہوتا تو وہ کمروں میں چھپتی پھرتیں۔ پورے محلے میں کسی نے ان کی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ پہلوان کی زندگی میں انہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا' ان کی ضرورت کی چیزیں ماں بازار سے خرید کر لا دیتی تھی!"

"اب کیا حال ہے ان بچاریوں کا؟"

"بھائی کی موت کا انہیں اتنا صدمہ ہوا کہ دیوانگی کی حالت میں گھر سے نکل گئیں۔ آج تک ان کا سراغ ہی نہیں مل سکا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ کپڑا لتا بھی ساتھ لے گئیں' ورنہ اللہ جانے ان معصوموں کا کیا حال ہوتا! نہ ایسی باتیں چھیڑیں باؤ جی' میرا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے' میرا یار اس وقت قبر میں بے چین ہو رہا ہوگا' کیسا کڑیل جوان تھا' اس کے نام کی دہشت سے لوگ کانپتے تھے۔ لیکن مرنے کے بعد کیسی بے بسی کے عالم میں پھٹے پر پڑا ہوا تھا۔ اپنے ان ہاتھوں سے اسے نہلایا ہے جی!"

"جیرا پہلوان اپنا یار تھا جی اور یاریاں زندگی تک نہیں' مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہیں' اپنی اس بیوی کے ساتھ اس نے چند مہینے پہلے شادی کی تھی جب یہ اسے اٹھانے گیا تو......

"اٹھانے گیا؟"

"ہاں جی' لڑکی کے گھر والے نہیں مانتے تھے' تو جب یہ اسے اٹھانے گیا ہے جی تو میں بھی اس کے ساتھ تھا' اٹھانا ہم نے اسے کیا تھی جی' وہ خود اچک کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے نصیب پھوٹ جائیں گے؟"

"ہاں' یہ تو اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا!"

"مگر جی یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے میرے یار کی بیوہ ساری عمر روتے گزار دے، میں ایک مہینہ پہلے اس کی خیر خیریت پوچھنے اس کے گھر گیا' دیکھا تو گھر میں کھانے کو بھی کچھ نہیں تھا' جیرا پہلوان جو کماتا تھا' لٹا دیتا تھا مجھ سے اپنے یار کی بیوہ کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی' میں نے اسے اسی وقت نکاح کا پیغام دیا' اب وہ میرے گھر کی مالک ہے جی"۔

"تو جیرے پہلوان کا کوئی بچہ وچہ نہیں تھا"

"بیچارا اس معاملے میں بدنصیب تھا' اس نے بڑے علاج کرائے مگر بچہ کہاں سے ہونا تھا جی ان ہاتھوں سے نہلایا ہے جی اسے"۔

# خطرناک آدمی

گزشتہ دنوں چار پانچ چھٹیاں اکٹھی ہوگئیں، چھٹی کے پہلے روز سو کر اٹھا تو حسب عادت شیو کے سامان کے ساتھ میں آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرا شیو کرنے کو جی نہیں چاہ رہا، میں نے سوچا اتنے عرصے سے رسم دنیا نباہ رہے ہیں، آج اگر نہیں نباہیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟ چنانچہ میں صرف منہ ہاتھ دھو کر اپنے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ مگر اس روز میرا کام کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس جی چاہتا تھا کہ مزے سے بے سدھ پڑے رہو، سو میں نے تین دن اسی طرح گزارے چوتھے روز گھر سے نکلا اور بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ کاموں میں مشغول ہوگیا۔ مگر مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ چار دن کا بڑھا ہوا شیو میرے لیے کیسے کیسے مسائل کھڑے کر سکتا ہے!

دفتر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جس دوست سے ملاقات ہوئی، اس نے میرے سلام کا جواب دینے کی بجائے کہا "یار تم نے اپنی حالت کیا بنائی ہوئی ہے؟"

میں نے کہا "ٹھیک تو ہوں، کیا ہوا ہے مجھے؟"

اس نے کہا "آئینے میں اپنی شکل دیکھو، فلموں کے بے روزگار ہیرو لگ رہے ہو۔ مجھے تو ڈر ہے کہ تم ابھی مجھے کاندھوں سے جھنجھوڑ کر کہو گے کہ ماں! مجھے آج پھر نوکری نہیں ملی!"

دوست کے یہ ریمارکس سن کر بے ساختہ میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا، شیو واقعی خاصا بڑھا ہوا تھا، اتنا کہ اگر خط بنوایا جائے تو اسے باقاعدہ داڑھی قرار دیا جا سکتا تھا، مگر مجھے یہ اسی طرح اچھا لگ رہا تھا میں نے مسکراتے ہوئے اپنے دوست کے کاندھوں پر

تھپکی دی اور آگے بڑھ گیا!

میں ابھی اپنی ڈاک دیکھ رہا تھا کہ دریں اثنا ایک اور دوست میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور مختلف زاویوں سے عجیب عجیب منہ بنا کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تم نے اپنی شکل دیکھی ہے؟''

''کیوں' کیا ہوا ہے مجھے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا ہوا ہے؟ مجھے کوئی مثال نہیں سوجھ رہی' تم سپورٹس مین سپرٹ سے کام لیتے ہوئے خود ہی اپنے آپ کو کسی بری چیز کے ساتھ تشبیہ دے لو!''

''عجیب واہیات لوگ ہیں'' میں نے دفتر سے واپسی پر ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔

کیشیئر نے میرے خریدے ہوئے سامان کی رسید دیتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا ''اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں؟''

''فرمائیں'' میں نے جل کر کہا' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''اخبار میں آپ کی تصویر تو خاصی بہتر آتی ہے''

''دھت تیرے کی!'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور سٹور سے باہر آ گیا!

مجھے ایک ضروری ٹیلیفون کرنا تھا اور ظاہر ہے ہمارے ہاں فون کسی سرکاری دفتر ہی سے ہو سکتا ہے' میں نے ٹیلیفون کرنے سے پہلے اپنے دوست سے چکنی چپڑی باتیں کیں اور پھر ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''یار ایک ضروری فون کرنا ہے!''

''کرو کرو' مگر سرکاری ٹیلیفون کے غلط استعمال پر کالم نہ لکھ دینا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

میں نے جواباً ایک کھسیانی سی ہنسی ہنسنے کے بعد نمبر ملانا شروع کر دیا!

میں نے ٹیلیفون کرنے کے بعد دوست کا شکریہ ادا کیا۔

''کوئی بات نہیں!'' دوست نے کہا ''مگر یہ تم نے شیو کیوں بڑھایا ہوا ہے' خیر تو ہے؟''

''بس یار جی نہیں چاہ رہا تھا' لہٰذا شیو نہیں کیا!''

نہیں مجھے تو کچھ اور ہی چکر لگتا ہے؟'

''مثلاً؟''

''یہی کہ کسی لمبے ہی چکر میں ہو' لیکن میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ بال بچے دار شخص کو اور سب کچھ کرنا چاہیے' عشق نہیں کرنا چاہیے!''

''مشورے کا بہت بہت شکریہ'' میں نے جل کر کہا ''مگر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا!''

''واقعی!'' دوست نے اپنی کرسی سے اچھل کر کہا۔

ہاں! ہاں' ہاں'' میں نے زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے کہا ''بلکہ میرا ارادہ تو عقد ثانی کا ہے' تمھارا کیا خیال ہے؟''

''توبہ' توبہ' توبہ'' دوست نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ''میں تو پہلی شادی کے حق میں بھی نہیں ہوں' تم دوسری شادی کا پوچھ رہے ہو؟''

''تو پھر اس مسئلے پر تم سے بات نہیں ہو سکتی'' میں اُس سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر میں دوبارہ واپس آیا اور دوست کے کان میں سرگوشی کی ''مگر دیکھو یار! یہ بات کسی کو بتانا نہیں!''

کون سی بات؟''

''یہی دوسری شادی والی!'' اور پھر میں اسے سخت پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر واپس کار میں آ کر بیٹھ گیا!

گھر واپس پہنچتے ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ''ٹرن ٹرن''

میں نے ٹیلیفون اٹھایا ''یار سنا ہے تم شادی کر رہے ہو' بڑے افسوس کی بات ہے!''

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''بتایا تو مجھے افضل نے ہے' مگر شک مجھے خود بھی گزرا تھا!''

''وہ کیسے؟''

''یہ جو تم کئی دنوں سے شیو نہیں کر رہے......''

''تو کیا یہ شرط میرے سسرال والوں نے عائد کی ہے کہ اگر شیو خاطر خواہ طور پر بڑھا نہ ہو تو بارات واپس کر دی جائے گی؟''

''یہ تو تم جانتے ہو گے' بہر حال جو قدم بھی اٹھانا' سوچ سمجھ کر اٹھانا!'' یہ کہہ کر اس بدبخت نے فون بند کر دیا!

میں ایک اور پیشی بھگت رہا تھا! ''یار تمھارے ساتھ دوستی میرے لیے عذاب بن گئی ہے صبح سے تمھاری طرف سے صفائیاں دے دے کر تنگ آ گیا ہوں!''

''تم یوں کرو'' میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا تم یہ صفائیاں دینا بند کر دو!'' اور پھر ٹیلیفون درمیان ہی میں کٹ گیا!

میں نہانے کے لیے ابھی باتھ روم جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر بیل ہوئی راشد سامنے کھڑا تھا!

''یار ملک کا کیا بنے گا؟'' اس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی حسب معمول سیاسی گفتگو شروع کر دی۔

کیوں خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹیلی ویژن ریڈیو اور سرکاری اخبارات چوبیس گھنٹے حکومتی نقطہ نظر ہم پر ٹھونسنے میں لگے رہتے ہیں...... یہ ایک طرح سے ہمیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنے نقطہ نظر سے

دستبردار ہو جائیں! یہ کوئی جمہوریت نہیں ہے!''

''تمھارے نزدیک جمہوریت کی تعریف کیا ہے؟''

''میرے نزدیک جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ ہر شخص کو قول و فعل کی مکمل آزادی ہونی چاہیے' بس اتنا ہے کہ اس سے دوسروں کی آزادی متاثر نہ ہو!''

''بالکل ٹھیک ہے'' میں نے کہا ''اب تم یہ بتاؤ کہ میرے بڑھے ہوئے شیو سے تمھاری آزادی تو مجروح نہیں ہو رہی!''

''ارے ہاں' یہ تو میں بھول ہی گیا تھا'' راشد کے لہجے میں تشویش تھی' لوگ تمھارے بڑھے ہوئے شیو کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں!''

''مثلاً؟''

''مثلاً ایک تو یہ کہ تمھاری ٹھوڑی کے نیچے ایک گلٹ سا نکلا ہوا ہے' جسے چھپانے کی کوشش میں تم داڑھی رکھ رہے ہو اور دوسرے یہ کہ......''

''ایک گلٹ اس کے علاوہ بھی ہے؟'' میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں جبراً ہنستے ہوئے کہا ''چھوڑو' ویسے ہم لوگ ہیں بہت مزیدار......حکومت سے تحریر و تقریر اور قول و فعل کی مکمل آزادیاں مانگتے ہیں اور اپنے طور پر کسی کو اتنی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اگر شیو نہیں کرنا چاہتا تو نہ کرے۔ میں نے آج کتنے ہی ضروری کام کرنے تھے' مگر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر دوپہر ہی کو واپس گھر آ گیا ہوں اور لوگوں کے سوالوں سے بچنے کے لیے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا ہوں۔ یہ وہ نظر بندی ہے جسے کورٹ میں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکتا!''

راشد کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے اس معاشرتی جبر کے خلاف ایک زبردست احتجاجی تحریک چلانی چاہیے جس کا مرکزی نکتہ یہ ہو کہ اگر کوئی شخص شیو نہیں کرنا چاہتا تو اسے اپنی اس خواہش پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہو مگر پھر میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں بلکہ ایسے دوسرے معمولی معاملوں میں بھی داد فریاد کس سے کی جائے جن کے ضمن میں

حکومت، مذہب حتیٰ کہ خود معاشرے کی طرف سے بھی بظاہر کوئی پابندی نہیں لیکن معاشرے کے ''غیر تحریری قوانین'' کی خلاف ورزی کسی صورت میں برداشت نہیں کی جاتی ؟

فون کی گھنٹی پھر بج رہی تھی۔ میں نے وارڈ روب میں سے تولیہ نکالا اور غسل خانے میں داخل ہوتے ہوئے بیٹے کو آواز دی ''یار! جس کسی کا بھی فون ہو اسے بتا دینا کہ میں شیو کر رہا ہوں فکر کی کوئی بات نہیں''

❖❖❖

# معصوم اجمیری

چھٹی والے دن سری پائے کا ناشتہ کرنے کے لیے میں نے اپنے گھر کے قریب واقع ایورنیو سٹوڈیو کی جانب رخ کیا او پھر ان سٹوڈیوز کے برابر میں واقع ایک دوکان میں داخل ہو گیا جہاں ایک پلیٹ پائے کا آرڈر دے کر میں دکان کا جائزہ لینے لگا یہ ایک عوامی قسم کی ''ناشتہ گاہ'' تھی۔ میزوں پر دھرے شیشے کے گلاسوں پر چکناہٹ نظر آ رہی تھی اور ان پر گاہکوں کی انگلیوں کے نشانات ثبت تھے میزوں پر بھی چکناہٹ کے داغ تھے اور دوسری میزوں پر جو لوگ بیٹھے تھے' اس ماحول میں اب وہ بھی چکنے چکنے لگنے لگے تھے میری ساتھ والی میز پر ایک ہیرو نما شخص ناشتے میں مشغول تھا پر لی میز پر قمیض اور شلوار میں ملبوس ایک بے چین سا شخص بیٹھا تھا' اس کی قمیض کے بٹنوں میں سے درمیان والا بٹن ٹوٹا ہوا تھا وہ چائے کی چسکیاں لیتے لیتے کبھی اچانک خلا میں گھورنے لگتا اور کبھی کپ ہاتھوں میں پکڑے کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوتا اور کبھی ہوائی چپل گھسیٹتا ہوا دکان سے باہر نکل کر ملتان روڈ پر ملتان اور ساہیوال سے آنے والی بسوں کو دیکھنے لگتا میرے سامنے والی میز پر ایک چھوٹی سی ڈاڑھی والا شخص رومال کو سر پر پٹی کی طرح باندھے بیٹھا تھا یہاں ایک موٹے شیشوں والی عینک والا بابا بھی تھا جو شڑاپ شڑاپ کی آوازوں کے ساتھ چائے پینے میں مشغول تھا۔ اس ہوٹل میں بیٹھتے ہوئے لوگوں میں سے بیشتر' ارد گرد واقع شاہنور سٹوڈیو' ایورنیو سٹوڈیوز اور باری سٹوڈیوز سے متعلق تھے اور یوں یہاں ان کا مستقل آنا جانا لگتا تھا......!

میں نے ابھی گرم گرم کلچے کا پہلا لقمہ ہی منہ میں لیا تھا کہ ایک بلی جتنے چوہے نے میرے پاؤں پر چھلانگ لگا دی اور اپنے فن کے اس مظاہرے کے بعد وہ کاؤنٹر کے پیچھے

روپوش ہوگیا۔ میری طبیعت بری طرح متلانے لگی۔ میں نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دکاندار سے شکایت کی، تو اس نے دیگچے میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا "بس جی کیا کریں، اس کا رزق یہیں لگا ہوا ہے" چوہے کو بھی غالباً میرا شکایت کرنا اچھا نہیں لگا، چنانچہ اس نے کاؤنٹر کے نیچے سے مجھے غصیلی آنکھوں سے دیکھا اور پیشتر اس کے کہ اس دفعہ وہ "ہائی جمپ" کا مظاہرہ کرتا، میں نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور سر پر پٹی باندھے ہوئے چھوٹی چھوٹی داڑھی والے شخص کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ماتہ کے داغ تھے اور وہ خاموشی سے چائے پینے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے حلق میں سے "خرخرخر" کی آواز نکالی اور پھر منہ نیچے کر کے بلغم فرش پر تھوک دی، مجھے یوں لگا جیسے میرا سب کچھ کھایا پیا ابھی باہر نکل آئے گا۔ میں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اس کی طرف خشونت بھری نظروں سے دیکھا مگر وہ میرے ردعمل سے بے نیاز دوبارہ چائے پینے میں مشغول ہوگیا۔ میں طوعاً و کرہاً آنکھیں میچ کر ایک بار پھر اپنے مرغوب ناشتے کی طرف متوجہ ہوا مگر چند لمحوں بعد مجھے ایک بار پھر "خرخرخر" کی آواز آئی اور پھر سر پر پٹی باندھے، چھوٹی چھوٹی داڑھی اور چہرے پر ماتہ کے داغوں والے اس شخص نے سر یہوڑا کر بلغم فرش پر انڈیل دیا۔ میں پلیٹ اٹھا کر واپس سابقہ میز کی طرف جانے لگا مگر میری نظر پھر اس بلی کی جسامت والے چوہے پر پڑی جو اس دفعہ کرسی کے نیچے ایک روٹی کو کتر کتر کر پھینک رہا تھا چنانچہ میں نے چوہے کو کچھ کہنے کی بجائے اس شخص مذکور کو مخاطب کیا اور کہا "بھائی صاحب آپ مہربانی کر کے باہر جا کر تھوکیں" اسے شاید یہ میری تجویز پسند آئی کیونکہ اس نے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اس دوران وہ بے چین سا شخص ایک بار پھر کاؤنٹر پر کھڑا تھا، کچھ دیر قبل ہوٹل کے باہر ایک کار آ کر رکی تھی اور اس میں سے دو معزز لوگ اتر کر اندر آئے تھے۔ یہ بھی فلم سے وابستہ لگتے تھے، وہ بے چین سا شخص اب انہی کے پاس کھڑا تھا میں نے اس بے چین شخص کو دیکھا کہ گفتگو کے دوران وہ اساتذہ کے شعر موقع کے لحاظ سے استعمال کرتا تھا۔ تاہم اس وقت وہ انہیں اپنی اختراع کی ہوئی دھن سنا رہا تھا۔

''اس میں میں نے چرواہے کی جو آواز بنائی ہے' وہ دیکھیں'' اور پھر اس نے گانے کے بول گا کر آخر میں بڑے ردم کے ساتھ منہ سے ''پھر پھر پھر پھر'' کی آواز نکالی۔ جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تو اس کے پاس کھڑے لوگوں میں سے ایک نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا ''میں زندگی وچ بڑے بڑے مخولیے دیکھے نے' پر تیرے جیا مخولیا نیں ویکھیا''۔ یہ فن کار اپنے فن کی بے حرمتی برداشت نہ کر سکا' چنانچہ اس نے اپنے درمیان والے گم شدہ بٹن کے کاج کو ٹٹولا اور پھرتی سے باہر نکل کر ملتان روڈ پر کھڑا ہو گیا جہاں ساہیوال اور ملتان سے بسیں آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں' میرے سامنے والی میز پر بیٹھے ہیرو نما شخص نے پورے انہماک سے ناشتہ کرتے کرتے کاؤنٹر کے قریب کھڑے لوگوں میں سے ایک کو مخاطب کیا ور کہا ''پائے اور بھی بہت جگہ سے مل جاتے ہیں لیکن ایک تو ایسے لذیذ پائے کہیں اور ملتے نہیں اور دوسرے (دوکاندار کی طرف اشارہ کر کے) اس شخص کے ہاتھ میں برکت بہت ہے' شوربہ اول تو کم پڑتا ہی نہیں اگر کم پڑھ بھی جائے تو یہ دوسری تیسری مرتبہ بھی پھر سے پلیٹ بھر دیتا ہے''۔ اور پھر اس نے اپنی خالی پلیٹ دکاندار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یار ذرا تھوڑا سا شوربہ تو اور ڈالنا''۔

میں بل ادا کر کے دوکان سے باہر نکلا تو وہی بے چین سا شخص سڑک کے کنارے کھڑا خلا میں گھور رہا تھا' مجھے یہ شخص دلچسپ لگا تھا اور ایسے کردار مجھے بہت مرغوب ہوتے ہیں۔ چنانچہ موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے سے پہلے میں اس کی طرف گیا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''مجھے عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں''۔

''جی بہت خوشی ہوئی''۔ وہ ایک اجنبی شخص کو اچانک اپنے سامنے پا کر کچھ سٹپٹا سا گیا ''آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی ہے''۔

مجھے یقین تھا کہ یہ بھی مجھے ''وارث'' ڈرامے کا چودھری حشمت سمجھ بیٹھا ہے۔ چنانچہ میں نے صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''ممکن ہے ایسا ہی ہو' مگر میں چودھری حشمت نہیں ہوں۔ میں ایک کالج میں پڑھاتا ہوں''۔

''اچھا اچھا! مگر آپ کا تلفظ بہت غلط ہے!''

میں نے اپنے چہرے پر ابھرنے والی مسکراہٹ چھپالی اور بظاہر سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا'' آپ مجھے کراچی کے لگتے ہیں''۔

''جی ہاں، جی ہاں میں کچھ عرصے پہلے کراچی سے آیا ہوں اور یہاں فلموں میں کام کرتا ہوں۔ کھانے کے لیے یہ ہوٹل ہے سونے کے لیے ایک کوٹھری ہے'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے اکبرالہ آبادی کا یہ شعر پڑھا۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

''آپ کا نام؟''

جی مجھے معصوم اجمیری کہتے ہیں'' اور پھر اس نے ہنس کر کہا'' صاحب میرا پورا نام تو بہت لمبا ہے، یعنی سید معصوم اجمیری، لیکن میں نے بتایا نہیں کہ آپ کہیں گے سید ہو کر یہ کس کام میں پڑ گیا ہے!''۔

''کراچی میں آپ کا کیا شغل تھا؟''۔

''جی میں وہاں بیکری کی ایک دکان میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اگر انسان کو بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہو، تو جہاں ہزار روپے سیل ہونا ہوتی ہے، وہاں پندرہ سو ہوتی ہے۔ یہ بیکری میرے خالو کی تھی، سو وہ مجھے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کر دیتے تھے!''

یہ صاحب آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے اور کچھ دیر میں وہ خاصے بے تکلف ہو گئے

''میں آپ کو ایک آئیٹم سناتا ہوں۔ وہ آپ نے غالب کا شعر تو سنا ہوا ہے نا۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مگر یہ شعر آپ مجھ سے سنیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حق۔ضیاء الحق، ضیاء الحق، ضیاء الحق، ضیاء الحق

اور اردگرد کے تمام ہجوم سے بے نیاز معصوم اجمیری نے آنکھیں بند کر کے اور سانس روک کر گردن کو دائیں اور بائیں جانب جھٹکا دینا شروع کر دیا اور "حق......ضیاء الحق" کی "ضرب" لگانے میں منہمک ہو گیا۔ کنٹرول کرنے کی کوشش کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"صاحب آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟" معصوم اجمیری نے آنکھیں کھول کر میری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "حق سے میری مراد حق تعالیٰ صرف سچ کا بول بالا ہے اور یہ تو میرا روزانہ کا وظیفہ ہے۔ ایک دفعہ میں رات کے بارہ بجے سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ ایک پولیس والا مجھے پکڑ کر تھانے لے گیا میں نے وہاں اپنا وظیفہ پڑھا۔ تھانے دار نے کہا اسے فوراً چھوڑ دو۔ میں نے کہا کیسے چھوڑ دو۔ ہمارے صدر ضیاء الحق صاحب نے اسلامی نظام نافذ کر دیا ہے مگر چوریاں ہو رہی ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، تم لوگ رشوت لیتے ہو، روزہ نہیں رکھتے، نماز نہیں پڑھتے، اب میں اذان دوں گا اور تم لوگ میرے پیچھے نماز پڑھو گے، اور پھر میں نے وہاں کھڑے کھڑے اذان دی یہ دیکھیں" اور اس کے بعد معصوم اجمیری نے عرب قاریوں کی طرح اپنے ایک کان میں انگلی دے کر عربی لحن میں وہیں کھڑے کھڑے اذان دینا شروع کر دی۔

"بہت اچھے، بہت اچھے"۔ میں نے خود پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے آہستگی سے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا "آئیں برابر والی دکان سے پان کھاتے ہیں"۔ میں اگر

ایسا نہ کرتا تو وہ شاید اذان دینے کے بعد ارد گرد کھڑے لوگوں کو صبح نو بجے والی کوئی نماز پڑھوا دیتا!

پان کی دکان کے ساتھ ایورنیو سٹوڈیو کا گیٹ تھا' جس کے باہر نیم خواندہ نوجوانوں کی ایک لمبی قطار ایڑیوں کے بل بیٹھی تھی۔ ان میں سے ایک تعداد تو ان لوگوں کی تھی' جو اپنے کسی محبوب فن کار کو ایک نظر دیکھنے کے اِس صبح سے شام تک وہاں بیٹھے رہتے ہیں' جبکہ ان میں سے بیشتر نوجوان امید پر یہاں بیٹھے تھے کہ شاید کسی ڈائریکٹر کی نگاہ جوہر شناس ان پر پڑ جائے اور وہ انہیں اپنی فلم میں ہیرو لے لے۔

''آپ مجھے پڑھے لکھے آدمی لگتے ہیں' آپ ایسے لوگوں کو فلم لائن میں آنا چاہیے' اگر کہیں تو میں آپ کو چانس دلواؤں؟''معصوم اجمیری نے اتنی سنجیدگی سے یہ پیشکش کی کہ ایک دفعہ پھر مجھے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں''۔ میں خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔''عطا اللہ شاہ ہاشمی میرے بزرگ ہیں۔ مولا جٹ والے سرور بھٹی میرے شاگرد ہیں' نغمہ نگار خواجہ پرویز میرے دوست ہیں۔ سنسر بورڈ والے ڈاکٹر صفدر محمود صاحب سے بھی میرا یارانہ ہے۔ یہ بھی مجھے اکثر یہی کہتے رہتے ہیں اور میں خود بھی ان دنوں انہی لائنوں پر سوچ رہا ہوں''۔

''اگر یہ سب آپ کے دوست ہیں' تو پھر مجھے ایک چانس دلوا دیں''۔ معصوم اجمیری نے معصومیت سے کہا''میں فنکاروں کے لیے ایک اکیڈمی کھولنا چاہتا ہوں' ان سے کہہ سن کر اس اکیڈمی کے لیے زمین کے ایک ٹکڑے کا بندوبست کر دیں''۔

اور مجھے ان لمحوں میں یہ شخص کوئی دوسرا شخص لگا۔ میں نے سوچا یہ تو کانٹوں کے بستر پر سہانے خواب دیکھنے والا انسان ہے مگر پیشتر اس کے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا اس نے میرے کاندھوں پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھا اور کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے! میں آپ کو اکبر الہ آبادی کا شعر سناتا ہوں۔

اسی کو چاہنا ہے چاہنا' میں کچھ نہ چاہوں گا

جہاں تک ہو سکے گا بندگی کا حق نبا ہوں گا

اور پھر اس نے آنکھیں بند کر کے اور گردن کو دائیں بائیں جھٹکا دیتے ہوئے ''حق ضیاء الحق'' کا وظیفہ شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور پھر اس بے چین سے اور کچھ نارمل اور کچھ ابنارمل سے شخص نے اچانک مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہوائی چپل گھسیٹتا ہوا سامنے پایوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔

# ایڈونچر

خیبر میل فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی' میری منزل حیدر آباد تھی اور میں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا اپنے سمیت دوسرے مسافروں کی کس مپرسی پر غور کر رہا تھا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدتے ہوئے تو میں ایڈونچر کے موڈ میں تھا مگر اب یہ ایڈونچر میرے لیے وبال جان ثابت ہو رہا تھا' کیونکہ اس ڈبے میں اگر سو مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی تو لاہور سے خانیوال تک کے سفر کے دوران غالباً دو سو مزید مسافر بغیر ریزرویشن کے سوار ہو چکے تھے' سو اس وقت صورتحال یہ تھی کہ جس نشست پر میں بیٹھا تھا' وہ چار مسافروں کے لیے تھی' مگر اب سات مسافر اس پر براجمان تھے' یہی حال دوسری نشستوں کا بھی تھا مگر اصل تکلیف دہ صورت حال تو ان ''درویش صفت'' مسافروں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی' جو فرش پر بیٹھے تھے اور کچھ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست تھے کہ ان کے درمیان میں سے ایک تنکا گزارنا بھی محال تھا' بوگی کے دونوں دروازے بھی ان فرش نشینوں کی وجہ سے بند ہو چکے تھے اور لیٹرین تک رسائی بھی ممکن نہیں تھی' کیونکہ اس کے سامنے بھی مسافر اکڑوں بیٹھے تھے' سو اب صورت یہ تھی کہ باہر سے کوئی مسافر اس ڈبے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا اور ڈبے کا کوئی مسافر باہر نہیں جا سکتا تھا! میں صبح دس بجے سے اس ''بلیک ہول'' میں بند تھا اور اب شام ہونے کو تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ خانیوال اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی اور بالآخر وہ ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رک گئی!

پلیٹ فارم پر خوانچہ فروشوں کی آوازوں اور مسافروں کی بھگدڑ نے فضا میں ایک عجیب ''بحران'' سا پھیلا رکھا تھا میں نے ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر چہل

قدمی کا پروگرام بنایا' مگر باہر کو جانے والے تمام راستے بند تھے' بس ایک راستہ کھلا تھا اور یہ کھڑکی کا راستہ تھا' جس میں سے باہر کودنے کے لیے مطلوبہ ہمت مجھ میں موجود نہیں تھی' کیونکہ پروگرام صرف جانے جانے کا نہیں' واپس آنے کا بھی تھا اور یہ واپسی اسی راستے سے ہونا تھی' تاہم وہ جو کسی نے کہا ''ہمت مرداں مدد خدا'' تو میں نے بھی ہمت سے کام لیا' پہلے اپنی دونوں ٹانگیں کھڑکی کے رستے باہر نکالیں اور پھر اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم پر کود گیا پیاس سے میری زبان پر چھالے سے پڑ رہے تھے۔ میں نلکے کی طرف جانے کے لیے بوگیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ پہلے میرے کانوں میں ''شی شی'' کی نسوانی آواز آئی' اور پھر میرے کپڑے بھیگ گئے میں نے ڈبے کی طرف نگاہ ڈالی تو ایک عورت اپنے بچے کو کھڑکی سے باہر کیے ''شی شی'' کی آوازیں نکال رہی تھی۔ اس وقت بچے کے چہرے پر ایک عجیب شانتی نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کافی دیر بعد اس کی سنی گئی ہے۔ اگلے ڈبے میں سے ایک صاحب نے پان کی پیک پچکاری کی صورت میں پلیٹ فارم پر پھینکی' مگر ان کا نشانہ خطا گیا۔ کیونکہ میں خطرہ بھانپ کر ان کی زد سے نکل گیا تھا نلکے پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور پانی تک رسائی نہ ہونے کے باوجود سب پانی میں نہائے ہوئے تھے کیونکہ ٹوٹی ''لیک'' کر رہی تھی اور اس میں سے پانی پورے پریشر کے ساتھ فوارے کی صورت میں اردگرد کھڑے لوگوں پر برس رہا تھا تھوڑے فاصلے پر دو عرب لڑکیاں بوشرٹ اور جینز پہنے اپنے ایک عرب ساتھی کے ساتھ کھڑی تھیں میں نے بائیں جانب دیکھا تو گاڑیوں کی بوگیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والے درمیانی حصے میں ریلوے کے دو ملازم پورے اطمینان کے ساتھ بیٹھے لنچ یا ڈنر میں مشغول تھے انہوں نے ایک ہاتھ میں روٹی اور روٹی پر کباب رکھے تھے اور مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ میں نے نلکے کے ''گردونواح'' میں اپنی باری کا انتظار کیا اور جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا تو واپس اپنے ڈبے کی طرف جانے کی ٹھانی۔ اس دوران گارڈ نے وسل بھی دے دی تھی میں نے کوشش کی کہ ڈبے میں دروازے کے راستے سے داخل ہوں مگر ''فرش نشین'' مسافروں کی وجہ سے یہ ''وصل'' ہو چکا تھاہ چنانچہ میں نے افراتفری میں اپنا سر کھڑکی میں داخل کیا اور اس سلسلے کے باقی کام اندر

بیٹھے ہوئے مسافروں نے انجام دیئے جنھوں نے مجھے ''دھون'' (گردن) سے پکڑ کر اندر کھینچا اور شکر ہے میں پورے کا پورا اندر داخل ہو گیا اس امر کا قوی امکان موجود تھا کہ میری گردن ان کی ہاتھ میں رہ جاتی اور میرا باقی وجود پلیٹ فارم پر کھڑا بے ثباتی دنیا پر غور کرتا رہتا.........

''دیکھو جی کیسا زمانہ آ گیا ہے'' میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک گھرے گندمی مائل نوجوان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یہ اوپر والی برتھ میں نے ریزرو کروائی تھی' اب میں اوپر جا کر آرام کرنا چاہتا ہوں مگر یہ شخص لاہور سے براجمان ہے اور اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا''

میں نے برتھ کی طرف نگاہ ڈالی تو ایک خشخشی سی ڈاڑھی والے اڈھیڑ عمر شخص کو استراحت فرماتے پایا اس کے چہرے پر ''چب'' پڑے ہوئے تھے اور اس کا چہرہ قاتلوں جیسا تھا' میرے لیے ایسے لوگ نا قابل برداشت ہوتے ہیں جو دھونس کے ذریعے دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ اوپر سے اس بے آرام سفر نے بھی مجھے باؤلا بنا دیا تھا چنانچہ نوجوان کی یہ بات سن کر میں نے اس سے پوچھا ''کیا تم چاہتے ہو کہ یہ شخص تمھاری برتھ خالی کر دے'' اس نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے کہا تم اسے ایک دفعہ میرے سامنے یہ برتھ خالی کرنے کے لیے کہو نوجوان نے یہ سن کر ڈرتے ڈرتے اس شخص کی پنڈلی کو ہاتھ لگایا اور کہا ''بھا جی' آپ کی بڑی مہربانی اگر اب آپ مجھے آرام کرنے دیں'' اس پر قاتلوں جیسے چہرے والا یہ شخص غصے سے لال پیلا ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا اور چیخ کر بولا ''کیوں خالی کر دوں یہ برتھ میں مفت سفر نہیں کر رہا' میں نے بھی ٹکٹ خرچا ہوا ہے'' اس پر ایک دم سے میرا پارہ چڑھ گیا اور لمحوں میں میں نے اپنا لٹریچر اور پروفیسر طاق پر رکھی اور آستین چڑھا کر کہا ''تم نیچے اترتے ہو یا آ کر تمہیں اتاروں؟'' اس پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے نیچے کی طرف جھکا۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے' میری آنکھیں ابل کر باہر کو آ رہی تھیں' میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کے لیے اس کی طرف بڑھا مگر دوسرے مسافروں نے

آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔ میں شاید اس وقت ان کے روکے سے بھی نہ رکتا، مگر اچانک میری نظر اس نوجوان پر پڑی جس کے حقوق کے لئے میں "مسلح جدوجہد" پر آمادہ ہو رہا تھا وہ آرام سے اپنی نشست پر بیٹھا میری طرف دیکھتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا یہ دیکھ کر میں نے ڈبے کے مسافروں کی رائے کا "احترام" کیا اور دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"میں آپ کو پہچان گیا ہوں" اس نوجوان نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور احمقانہ سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا "آپ "وارث" کے چودھری حشمت ہیں نا! مجھے اس ڈرامے میں بھی آپ کا کام بہت پسند آیا تھا!"

اب ڈبے میں رات پڑ گئی، میں نے اپنی برتھ پر بستر بچھا لیا اور سونے کی کوشش میں تھا، مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر بے دھیانی میں میں نے کروٹ بدلی تو اس کا انجام کیا ہوگا کیونکہ اس برتھ کی چوڑائی کروٹ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ڈبے میں اب مکمل سکوت طاری تھا۔ تمام مسافر اونگھ رہے تھے گاڑی کا شور اب ان کے لیے بے معنی تھا۔ کیونکہ گزشتہ تیرہ گھنٹے کے سفر کے دوران وہ اس کے عادی ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ سیٹوں کے نیچے سوئے ہوئے تھے اور جو سیٹوں کے اوپر تھے وہ ایک دوسرے کے کاندھوں پر سر رکھ کر یوں سو رہے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کے آشنا ہوں۔ فرش پر بیٹھے ہوئے لوگ دونوں ٹانگیں سکیڑ کر اپنے گھٹنوں پر سر رکھے اونگھ رہے تھے ایک مسافر نے چادر ایک سرا برتھ اور دوسرا اس کے مقابل سامان رکھنے والی جگہ کے ساتھ باندھا ہوا تھا اور خود اس میں لیٹا ہوا فضا میں جھول رہا تھا بہت سے مسافر ایک نشست والی سیٹ کی "چوٹی" پر بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنے پاؤں نشست پر بیٹھے مسافر کی پشت کی طرف لٹکائے ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ سیٹ کے ساتھ ٹیک نہیں لگا سکتے تھے۔ گاڑی صبح چار بجے کے قریب حیدر آباد پہنچنا تھی اب میری آنکھیں نیند سے ہولے ہولے بند ہو رہی تھیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ میں نہیں جانتا، میں کتنی دیر سویا بس اس اثنا میں ایک مسافر نے مجھے پاؤں سے پکڑ کر ہلایا اور کہا "بابو جی، حیدر آباد آ رہا ہے تیار ہو جائیں" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا برتھ سے نیچے اترا۔ اپنا سامان سمیٹا اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر حیدر آباد کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ

دوسری ٹانگ کے لیے فرش پر کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے حیدر آباد کی آمد کی اطلاع دینے والا مسافر میری برتھ سنبھال چکا تھا' میں قریباً آدھ گھنٹے تک اسی پوزیشن میں کھڑا رہا۔ بالاخر میں نے اس کی طرف رجوع کیا تا کہ اس صورت حال کے بارے میں اس سے استفسار کر سکوں۔ مگر وہ گہری نیند میں تھا اور انتہائی خوفناک قسم کے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے ڈبے کے باقی مسافروں کی طرف نظر ڈالی وہ اونگھتے اونگھتے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتے جو بے خوابی کی وجہ سے انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ حیدر آباد ابھی دور تھا میں بگلے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور میرے جسم کا یہ حصہ اب بالکل بے جان ہو چکا تھا۔ قریب تھا میری مدافعت دم توڑ دیتی اور کھڑے کھڑے کسی پر گر پڑتا کہ ٹرین حیدر آباد کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح فرش پر پڑے ہوئے اشرف المخلوقات کے جسموں پر پاؤں رکھتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اپنا سامان باہر پلیٹ فارم پر پھینکا اور پھر کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر چھلانگ لگا دی۔

اسٹیشن سے باہر برآمدے میں لوگ کچے فرش پر بے سدھ پڑے تھے' اس وقت فضا میں خاصی خنکی تھی' مگر ان کے جسموں پر چادر نہیں تھی اور ان کے بازو ہی ان کے سرہانے تھے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں میرے ہم سفر اور یہ سب لوگ غالباً میری ہی طرح "ایڈونچر" کے موڈ میں تھے بلکہ مہم جوئی میں مجھ سے کہیں زیادہ تھے کہ میں تو اس روز چند گھنٹوں کے لیے ان کے دکھوں میں شامل ہوا تھا' جبکہ ان کی ساری زندگی اسی طرح بسر ہوتی ہے!

# بچارا

''اس سے ملو، یہ میرا دوست ہے!''

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!''

''اس بچارے نے دو دن سے روٹی نہیں کھائی''۔

''کیا مطلب؟''

''صحیح کہہ رہا ہوں، کل ایک گلاس پانی پیا تھا، آج صبح تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے کھائے!''

''اللہ تعالیٰ اپنا رحم کرے!''

''اب تو یہ عادی ہو گیا ہے، کیونکہ اس بچارے کی عمر اسی طرح بسر ہو رہی ہے، کبھی روٹی کھائی، کبھی نہ کھائی، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا!''

''ان کے بچے کتنے ہیں؟''

''تین ہیں!''

ان کی عمریں کتنی ہیں؟''

''وہ کافی بڑے ہیں!''

''وہ کس حال میں ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے، وہ ٹھیک ٹھاک ہیں، کھاتے پیتے ہیں!''

''اگر بچوں کو باپ کی فکر نہیں، تو بطور دوست تمھارا یہ فرض ہے کہ تم ان کا خیال رکھو!''

''میں تو کافی خیال رکھتا ہوں مگر اس کی تو قسمت ہی پھوٹی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ قسمت سے تو جنگ نہیں لڑی جا سکتی!''

''میں ان کے لیے کھانا منگواتا ہوں!''

''یہ نہیں کھا سکے گا، اسے بلڈ پریشر کی تکلیف ہے، ڈاکٹر نے نمک منع کیا ہوا ہے''۔

''چائے وغیرہ منگوا لیتا ہوں''!

''وہ پھر بغیر چینی کے منگوانا، اسے شوگر کی تکلیف بھی ہے!''

''تمھاری ان سے دوستی کب کی ہے؟''

''بیس پچیس سال ہونے کو آئے ہیں''!

''مگر اس دوستی کا فائدہ؟''

''کیوں؟''

''کیا تم نے کبھی اپنے دوست کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ انسان حالات کے خلاف جنگ کر سکتا ہے، قسمت کے خلاف نہیں لڑ سکتا اور اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے! میرے سارے غریب رشتے دار ہیں، حسب توفیق ان کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا ہوں، اس سے انہیں اپنی حالت سنبھالنے میں مدد ملتی ہے، کیونکہ ابھی ان کی قسمت ان کے خلاف نہیں ہوئی۔ تم اس کے کپڑے دیکھ رہے ہو!''

''ہاں دیکھ رہا ہوں!''

''مجھے شرم آتی ہے اسے ان کپڑوں میں اپنے ساتھ لے کر پھرتے ہوئے مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟''

"تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں نے کہا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے بے بس ہو جاتا ہے!"

"اگر تمھارے یہ دوست برا نہ مانیں، تو میرے پاس کچھ پیسے میری ضرورت سے زائد ہیں، میں انھیں بطور قرض حسنہ دے سکتا ہوں، جب کبھی ان کی حالت بہتر ہو، یہ مجھے لوٹا دیں!"

"ارے بھائی، تمھارے قرض سے اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آسکتی، قرض تو اس نے کئی بنکوں سے لے رکھے ہیں!"

"میرا قرض اس نوعیت کا نہیں ہے، انہیں اس کی واپسی کے بارے میں تردو نہیں کرنا پڑے گا"۔

"ارے یار اس کا مسئلہ وہ نہیں ہے، جو تم سمجھ رہے ہو!"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"اس کی قسمت پھوٹ گئی ہے! تم اس کے لیے صرف دعا کرو!"

"ویسے ان کی یہ حالت کب سے ہے؟"

"گزشتہ چند برسوں سے، اس سے پہلے اللہ کا بڑا فضل تھا!"

"اس وقت یہ کیا کیا کرتے تھے؟"

"یہ اس وقت ایک بنک میں کلرک تھا، قریباً ہزار روپیہ تنخواہ تھی، یہ رقم اس کے اور اس کے بچوں کے لیے اگرچہ کافی نہیں تھی، مگر پھر بھی گھر کا خرچ چل جاتا تھا، یہ دن میں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتا تھا، بیوی بچوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا تھا، خوش رہتا تھا، سونے کا بہت شوقین تھا، چنانچہ اسے اگر دفتر سے جھاڑ پڑتی تھی، تو صرف اسی وجہ سے پڑتی تھی کہ یہ سو کر دیر سے اٹھتا تھا اور پھر دیر سے پہنچتا تھا، مگر اب تو نیند بھی اس کی اس کی آنکھوں سے دور رہتی ہے!"

''مگر پھر ہوا کیا؟''

پھر ہوا یہ کہ اس کی قسمت پھوٹ گئی' اس نے سوچا کہ اتنی تنخواہ میں گزارا ذرا مشکل سے ہوتا ہے' چنانچہ اس نے ایک اور جگہ پارٹ ٹائم نوکری کرلی' جس سے اس کے حالات بہتر ہوگئے' اس نے ہر ماہ تھوڑی بہت رقم پس انداز بھی کرنا شروع کردی' حتیٰ کہ اس کے پاس تھوڑا سا سرمایہ جمع ہوگیا!

''پھر؟''

''پھر اس نے ایک دوست کے ساتھ شراکت کر کے ایک چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا' جس میں اسے خاصا منافع ہوا''۔

''پھر؟''

''پھر اس نے وسیع پیمانے پر کاروبار کا آغاز کیا' بنکوں سے لاکھوں کرڑوں روپے کے قرضے لیے اور یوں یہ بچارا دن بدن امیر سے امیر تر ہوتا گیا۔اس وقت اس کی کروڑوں کی جائیداد ہے' بڑی بڑی کمپنیوں کے میجر شیئرز اس کے پاس ہیں اور اس کا شمار تمھارے ملک کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے!''

''مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ انہوں نے دو دن سے روٹی نہیں کھائی' کپڑوں کی حالت خستہ ہے' ایک ہفتے سے سوئے نہیں؟''

''ہاں صحیح کہہ رہا تھا' اس بچارے کے پاس اب ان چیزوں کے لیے وقت ہی نہیں ہے' کاروبار کی پریشانیاں اسے گھیرے رکھتی ہیں' ان پریشانیوں نے اسے طرح طرح کے امراض میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ جو کھانا چاہتا ہے' کھا نہیں سکتا' جو پہننا چاہتا ہے پہن نہیں سکتا حتیٰ کہ یہ سونا چاہتا ہے مگر یہ سو نہیں سکتا' یہ جو امیر ترین آدمی ہے' یہ غریب ترین آدمی ہے' اس نے زندگی میں بہت اچھے دن دیکھے ہیں' تم اس کے لیے دعا کرو!''

❖❖❖

# تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو؟

چھٹی والے دن مرغی خریدنے کے لیے قریباً ایک فرلانگ پیدل چلنے کے بعد میں ایک مرغیوں کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ دوکان اور سڑک کے درمیانی ''رقبے'' میں تہہ درتہہ کیچڑ تھا' جو قریباً دلدل کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس دلدل کو عبور کرنے کے لیے اینٹوں کا ''پل'' بنایا گیا تھا' یعنی ایک ایک قدم کے فاصلے پر ایک ایک اینٹ اس کے پاؤں پر پڑتی ہے۔ بہر حال میں نے اللہ کا نام لیا اور پوری احتیاط سے اینٹوں پر قدم دھرتے ہوئے ''پل'' کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ دوسری طرف ایک پختہ عمر کے بزرگ لوہے کی کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کے بائیں جانب مرغیوں کے تین چار ڈبے تھے اور ان کے برابر میں خون سے لتھڑا ہوا ایک بڑا سا ڈرم تھا۔ اس بزرگ نے سفید قیمتی کپڑے کا استری شدہ کرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی۔ میں اس دوکان میں داخل ہونے والا غالباً پہلا گاہک تھا' کیونکہ چھٹی کے دن کی وجہ سے ابھی صبح کے ہنگامے اپنے عروج کو نہیں پہنچے تھے اور یوں بھی جب میں نے مرغی کے نرخوں پر سودے بازی کی کوشش کی تو اس بزرگ نے نرمی سے کہا ''بابو جی'' ''بونی'' کر رہا ہوں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا' میں نے آپ کو بالکل جائز نرخ بتائے ہیں' سو میں نے اس بزرگ کے کہے کو صادق مانا اور ڈربے میں سے اپنی پسند کی کوئی مرغی تلاش کرنے لگا!۔

اور بائیں ہاتھ اوپر تلے دھرے ڈربوں میں سفید پروں والی کتنی ہی مرغیاں جگہ کی تنگی کی وجہ سے ایک دوسرے میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ان ڈربوں میں پانی کا ایک کٹورہ اور ایک کٹورے میں ان مرغیوں کے چگنے کے لیے دانہ پڑا ہوا تھا۔ مرغیوں کے اس جھرمٹ

میں دوایک مرغ بھی تھے مگران بچاروں نے اپنی ''رعایا'' کے حقوق کیا پورے کرنے تھے کہ ان ڈربوں میں تو پر پھڑ پھڑانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر مرغیوں کی گردنوں پر سے بال غائب تھے چنانچہ گردن کے اس حصے سے ان کی چمڑی نظر آرہی تھی یا تو یہ بال کسی بیماری کی وجہ سے جھڑ گئے تھے یا ماحول میں ایک دوسرے کو چونچیں مار مار کرانہوں نے ایک دوسرے کا یہ حال کر دیا تھا اور یا پھر مشفق و مہربان دوکاندار نے یہ بال خود اکھاڑے تھے تا کہ جب ان گردنوں پر چھریاں چلیں تو ان بے زبانوں کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔ میں نے ان میں سے ایک درمیانے سائز کی مرغی پسند کی اور بزرگ سے کہا کہ وہ اسے جلدی سے تیار کر دے۔ بزرگ نے ڈربے کا دروازہ کھولا اور اس مرغی کو پروں سے کھینچ کر باہر لے آیا۔ ڈربے میں تھوڑی دیر کے لیے ایک شور برپا ہوا' مگر پھر خاموشی چھا گئی۔ البتہ دوکاندار کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی مرغی بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کر رہی تھی' مگر دوکاندار نے اسے اسی کے پروں سے باندھ دیا تھا اور لکڑی کی ایک میز پر اسے اس طرح رکھ دیا تھا جیسے وہ کوئی جامد چیز ہو۔ دودھیا کپڑوں میں ملبوس بزرگ نے اس میز کی دراز میں سے ایک چولا نکالا جو خون کے دھبوں سے بھرا ہوا تھا اور اسے اپنے سفید براق ایسے کپڑوں کے اوپر پہن لیا اور اس کے ساتھ ہی یہ نیک صورت سا بزرگ اب ایک بالکل دوسرے روپ میں نظر آنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مرغی کو فضا میں معلق کیا اور دوسرے ہاتھ میں چھری تھامے تکبیر پڑھ کر یہ چھری مرغی کے حلق پر چلا دی۔ جس کے ساتھ ہی خون کی ایک دھار اس کے چولے پر پڑی جو پہلے ہی خون کے چھینٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرغی کے حلق سے غوں غوں کی آواز بلند ہوئی مگر پھر یہ آواز مدھم پڑ گئی۔ البتہ اس کا جسم دوکاندار کے ہاتھوں میں پھڑکتا رہا۔ دوکاندار نے اس پھڑکتے ہوئے جسم کو قریب پڑے ہوئے ڈرم میں پھینک دیا اور اس کے ٹھنڈے ہونے کے انتظار میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر حقے کے کش لگانے لگا!

وہ کرسی پر بیٹھ کر حقے کے کش لگا رہا تھا اور خالی ڈرم میں مرغی پھڑک رہی تھی۔ وہ اپنا سر اور جسم ٹین کے ڈرم کے ساتھ ٹپکتی اور اس سے جو ردم پیدا ہو رہا تھا' وہ غلام افریقہ کے ڈرم کی تھاپ سے ہم آہنگ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرم میں سے آنے والی آوازیں خاموش

ہو گئیں مرغی نے تڑپنا پھڑ کنا بند کر دیا تھا' چنانچہ دوکاندار نے جھک کر ڈرم میں ہاتھ ڈالا اور مرغی کو ٹانگ سے پکڑ کر میز پر رکھ دیا اور پھر منٹوں میں اس کی کھال اتار کر اس کی بوٹیاں بنائیں اور پھر انہیں پولیتھن کے لفافے میں بند کر کے لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور ایک کپڑے سے خون آلودہ چھری صاف کرنے لگا اور وہ کچھ ہی دیر میں ایک بار پھر ایک قابل احترام بزرگ کے روپ میں نظر آنے لگا کیونکہ اس نے خون آلودہ چھری کو کپڑے سے صاف کر دیا تھا اور خون کے پرانے اور نئے دھبوں سے بھرا ہوا چولا اتار کر پرے رکھ دیا تھا۔ نیچے وہی دودھ ایسا کرتا تھا' جس پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں تھی۔ اس کا آٹھ نو سالہ پوتا اس کے لیے گھر سے ناشتہ لایا تھا اور ساتھ آج کا اخبار بھی! اس نے ناشتے کی پوٹلی کھول کر کاؤنٹر پر رکھ لی اور اب وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ آسام' لبنان اور افغانستان میں ہونے والے قتل عام کے بارے میں ادارتی مضمون پڑھ رہا تھا۔ میں نے اخبار سے منسلک ادبی صفحے پر ایک پھسلتی ہوئی نظر ڈالی' جس میں کسی قاری نے پوچھا تھا کہ۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پر کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

والا شعر کس شاعر کا ہے؟ اور پھر میں دوکان سے نکل کر اس دلدل کے قریب پہنچ گیا' جسے میں نے اینٹوں کے "پل" کے ذریعے پار کرنا تھا۔ مگر دوسری طرف سے ایک اور گاہک ہاتھ میں تھیلا پکڑے اس پل سے گزر کر دکان کی طرف آ رہا تھا۔ معزز بزرگ نے گاہک کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ناشتہ درمیان میں چھوڑا' میز پر سے خون آلودہ چولا اٹھا کر پہنا' چھری کو سان پر تیز کیا اور سہمی ہوئی مرغیوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا!

———❖❖❖———

# بیمار کا حال اچھا ہے؟

سامنے سے اچانک ایک کار آجانے پر میں نے اپنے بچاؤ کے لیے موٹر سائیکل کا رخ بائیں جانب کی ایک لین ( ) کی طرف موڑ دیا، جہاں مٹی میں دبے ہوئے ایک بڑے پتھر کا ابھار مجھے لٹانے کے لیے غالباً پہلے سے میرا منتظر تھا، چنانچہ موٹر سائیکل نے ایک پلٹا کھایا اور میں، میری وائف اور میرا چھوٹا بیٹا علی بڑے اہتمام کے ساتھ پتھریلی سڑک پر آن گرے یہ دیکھ کر چند راہگیر آگے بڑھے، ایک نے علی کو گود میں اٹھایا دوسرے نے موٹر سائیکل کو سیدھا کر کے سٹینڈ پر کھڑا کیا اور باقی ہماری خیریت دریافت کرنے لگے کہ زیادہ چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی، علی اس اچانک حادثے کی وجہ سے گھبرا گیا تھا، چنانچہ وہ خوفزدگی کے عالم میں مسلسل روئے جا رہا تھا۔ میں نے بیگم سے اس کی خیریت دریافت کی، وہ بالکل ٹھیک تھی، میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے بھی خراش تک نہیں آئی تھی، بلکہ میرے لیے یہ امر حیرت انگیز تھا کہ پوری قوت سے زمین پر گرنے کے باوجود موٹر سائیکل بھی پوری طرح محفوظ و مامون تھی چنانچہ وہ حسب معمول آدھی کک ہی پر سٹارٹ ہو گیا میں نے قریب کی دکان سے علی کے لئے ٹافیاں خریدیں، ایک ٹافی منہ میں رکھتے ہی وہ حادثے کی سنگینی کو بھول گیا۔ اور اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔

راہگیروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد علی کے سکول کی طرف جاتے ہوئے جب میں نے بائیں جانب کو مڑنے کے لیے ''انڈیکیٹر'' چلایا، تو مجھے پتہ چلا کہ موٹر سائیکل کے پتھریلی سڑک پر گرنے کی وجہ سے یہ ''انڈیکیٹر'' تو ٹوٹ چکا ہے، چنانچہ میں نے اپنے ہاتھ کو انڈیکیٹر کے طور پر استعمال کیا اور پیچھے سے آنے والی ٹریفک کا جائزہ لینے کے لیے ہینڈل پر

لگے شیشے میں جھانکا تو معلوم ہوا کہ یہ شیشہ بھی چکنا چور ہو چکا ہے۔اس اچانک حادثے کی وجہ سے میرے حواس پوری طرح بحال نہیں تھے، جب یہ حواس بحال ہوئے تو مجھے موٹر سائیکل کے مختلف حصوں سے اٹھنے والی عجیب وغریب آوازیں سنائی دینا شروع کیں چنانچہ میں نے سڑک کے کنارے موٹر سائیکل کھڑا کیا اوران آوازوں کا سراغ لگانے کے لیے موٹر سائیکل کے مختلف حصوں کوٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا اس ''تفتیش'' کے دوران معلوم ہوا کہ اگلے پہیے کا مڈگارڈ ٹیڑھا ہو چکا ہے اور پہیے کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔لیگ گارڈ بھی ٹوٹ چکا تھا اور اس کی کھڑکھڑاہٹ بھی موٹر سائیکل کے ''غل غپاڑے'' میں اضافہ کر رہی تھی۔میں نے دونوں ہاتھوں کی قوت سے مڈگارڈ کو سیدھا کر کے اسے پہیے سے الگ کیا، تاکہ عارضی طور پر اس کے شور سے محفوظ ہو جاؤں اور ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔میں نے علی کو اس کے سکول چھوڑا، وائف کو رکشے میں سوار کرایا تاکہ وہ اپنے طور پر کالج پہنچ جائے۔

اور خود کسی موٹر سائیکل مکینک کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔کیونکہ مجھے موٹر سائیکل کی صورت حال خاصی مخدوش لگ رہی تھی۔مکینک کی طرف جاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ موٹر سائیکل کچھ ڈول رہی ہے۔نیز یہ کہ میں جا کسی اور طرف رہا ہوں اور اس کا رخ کسی اور طرف ہے چنانچہ میں نے ایک بار پھر سڑک کے کنارے موٹر سائیکل کھڑا کی اور اس کے اگلے پہیے کو اپنی ٹانگوں میں پھنسا کر اس کا سٹیئرنگ سیدھا کرنے کی کوشش کی، جو اس حادثے کی وجہ سے ٹیڑھا ہو گیا تھا، اس دوران ایک اور انکشاف مجھ پر یہ ہوا کہ اس کی اگلی بتی ٹوٹ چکی ہے، نیز پٹرول کی ٹینکی پر خاصے ''چب'' پڑ گئے ہیں۔اس کے علاوہ اچانک اور شدید جھٹکے کی وجہ سے اس کا ایک ''شاک آبزارور'' بیٹھ گیا ہے۔بہرحال میں نے پھر موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور اسے لے جا کر مکینک کی خدمت میں پیش کر دیا۔مکینک نے اسے ٹٹول کر دیکھا، کک مار کر اسے سٹارٹ کیا اور اس میں سے برآمد ہونے والی عجیب وغریب آوازیں سنیں اور پھر اس کا انجن بند کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور کہا ''جناب! آپ یہ میرے پاس چھوڑ جائیں۔اس کا تو انجر پنجر ہل گیا ہے، اس کی مرمت میں خاصا وقت لگے گا!''

مکینک کی دکان سے دفتر تک جانے کے لیے میں قریبی رکشہ سٹینڈ کی طرف پیدل روانہ ہوا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ مجھے چلنے میں کافی دشواری پیش آرہی ہے دائیں ٹانگ کی پنڈلی سے ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں میں نے شلوار کا پائنچا اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ شلوار وہاں سے پھٹی ہوئی تھی اور پنڈلی کے اس حصے سے کھال ادھڑ چکی تھی اور اب وہاں ایک گہرا زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ دفتر تک پہنچتے پہنچتے میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں کاندھے سخت بوجھل ہورہے ہیں۔ اور مجھے گردن اِدھر اُدھر موڑنے میں شدید دشواری پیش آرہی ہے۔ میں نے جلدی جلدی اپنا کام سمیٹا اور رکشہ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا گھنٹی بجانے پر وائف نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے اور وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اس کا ٹخنا بہت بُری طرح سوجا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر سے دوالے کر آئی ہے ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب تو آپ کو افاقہ ہوجائے گا مگر خدشہ ہے کہ سردیوں کے موسم میں یہ چوٹیں مزید تکلیف کا باعث بنیں گی۔ اس دوران مجھے کمرے سے علی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ شہناز نے مجھے بتایا کہ اب وہ ٹافی سے بھی چپ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسے بھی چوٹیں آئی ہیں مگر وہ یہ بتلانے سے قاصر ہے کہ اسے کہاں کہاں چوٹیں آئی ہیں تاہم ڈاکٹر صاحب نے اسے بھی دوا دے دی ہے!

اور میں نے اپنے کمرے میں جا کر سپرٹ سے اپنا زخم دھویا اس پر مرہم لگائی۔ اور پھر یہ کالم لکھنے بیٹھ گیا جو آپ نے یہاں تک پڑھ لیا ہے۔ اس کالم کی آخری سطریں یہ ہیں کہ صرف فرد ہی نہیں بلکہ جب کوئی قوم بھی کسی اچانک حادثے سے دوچار ہوتی ہے تو اس کے افراد کو فوری طور پر ان نقصانات کا اندازہ نہیں ہوتا جو اس حادثے سے انہیں پہنچتے ہیں، بلکہ وہ خود کو پوری طرح محفوظ و مامون تصور کرتے ہیں مگر یہ چوٹیں آہستہ آہستہ اپنا آپ دکھاتی ہیں۔ اور سردیوں کے موسم میں ان کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے بلکہ کبھی کبھار تو یہ مستقل عارضے کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ رونے والوں کو ٹافیاں دے کر کچھ عرصے تک تو بہلایا جاسکتا ہے۔ مگر جب ان کے درد جاگتے ہیں تو پھر وہ ٹافیوں سے خاموش نہیں ہوتے۔ حادثے کے بعد موٹر سائیکل چلاتے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا

سٹیئرنگ ٹیڑھا ہوگیا ہے چنانچہ میرا رخ کسی اور طرف ہے، اور میں جا کسی اور طرف رہا ہوں۔ کسی اچانک حادثے کی صورت میں قوموں کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے مگر اس کا اندازہ انہی کافی دیر بعد ہوتا ہے جو قومیں اپنی سمت درست کرلیتی ہیں۔ وہ بچ جاتی ہیں اور جن قوموں کے ڈرائیور اپنی جہالت پر انحصار کرتے ہیں وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

# ڈوری سے بندھا شاہین

کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے نکلتے ہوئے میری نظر گیٹ پر بیٹھے ایک مفلوک الحال سے شخص پر پڑی اس نے اپنے ہاتھ پر ایک شاہین بٹھایا ہوا تھا اور اس شاہین کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی میں نے سوچا کہ اقبال کے پیروکار ہیں شاہین کا ذکر بہت سنا ہے کیوں نہ اسے آج قریب سے دیکھ لیں چنانچہ میں اس شخص کے پاس گیا میں نے دیکھا کہ اس شخص نے مضبوط ڈوری کے ایک سرے سے شاہین کی ٹانگیں باندھی ہوئی تھیں اور دوسرا سرا اپنے ہاتھ کے گرد لپیٹا ہوا تھا علاوہ ازیں اس نے اپنے ہاتھوں پر چمڑے کے دستانے پہنے ہوئے تھے اور شاہین کے کاٹنے کی وجہ سے یہ دستانے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے شاہین کی آنکھوں پر چمڑے کی ''عینک'' تھی جس کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر وہ مضطرب انداز میں اپنی گردن اِدھر اُدھر گھما رہا تھا میں نے اس شخص سے پوچھا ''یہ شاہین بکنے کے لیے ہے''

''ہاں جی بکاؤ مال ہے'' اس نے کہا

مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں خاصی بے اعتنائی ہے اسے اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں کہ میں نے یہ سوال شاہین خریدنے کے لئے کیا ہے یا محض وقت گزاری کر رہا ہوں تھوڑی دیر بعد ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوئے اس شخص نے گردن موڑ کر ہوٹل کی لابی کی طرف نظر دوڑائی اور اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص سے کہا ''ابھی تک آیا نہیں!''

''آجائے گا!'' اس کے ساتھی نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کیوں میاں اس کا کیا لو گے؟'' میں نے اپنے ذوق تجسس کی تسکین کے لیے

پوچھا۔

''ستر ہزار روپے'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا اور اس کی نظریں لابی کی طرف تھیں۔

''ستر ہزار روپے؟'' حیرت سے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں جی ابھی یہ بچہ جو ہے تبھی تو قیمت کم ہے!'' اس نے کہا۔

''ابھی آیا نہیں'' اس نے ایک بار پھر ایڑیاں اٹھا اٹھا کر لابی کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آ جائے گا یار آ جائے گا کہیں نہیں جاتا'' اس کے ساتھی نے یقین سے کہا۔

''تم کس کا انتظار کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا

''ایک گاہک کا انتظار ہے''

''اگر ستر ہزار مانگو گے تو قیامت تک اس کا انتظار ہی کرتے رہو گے!'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پچاس ہزار روپے مول تو وہ لگا گیا ہے میں نے اسے اسی ہزار قیمت بتائی ہے ستر تک بیچ دوں گا!'' اسے میرے فقرے ہونے کا غالباً یقین تھا تبھی اس نے مجھ سے کاروباری پردہ داری تک ترک کر دی تھی!

''مگر وہ کون احمق ہے جو ایک پرندے کے تمہیں ستر ہزار روپے دے گا''

''وہ احمق نہیں ہے ایک عرب شخص ہے ہمارے شاہینوں کے بڑے اچھے گاہک ہیں!''

مجھے یہ سن کر کچھ چپ سی لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو سنبھالا اور پوچھا ''اچھا یار ایک بات تو بتاؤ تم نے شاہین کی آنکھوں پر پٹی کیوں باندھی ہوئی ہے؟

''اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو یہ اپنی نوکیلی چونچ بار بار ہاتھوں میں گاڑ دیتا ہے اور بوٹی نکال کر لے جاتا ہے ابھی نا سمجھ ہے آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا!''

مگر میرے ذہن میں ابھی تک شاہین کی قیمت پھنسی ہوئی تھی چنانچہ میں ایک دفعہ پھر واپس اپنے موضوع کی طرف آیا ''ایک پرندے کے ستر ہزار بہت زیادہ ہیں اس میں ایسی کون سی خاصیت ہے بالکل چیل کی طرح تو ہے وہی آنکھیں وہی نوکیلے پنجے وہی چونچ مگر پھر مجھے خود ہی ایک دوست کی بات یاد آ گئی کہ چیل اور شاہین میں فرق صرف یہ ہے کہ چیل اپنے شکار پر جھپٹتی شاہین ہی کی طرح ہے بس اتنا ہے کہ شکار کے قریب پہنچ کر اس کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے اور یہی بے موقع ہنسی شاہین اور چیل میں امتیاز کا باعث بنتی ہے۔

''چیل اور شاہین میں بہت فرق ہے جناب!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا مجھے اس کی یہ ہنسی چیل کی طرح بے موقع لگی ''شاہین کی اڑان اور اس کی دیگر خصوصیات سے تو آپ واقف ہی ہیں لیکن جو شاہین ہم بیچتے ہیں وہ سدھائے ہوئے ہوتے ہیں یہ شاہین جو اس وقت میرے ہاتھ پر بیٹھا ہے بلا کا شکاری ہے یہ بیٹر، تیتر، مرغابی اور دوسرے پرندوں کا پیچھا کرتا ہے اور انہیں زندہ اپنے پنجوں میں دبا کر اپنے مالک کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے چنانچہ اس شاہین کے قدردان بہت ہیں''

''یہ شاہین پرندے کو شکار کر کے خود کیوں نہیں کھاتا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے آپ کو بتایا کہ یہ سدھایا ہوا شاہین ہے''

دوسرے لفظوں میں یہ ملازمت پیشہ شاہین ہے'' میں نے ہنستے ہوئے کہا

''جی جی'' اس نے اپنے میلے میلے دانت نکالتے ہوئے کہا ''ویسے بھی جب اسے شکار پر چھوڑا جاتا ہے گوشت کا ایک ٹکڑا اس کی ٹانگوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے تا کہ اسے تسلی رہے''

''اگر برا نہ مانو تو آخر میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' میں نے کہا

''پوچھو جناب پوچھو!''

''تم اتنا مہنگا کاروبار کرتے ہو مگر تمہاری اپنی حالت کچھ اتنی اچھی نہیں ہے؟''

''بابو جی! آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں اس شاہین کا مالک تھوڑے ہی ہوں میں تو اسے کمیشن پر بیچ رہا ہوں شاہین اگر بک جائے تو اس کا کمیشن میں ہمارا حصہ بھی ہوتا ہے۔

شاہینوں کے کمیشن ایجنٹ نے ایک بار پھر لابی کی طرف ایڑیاں اٹھا کر دیکھا!

اس دوران کھڑے کھڑے میری طبیعت متلانے لگی تھی میں نے باہر سڑک پر نظر دوڑائی تو انسانوں کا ایک سیلاب اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں تھا ان میں طالب علم بھی تھے استاد بھی صحافی بھی تھے صنعت کار بھی پولیس والے بھی تھے اور دوسرے محافظ اداروں کے افراد بھی ان میں دانشور بھی تھے اور عالم بھی سیاستدان بھی تھے اور اہل اقتدار بھی ان میں مزدور بھی تھے اور کسان بھی اور ان لمحوں میں مجھے یوں لگا جیسے ان سب کی ٹانگوں میں گوشت کا ایک ایک ٹکڑا باندھ کر انہیں شکار پر چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ اس شکار کو اپنے پنجوں میں دبا کر اپنے آقا کے قدموں میں ڈھیر کرنے کے لیے گھروں سے نکلے ہیں آنکھوں پر بندھی پٹی اور ٹانگوں میں بندھی رسی والا شاہین مضطرب انداز میں اپنی گردن اِدھر اُدھر گھما رہا تھا میں نے اس شاہین کو ڈبڈباتی ہوئے آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔

~ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اتنے میں شاہین بیچنے والے شخص کے چہرے پر رونق سی آگئی ''وہ عرب شیخ آگیا ہے دعا کریں بابو جی سودا ہو جائے!''

❖❖❖

# ضمیر کی تلاش

سید ضمیر جعفری کو اسلام آباد فون کرنے کے لیے میں نے نمبر گھمایا۔ دوسری طرف سے ریسور اٹھائے جانے پر میں نے کہا ''ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟''

''ضمیر؟ کون سا ضمیر؟ یہ ایک پولیس افسر کا گھر ہے'' اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

میں نے دوسری دفعہ نمبر گھمایا ''ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟''

''بھائی صاحب آپ گھاس تو نہیں چر گئے؟ یہ ایک بزنس مین کا گھر ہے یہاں کوئی ضمیر و میر نہیں ہے!''

اب کے میں نے ڈرتے ڈرتے نمبر گھمایا اور دل میں دعا کی کہ یا خدا ضمیر صاحب سے بات ہو جائے۔ اس دفعہ ایک عالم دین نے فون اٹھایا ''لاحول ولا ایک تو رانگ نمبروں نے تنگ کیا ہوا ہے ارے میاں یہاں ضمیر کہاں سے آ گیا؟ یہ مولوی سرکار علی کا گھر ہے!''

اگلی دفعہ نمبر ایک صحافی کے ہاں جا ملا ''میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ نمبر غلطی سے نہیں ملا آپ لوگ ضمیر ضمیر کی دہائی دے کر چاہتے ہیں کہ ہم لوگ بھوکوں مر جائیں؟ اگر آپ نے آئندہ فون کیا، تو مجھے پولیس کو رپورٹ درج کرانا پڑے گی''

میں نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔

میں نے سوچا لائن میں خرابی ہے۔ اس طرح خواہ مخواہ پیسے ضائع کرنے کا کوئی

فائدہ نہیں۔ کچھ دیر انتظار کر کے فون کرنا چاہئے۔ چنانچہ قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون ملایا۔

''ہیلو ضمیر صاحب ہیں؟''

''جی ذرا ان سے بات کرنا چاہتا ہوں!''

''بھائی ضمیر کی باتیں اس طرح فون پر طے نہیں ہوا کرتیں۔ آپ کبھی گھر تشریف لائیے''

''آپ کون صاحب بول رہے ہیں''

''سر میں کالعدم...... پارٹی کا رہنما بول رہا ہوں۔ آپ کی آواز خوب پہچانتا ہوں ،آپ مارشل لاء ہیڈ کوارٹر سے بول رہے ہیں نا؟''

''جی...... جی......'' اور اس کے ساتھ ہی میں نے فون اس طرح بند کر دیا جیسے اچانک منقطع ہو گیا ہو!

اگلی دفعہ ایک صاحب اقتدار کے ہاں جا ملا

''ضمیر صاحب ہیں؟''

''آپ کو آج ضمیر کی یاد کیسے آ گئی؟''

میں بہت خوش ہوا کہ اس دفعہ نمبر صحیح مل گیا ہے۔ ''ہم اپنے ضمیر کو بھولے تو کبھی نہیں، البتہ اس دوران دنیا داری کے دھندوں سے فرصت نہیں ملی!''

''تو جہاں اتنے برس دنیاداری کے دھندوں میں آپ کو ضمیر یاد نہیں آیا مزید آئندہ کچھ عرصہ اس بے چارے کو زحمت نہ دیں!''

''یہ سن کر میں چونکا...... گویا دوسری طرف ضمیر صاحب نہیں ہیں'' ''آپ ضمیر صاحب نہیں ہیں؟''

''دیکھو میاں! یہاں کوئی ضمیر نہیں ہے۔ اگر تم کوئی سیاسی آدمی ہو تو کھل کر بات

کرو، ورنہ بند کردو، یہ رانگ نمبر ہے"

اور پھر رانگ نمبر پر میں نے انکم ٹیکس، ایکسائز، بلدیہ، ہسپتال، تعلیم اور اللہ جانے کن کن شعبوں کے افراد سے بات کی۔ ایک پیر صاحب سے بھی بات ہوئی مگر ہر ایک نے ضمیر کا سن کر ٹیلی فون بند کر دیا اس دوران میں نے ایک نسوانی آواز بھی سنی۔

"آپ ہم پر طنز کرر ہے ہیں؟ ہم آپ لوگوں سے زیادہ باضمیر ہیں۔ ہم لوگ رشوت نہیں لیتے، چوری نہیں کرتے، سمگلنگ نہیں کرتے، یہ سب کچھ تو آپ لوگ کرتے ہیں اور پھر ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم تو نذر نیاز بھی دیتے ہیں۔ درگاہوں پر بھی جاتے ہیں۔ محرم کا بھی احترام کرتے ہیں۔ آپ لوگ کیا ہیں؟ ضمیر...... ضمیر؟ جب کسی کی جیب میں پیسہ نہ ہو، وہ ہمارے ساتھ ضمیر ہی کی بات کرتا ہے۔ مفت کے چسکے لیتے رہتے ہیں۔ بند کرو فون یہ گاہکی کا وقت ہے!"

اس صورت حال سے پریشان ہوکر میں نے سوچا کہ ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی بجائے اسلام آباد میں ڈاکٹر صفدر محمود کو فون کر کے کہنا چاہئے کہ وہ فون کر کے ضمیر صاحب کو میرا پیغام پہنچا دیں اور انہیں کہیں کہ اگر ہو سکے تو وہ مجھے لاہور فون کر لیں۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو ساری داستان سنائی۔

"اب تم اندر کی بات بتاؤ" ڈاکٹر صفدر محمود نے آخر میں کہا

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ضمیر کی تلاش کا خیال تمہیں کیونکر آیا؟ بھولی ہوئی چیزیں انسان کو ایسے ہی یاد نہیں آیا کرتیں!" ڈاکٹر صفدر محمود نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر فون درمیان میں منقطع ہوگیا!۔

تھوڑی دیر بعد میرے فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف سید ضمیر جعفری تھے صفدر محمود نے انہیں میرا پیغام دے دیا تھا میں نے انہیں بھی پوری کتھا سنائی۔ اس پر وہ ہنسے اور پھر بولے "تمہارے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہئے تھا!"

"کیوں جی میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہونا چاہیے تھا؟"

"اس لیے کہ ہم سب لوگ ضمیر کی باتیں بہت کرتے ہیں مگر اس کے لیے قربانی نہیں دیتے۔تم بھی انہیں لوگوں میں سے ہو!"

"میں تو قربانی دیتا ہوں"

"ہاں بقرعید پر دیتے ہو۔پچھلے سال تم نے ایک ران مجھے بھی اسلام آباد بھجوائی تھی!"

تب میں نے سوچا کہ یہ بزرگ تو میرے احوال سے پوری طرح واقف ہیں لہذا ان سے سیدھی بات کرنی چاہیے۔چنانچہ میں نے کہا

"ضمیر کی بات تو میں ایسے ہی فیشن کے طور پر کررہا تھا ورنہ یہ ضمیر وغیرہ سب معروضی اصطلاحات ہیں"

"ہاں! اب تم راہ راست پر آئے ہو مگر آخر میں ایک بات تو بتاؤ!"

"پوچھیے"

"یہ تم بیٹھے بٹھائے ضمیر کے خلاف کیوں ہو گئے ہو؟"

"اس کی صرف ایک وجہ ہے" میں نے کہا "اور وہ یہ کہ ضمیر انسان کو برے کاموں سے نہیں روکتا صرف ان بُرے کاموں کا مزا کرکرا کرتا ہے۔فون پر جتنے لوگوں سے بھی میری بات ہوئی وہ پورے تواتر سے بُرے کام کرتے رہتے ہیں بس درمیان درمیان میں ضمیر ان کا مزا کرکرا کرتا رہتا ہے۔اب رنگ میں بھنگ ڈالنے والی اس بے معنی سی چیز کے دفاع میں کیا بولا جائے؟"

---❖❖❖---

عطاءالحق قاسمی پاکستان کا آرٹ بکوالڈ ہے۔ (شفیق الرحمٰن) ''ایک اخباری انٹرویو میں سے''

عطاءالحق قاسمی کے کالم اخبار کی فضا سے پھوٹتے نظر نہیں آتے' اس میں ایک رنگ کا اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ کالم اس طریقے سے اخبار کے بطن سے برآمد نہیں ہوئے جیسے سالک وحسرت کے کالم برآمد ہوتے تھے' یہ اس طرز پر سوچے اور لکھے گئے ہیں جس طرز پر پطرس بخاری نے اپنے مضامین لکھے تھے یا ہمارے دور میں مشتاق احمد یوسفی نے لکھے ہیں۔
(انتظار حسین) ''روزنامہ مشرق لاہور''

ادب اور صحافت کے لیے فخر کی بات ہے کہ عطاءالحق قاسمی ایسے لکھنے والے ان شعبوں میں موجود ہیں۔ (ابن انشاء) ''ایک خط سے اقتباس''

ہمارے کھیتوں میں اُگنے والی کپاس کے پھولوں کی طرح ہنستا ہوا کالم عطاءالحق قاسمی کے سوا شاید کسی نے نہیں لکھا۔ (سید ضمیر جعفری) ''ایک مضمون سے اقتباس''